اردو زبان کا منفرد علمی و ادبی

ماہنامہ

شاخسار کٹک

مشترکہ شمارہ جنوری، فروری ۱۹۷۳ء | اشاعت کا نواں سال | شمارہ ۴۴، ۴۵، ۴۶

(مدیر اعلیٰ)

امجد نجمی

مشاورت کار

سید حرمت الاکرام

سید اولاد اصغر رضوی

احمد حسین آزاد

قیمت .... ۲ روپے ۵۰ پیسے

زرسالانہ .. عمومی . ۲۵ روپے

خصوصی ... ۱۵/ پندرہ روپے

لائف ممبری ... سو روپے

پتہ

بخشی بازار، کٹک نمبر (۱)

اڑیسہ

ترتیب

میرا صفحہ

لکھنؤ۔ ۲/۱۲/۷۲۔

"۔۔۔۔۔کل صبح ۹ بجے پروفیسر سید احتشام حسین رضوی صاحب مشہور تنقید نگار کا الٰہ آباد میں اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ اطلاعاً تحریر ہے۔"

مخلص

"رشید قریشی"

لکھنؤ سے آیا ہوا رشید قریشی کا خط پیشِ نظر ہے۔ میری آنکھیں ایک نامعلوم جذبے کے تحت ڈبڈبا گئی ہیں۔ احتشام صاحب کی موہنی صورت آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔ جیسے اب بھی وہ مجھ سے اپنے مخصوص شفقت آمیز لہجے میں کہتے ہوں۔ "آپ کا کیا کہنا، آپ کے سوچنے کا اپنا انداز ہے۔"

یا

"ریاضیات میں تو آپ کا کام اعلیٰ پایہ کا ہوگا ہی، لیکن مجھے تو آپ میں ادبی صلاحیتیں غیر معمولی نظر آئیں۔ ان کی طرف سے غافل نہ رہیے۔"

لیکن یہ شفقت آمیز آواز آج ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی ہے۔ صرف اس کی گونج ہمارے ذہنوں میں محفوظ رہ گئی ہے۔ احتشام صاحب کی شخصیت میں اتنی جاذبیت تھی اور ان کی باتوں میں اتنا خلوص تھا کہ جس نے ایک بار بھی انہیں دیکھ لیا یا ان سے گفتگو کی وہ ان کا شیدائی بن گیا۔ مجھ جیسے ہزاروں شیدائیوں کو رنج و غم کے طوفان میں گھرا ہوا چھوڑ کر خود ہر طرح کے رنج و غم سے آزاد ہو گئے۔ نہیں نہیں احتشام صاحب اس قدر خود غرض نہیں ہو سکتے۔ انہیں تو زندگی بھر دوسروں کی دل آزاری کا فن معلوم نہیں تھا۔ انھوں نے تو مجھے ایک بار لکھا تھا کہ "میں تو ان لوگوں سے بھی ناخوش نہیں جو مجھے گالیاں دیتے ہیں۔ اور آپ تو ہمیشہ محبت و احترام سے یاد کرتے ہیں۔ آپ سے کیوں ناراض ہوں گا۔!"

خلوص کا یہ عکس بیکراں آج ہمیشہ کے لئے ہماری نظروں سے روپوش ہو گیا۔ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ لیکن یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔ مشیتِ ایزدی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہی پڑتا ہے۔

ہمارے ادب میں ایک روایت چلی آ رہی ہے کہ جو ادیب جس قدر بڑا ہوگا دوسروں کو اسی قدر حقارت کی نظر سے

دیکھے گا، دوسروں کے خط کا جواب خاموشی سے دینے کو اپنے لئے اسی قدر باعث افتخار سمجھے گا! کسی نئے ادیب کی ہمت افزائی کے لئے دو چار سطریں بطور تقریظ لکھنا تو کجا بار بار خوشامد کے باوجود لکھ دینے کا وعدہ کر کے عین موقع پر بیچارے کو دھوکا دے گا۔ لیکن احتشام صاحب کا دامن بڑے ادیبوں کی مندرجۂ بالا "خوبیوں" سے خالی تھا۔ انھوں نے خود کو بقراط یا فرعون تصور نہیں کیا۔ حالانکہ اردو کی تنقید کو نئے ابعاد سے روشناس کرانے کے سلسلے میں ان کا عطیہ اس قدر زیادہ ہے کہ وہ اپنی ذات پر بجا طور پر فخر حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن انکساری تو گویا ان کی سرشت میں داخل تھی۔ ہر کس و ناکس کی پہنچ ان تک بآسانی ہو سکتی تھی۔ معمولی سے معمولی ادیب ان سے تقریظ لکھوا سکتا تھا۔ اور اس کے لئے وہ خاصے بدنام بھی تھے۔

سننے میں آیا ہے کہ شادی، ولیمہ، منگنی اور ختنہ جیسی تقریبوں کی نجی ادبی نشستوں میں بھی، ان کو کرسیٔ صدارت پیش کی جاتی تھی اور وہ اسے خندہ پیشانی سے قبول کر لیتے تھے۔ لیکن اگر غور کیجئے تو ان کی انکساری اور سادگی ہی میں ان کی ہر دلعزیزی کا راز پنہاں ہے۔ آج وہ تمام محفلیں ان کی یاد میں آنسو بہا رہی ہیں، جن کو وہ رونق بخشتے آئے تھے۔ معمولی سے معمولی ادیب جس کو احتشام صاحب کی تقریظ یا رائے حاصل ہے، آج اشکبار آنکھوں میں ان کی تحریر کو اس لیے حرزِ جان بنائے ہوئے ہے کہ یہ اس بیچارے کے لیے ایک سند کا درجہ رکھتی ہے جس سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

انجمن ترقی اردو ہند، ترقی اردو بورڈ، انجمن اساتذہ اردو (ہند)، مختلف یونیورسٹیوں کے بورڈ آف اسٹڈیز سے لے کر چھوٹی چھوٹی نجی محفلوں تک سب پر رنج و غم کا سایہ پڑا ہے اردو کی نئی نسل اس لیے مضمحل ہے کہ روشنی کا ایک ایسا بلند مینارہ بجھ گیا جس سے اکتساب نور کر کے یہ نسل اپنی منزلِ مقصود کی جانب گامزن تھی اور جس کے بجھ جانے سے اس کے سامنے گویا اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا ہے۔

غرض کہ احتشام صاحب کے انتقال پر ملال کی خبر سے ہر پرانا اور ہر نیا ادیب مضمحل اور افسردہ ہے۔ ہر شخص کا ذہن ماؤف اور شل ہو کے رہ گیا ہے۔ ایک دوسرے کو جو بھی خط لکھتا ہے، اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی غرض سے اس میں مرحوم کی خوبیوں کا والہانہ ذکر ہوتا ہے۔ کوئی احتشام صاحب کی محنت، عبادت اور ریاضت کا ذکر کرتا ہے تو کوئی ان کی سادگی اور انکساری کا۔ کوئی ان کی انسانیت دوستی کا ذکر کرتا ہے تو کوئی ان کی اردو تحریک کی قیادت کا۔ کشمیر اور پنجاب سے لے کر میسور اور مدراس تک اور بنگال اور اڑیسہ سے لے کر گجرات اور مہاراشٹر تک کہاں مرحوم کی یاد میں جلسے نہیں ہوئے؟ کہاں آنسو نہیں بہائے گئے۔؟ چاروں طرف صف ماتم بچھی ہوئی ہے۔ بقول امجد نجمی ؎

بلبلِ رنگین نوا خاموش ہے
باغ کی ساری فضا خاموش ہے

غور فرمایئے کہ جس شخص کی زندگی قلندرانہ انداز سے گزری، اس کی موت کس قدر شاہانہ تھی۔ میرے اس جملے سے بعض لوگوں کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ بلکہ بعض رسالوں کے مدیروں نے اپنے اس خیال کا اظہار بھی کیا ہے۔ کہ ایک سیاست داں یا سائنس داں کی موت سے ملک بھر میں جس طرح ماتم منایا جاتا ہے، احتشام صاحب جیسے بلندپایہ ادیب پر اس طرح نہیں ہوا بلکہ کوئی پوچھنے ہی والا نہیں ہے کہ احتشام حسین کون تھا۔ اس طرح کی غلط بیانی دراصل بعض لوگوں کی کج فہمی کا نتیجہ ہے۔ شہرت حاصل کر لینا اور بات ہے اور دلوں میں گھر کرنا اور بات۔

احتشام حسین دلوں میں گھر کرتا تو کیا دلوں پر حکومت کر رہے تھے۔ سیاست داں یا سائنس داں کی وفات پر ماتم کرنے والوں کا دور فوراً ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن احتشام حسین جیسے بلند پایہ ادیب اور بلند کردار شخصیت کی موت پر رونے والے انسان ہر دور میں پیدا ہوتے رہیں گے۔

۱۹۶۲ء میں جب میں نے "آبِ خضر" کا ایک نسخہ احتشام صاحب کی خدمت میں پیش کیا تو انھوں نے بڑے حوصلہ افزا کلمات لکھے کہ "ظلمات سے چشمۂ حیوان نکالنا اسی کو کہتے ہیں۔" یہ ان کا پہلا خط تھا۔ اس کے بعد ان سے وقتاً فوقتاً خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۶۵ء میں پہلی بار ان سے ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب کے مکان پر ملاقات ہوئی۔ وہاں انھوں نے اپنے بارے میں بتایا کہ کس طرح نیاز فتح پوری نے سب سے پہلے ان کے ایک افسانے کو ناقابلِ اشاعت قرار دے کر بعد میں اسے "نگار" میں شائع کیا اور اس کے بعد "نگار" کے افسانہ نمبر میں بھی اس کو [illegible]

اس ملاقات کے بعد احتشام صاحب نے دوسرے دن مجھے اپنے یہاں دعوت دی۔ تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے تک مختلف ادبی مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے اپنا مضمون "جدید شاعری اور اس کا پس منظر" (جسے زمان فتحپوری کی فرمائش پر نگار پاکستان کے "جدید شاعری نمبر" کے لئے لکھا تھا) پڑھ کر سنایا۔ انھوں نے میری باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے مضمون کو بے حد پسند کیا۔ میری بیاض سے نظم "خاکے" بار بار پڑھ کر لطف اندوز ہوتے رہے۔ بعد میں جب نگار پاکستان کا "جدید شاعری نمبر" شائع ہوا تو انھوں نے خط کے ذریعہ اس طرح رائے دی۔ "نگار نے جدید شاعری نمبر بہت اچھا نکالا اگرچہ اس کے ساٹھ ستر فی صدی مضامین پرانے ہیں۔ آپ کا مضمون پھر پڑھا اور بے حد پسند آیا۔"

الہ آباد میں احتشام صاحب سے جو میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے متعلق ایک خط میں انھوں نے لکھا تھا۔ "ملاقات مختصر ہی تھی۔ لیکن ایک دوسرے کو پہچاننے کے لئے کافی تھی۔"

احتشام صاحب سے دوسری بار ملاقات کشمیر میں اردو ٹیچرز کانفرنس ۱۹۶۶ء میں ہوئی۔ جدید شاعری پر جو سیمینار ہوا تھا اس میں انھوں نے صدارت کی تھی۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، شہاب جعفری وغیرہ نے جدید شاعری پر مقالے پڑھے۔ احتشام صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں بڑی معقول بات کہی تھی کہ "ہمیں جدید شاعری کو محض یہ سوچ کر نہیں پرکھنا ہے کہ یہ نئی ہے۔ بلکہ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس کا معیار کیا ہے۔"

وادیٔ کشمیر میں شالیمار، نشاط باغ، چشمۂ شاہی ہر جگہ ان کا ساتھ رہا۔ ٹورسٹ ہال میں مشاعرہ تھا۔ سے ان کا کلام سننے کا موقع ملا۔

میرا اتنا نصیب کہاں کہ ان کی خدمت میں کچھ روز گزار کر ذاتی طور پر ان سے فیض یاب ہوتا۔ اس قدر مختصر ملاقات کے باوجود وہ مجھے بے حد عزیز رکھتے تھے۔ اس کی بہت بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ ان کا مزاج میرے مزاج سے حد تک ہم آہنگ تھا۔ بلکہ تنقید کے میدان میں تو میں انھیں اپنا پیر و مرشد تصور کرتا تھا۔

یہ اتفاق کی بات ہے کہ گزشتہ دس سال کے اندر مختلف رسائل میں ان کے جتنے بھی مضامین میری نظر سے گزرے تقریباً ان سب سے مجھے اتفاق تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح اس اختصار میں شمس الرحمٰن فاروقی کے جتنے بھی مضامین نظر سے گزرے ان سے مجھے اختلاف تھا۔ "شاعر" کے غالب نمبر میں شائع شدہ ان کے مضمون "شاعری اور نفس [illegible]" کے ان جملوں سے کہ "آج کا انسان جذبات اور تصورات کی لاکھ بازآفرینی کرے، لیکن وہ ۱۹[illegible]ء کا انسان

بن سکتا: میں اس حد تک متاثر ہوا کہ اپنی نظم "غالب اور نئی نسل" میں اسی خیال کو اس طرح پیش کیا ہے۔

"جس قدر چاہے قیاس آرائیوں کے رخش دوڑاتے رہو۔
پھر بھی تم سو سال کے پہلے کے قاری کا بدل بن ہی نہیں سکتے کبھی
آج سے سو سال کے پہلے کا اک ہمدرد قاری۔
ان بہاروں، ان خزاؤں کا تھا گہرا رازداں۔
جن کے خرمن کا بنا تھا میں بھی خوشہ چیں کبھی"

احتشام صاحب شروع ہی سے "شاخسار" کی فلاح و بہبود کے خواہاں تھے ہی، لیکن میرے شعری مجموعہ "شعاعوں کی صلیب" کی طباعت کے سلسلے میں انھوں نے غیر معمولی دلچسپی کا ثبوت دیا۔ یہ کتاب گویا انھیں کے زیر اہتمام اس قدر خوبصورت شائع ہو سکی۔ کتابت، طباعت، سرورق ہر معاملہ میں" سعید عارفی ان سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ میں بھی انھیں وقتاً فوقتاً خط کے ذریعہ زحمت دیتا۔ وہ اپنے دور افتادہ عزیز کی خاطر ہر طرح کی زحمت برداشت کرنے کو تیار تھے۔ کبھی انھوں نے سرورق کے بارے میں رائے دی کہ "آرٹسٹ نے بہت خوبصورت اور معنی خیز خطوط اور رنگ دیئے ہیں۔ مجھے بہت پسند آیا۔" کبھی لکھا کہ "میں بھی کاتب سلیم اللہ کو کھٹکھٹاؤں گا۔" تو کبھی لکھا "آج ہی کل میں کسی وقت اصرار کر کے پریس والوں سے بھی مل لوں گا۔" "اب پریس میں چھاپنے ہی جا رہا ہے۔ میں بھی مل کر دباؤ ڈالوں گا۔ واقعی بہت دیر ہو گئی۔" اب آپ ہی غور کیجئے کہ اتنا خلوص آج کل کہاں ملتا ہے۔؟

یہاں میں آپ کے سامنے چند واقعات بیان کرتا چلوں۔ جن کی روشنی میں ان کی شخصیت کے بعض اہم گوشے آپ کے سامنے آسکیں گے۔

۱۹۶۵ء میں الہ آباد کے سفر کے دوران میرے کچھ پیسے گم ہو گئے تھے۔ احتشام صاحب کو جب اس کا علم ہوا تو انھوں نے خود زبردستی مجھے پچاس روپے (بطور قرض) عطا کئے حالانکہ میں انھیں زحمت دینا نہیں چاہتا تھا۔ اسی طرح ۱۹۶۷ء میں کشمیر سے واپسی کے لئے بس کی ٹکٹ میں نے دو روز قبل خریدی تھی۔ بس علی الصباح نکلنے والی تھی اور یونیورسٹی (جہاں ہم لوگوں کا قیام تھا) سے بس اسٹینڈ تک علی الصباح جانے کا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا تھا۔ احتشام صاحب نے یونیورسٹی کے کارکنوں سے بار بار تقاضہ کر کے رات ہی کو بس اسٹینڈ تک پہنچانے میں مدد کی۔ یہ چھوٹے چھوٹے واقعات سہی، لیکن اعلیٰ انسانی اقدار کے ایسے نمونے ہیں جو اس تصنع زدہ دور میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔

کشمیر کا ایک اور واقعہ آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔ احتشام صاحب نے ڈاکٹر گیان چند کی موجودگی میں کہا: "کرامت صاحب اردو میں لکھتے ہیں، اس لئے عام طور پر لوگ انھیں اردو ڈپارٹمنٹ کا آدمی سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے انھیں اردو ٹیچرس کانفرنس میں دعوت دے کر بلا لیا۔" میں نے کہا کہ "مجھے کانفرنس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ بلکہ آپ لوگوں سے ملنے کی خاطر یہاں پہنچا۔" ڈاکٹر گیان چند نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں کہا: "ہم میں کون سی ایسی خوبی ہے کہ آپ اتنی دور سے تشریف لائے۔ اگر اتنا پیسہ خرچ کر کے بمبئی جاتے تو کسی ایکٹریس سے مل سکتے تھے۔" احتشام صاحب کی بذلہ سنجی ملاحظہ فرمایئے۔ انھوں نے فوراً کہا "کرامت صاحب بیوی بچے والے آدمی ہیں۔ ایکٹریس سے مل کر کیا کریں گے۔؟" افسوس کہ احتشام صاحب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ لیکن ان کی یہ باتیں کیسے

پھیلائی جا سکتی ہے۔

احتشام حسین صاحب عام طور پر "مارکسی نقاد" کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن میری رائے میں انھیں "مارکسی نقاد" کا لقب دینا ان کی فعال و متحرک تنقید کے لامتناہی پہلوؤں کو محدود و مسدود کرنے کے مترادف ہے۔ انھوں نے ترقی پسندی سے لے کر جدیدیت تک ہر طرح کے صحت مند تجربوں کا خوش دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ یہ ہمارے ادب کا ایک ناقابلِ معافی المیہ ہے کہ ان کے خلاف طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلانے کی کوششیں کی گئیں۔ ان کی مخالفت کو جدید ہونے کا بہت بڑا پیمانہ قرار دیا گیا۔ لہٰذا کئی لوگوں نے عمیق حنفی سے متعلق لکھا ہے کہ حالانکہ وہ بیشتر گروپ سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن احتشام حسین سے مخالفت کی وجہ سے انھیں جدید گروپ میں شمار کیا جانے لگا۔

ہمیں دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ان کے انتقال کے بعد بھی ان کے خلاف غلط فہمی کا زور کم نہیں ہوتا ہے۔

چنانچہ ۸ر دسمبر ۱۹۷۲ء کے اداریہ میں پروفیسر آل احمد سرور ان سے متعلق اس طرح رقم طراز ہیں:

"وہ ادب کی تنقید میں میرے نزدیک سماجی پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے تھے اور ادب کے جمالیاتی پہلو پر کم ۔ ۔ ۔ ۔ جدیدیت کی رو سے وہ خوش نہ تھے۔ ان کا ایک خاص مزاج بن چکا تھا اور وہ اس عمر میں اپنے آپ کو بدل نہیں سکتے تھے۔ اسی لئے اپنے راستے پر گامزن رہے۔"

اسی طرح جنوری ۷۳ء کے "شب خون" میں شمس الرحمٰن فاروقی رقم طراز ہیں:

"احتشام صاحب ترقی پسند تھے اور غلطے کٹر ترقی پسند تھے۔ ادب میں نئی تبدیلیوں سے وہ بہت خوش نہ تھے۔"

میری رائے میں احتشام صاحب نے اپنی فعال طبیعت کی وجہ سے اپنے سابقہ رویہ میں کافی حد تک تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ گذشتہ دہائی میں انھوں نے جتنے بھی مضامین لکھے، ان کے بارے میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں ادب کے سماجی پہلو اور جمالیاتی پہلو کا ایک خوشگوار توازن پایا جاتا ہے۔ وہ ادب کے جمالیاتی پہلو کو زبردستی مصنوعی طریقے پر سماجی پہلو سے الگ کر کے دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے آخری دور کے مضمون "جمالیات، فن کار اور قاری" (مطبوعہ شاعر) اپنے نظریے کی اس طرح وضاحت کی ہے:

"اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حسن کا مادی اور خارجی وجود بھی ہے اور اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اس کے جغرافیائی، علاقائی اور تہذیبی تصور بھی ہو سکتے ہیں۔ ورنہ شاعری، مصوری، موسیقی میں ملکوں ملکوں میں جو فرق ہے اور اس سے پیدا ہونے والا جو ردِ عمل ہے وہ ایک دوسرے سے اتنا مختلف نہ ہوتا۔ یہی نہیں بلکہ تلازمۂ ذہن اور تلازمۂ نفس کی وجہ سے حسن بھی خانوں میں بٹ جاتا ہے۔ فلمی دھنوں پر مرمٹنے والے دھرپد اور خیال سے بیگانہ گزر جاتے ہیں۔ قوالی پر وجد کرنے والے مگن کے ہونے سے بے خبر ہوتے ہیں۔ مشرق و مغرب کو تو چھوڑیئے۔ خود ایک ہی علاقے میں بسنے والے اپنے ذہنی رجحان اور نفسیاتی ردِ عمل کی وجہ سے حسن کو مختلف شکلوں میں تلاش کرتے ... اور تسکین پاتے ہیں۔"

احتشام صاحب نے جو کچھ کہا ہے، اس سے شاید ہی کسی شخص کو اختلاف ہو سکتا ہے۔

یہ کہنا احتشام صاحب پر سب سے بڑا ظلم ہے کہ "جدیدیت کی رو سے وہ خوش نہ تھے۔ کیونکہ "ان کا ایک خاص مزاج بن چکا تھا اور وہ اس عمر میں اپنے آپ کو بدل نہیں سکتے تھے۔" اگر وہ جدیدیت کی رو سے ناخوش ہوتے تو ان کے انتقال

پر پوری نئی نسل اس قدر گہرا اثر قبول نہ کرتی اور اس کے ذہن پر اس قدر رنج و اضمحلال کی فضا طاری نہ ہو جاتی۔ مارکسی نقادوں میں سردار جعفری، سجاد ظہیر، وغیرہ سب کا ذکر آتا ہے۔ نئی نسل ان لوگوں کی باتوں کو کیوں نہیں اتنی اہمیت دیتی جتنی کہ احتشام حسین کی باتوں کو دے رہی تھی۔ نئی نسل کے دلوں میں ان مارکسی نقادوں کے لئے کیوں وہ جگہ نہیں جو احتشام صاحب کے لئے تھی؟ سبب ظاہر ہے۔ احتشام صاحب نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ عصری مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ اور نئی نسل ان باتوں میں وہ وزن پا رہی ہے جو دوسروں کے یہاں مفقود ہے۔

ہمارے سینئر گروپ کے نقادوں میں کلیم الدین احمد سے لے کر اختر اورینوی اور مجنوں گورکھپوری تک کی تنقید یا تو شوروم میں رکھنے کی قابل ہے یا کسی مندر میں بت بنا کر پوجے جانے کی۔ نئی نسل کو ان نقادوں سے کیا لینا دینا ہے؟ صرف آل احمد سرور اور احتشام حسین۔ یہ دو نقاد ہیں جن کی تنقیدوں سے نئی نسل کو روشنی ملتی آئی ہے۔ آل احمد سرور نے نئے شعر و ادب کے لئے نئے احساس اور نئے طرز اظہار پر زیادہ زور دیا اور اچھے اور برے کے پھیر میں نہ پڑنے کی تلقین کی۔ جبکہ احتشام حسین نے نئے احساس اور نئے طرز اظہار کے پہلو بہ پہلو خوب و زشت تصور کو بھی بروئے کار لانے کی تلقین کی ہے جسے حال و ماضی کے تجربوں سے شعور سلیم نے فراہم کیا ہے۔ فنکار کے احساس کی سچائی پر احتشام صاحب زیادہ زور دیتے تھے۔ وہ جدید شعر و ادب کے نام پر اچھے برے ہر طرح کے تجربات کو حلق سے نیچے اتارنے کے لئے تیار نہیں تھے اس اعتبار سے میرا نظریہ احتشام صاحب کے نظریہ سے بہت قریب تھا۔

میری طرح ان کا بھی نظریہ یہ تھا کہ جدید شعر و ادب کا ایک معتد بہ حصہ احساس کی سچائی کے فقدان کے سبب ناکامیاب ثابت ہو رہا ہے۔ "سطور" میں شائع شدہ میرے مضمون "جدید شعری رویہ سا تویں دہائی میں" سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے مجھے لکھا۔

> "آپ تو بہت ہی خیال انگیز مضامین لکھ رہے ہیں۔ غالباً لکھ چکا ہوں کہ "سطور" والا مضمون مجھے بہت پسند آیا۔ آپ نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ نئی شاعری نے جو اپنی دنیا محدود کر لی ہے وہ نہ تو شاعری کے لئے مفید ہے اور نہ شعرا کے اس دعوے کی ترجمان کہ وہ اپنے عصر کی حقیقتوں کے ترجمان ہیں۔ ایک بات البتہ یاد رکھنے کی ہے کہ جس طرح بہت سے شاعر محض موضوع کو. . . . . سامنے رکھ کر موت اور تنہائی اور شہری صنعتی زندگی کی الجھنوں پر نظمیں لکھ رہے ہیں۔ اگر اسی طرح بغیر سچے احساس کے زندگی کے اور مسائل پر لکھیں گے تو کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ بہر حال یہ اچھا ہے کہ آپ نے بعض مثبت حقائق کی طرف متوجہ کیا ہے۔ میں بھی بارہا اس خیال کو پیش کر چکا ہوں۔"

گزشتہ دہائی میں، جدید شعر و ادب کے نام پر جس طرح ادبی سیاست کا جال بچھایا گیا، اس سے احتشام صاحب کو وحشت سی ہونے لگی۔ چونکہ بیشتر موقع پرست جدیدیوں کے حملوں کا جواب انھوں نے اس لئے خاموشی سے دیا کہ غیر علمی انداز میں گفتگو کرنا ان کا شیوہ نہیں تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ جدید نقادوں میں سے بیشتر ایسے ہیں جو انگریزی میں کہی گئی پرانی باتوں کو اردو میں دہرا رہے ہیں۔ حالانکہ کہنے والوں کو یہ باتیں نئی نظر آ رہی ہیں۔ انکے ایک اہم خط کا اقتباس درج ذیل کر رہا ہوں۔ جس سے آپ کو اندازہ لگ جائے کہ جدید نقادوں کی ادبی سیاست سے کس قدر وہ بیزار تھے۔ فرماتے ہیں:-

"شاخسار میں آپ کے رشحاتِ قلم دیکھ کر طبیعت خوش ہوتی ہے۔ سائنٹیفک مزاج کے ساتھ ادبی ذوق کی آمیزش نادر چیز ہے۔ وہ آپ کے یہاں موجود ہے۔ نئی شاعری کے مسائل کے متعلق آپ کا نقطۂ نظر افراط و تفریط سے محفوظ رہتا ہے۔ جہاں اختلاف کی گنجائش بھی ہوتی ہے۔ وہاں محض جذباتیت سے نہیں ہوتی۔ یہ بڑی بات ہے۔ نئی شاعری کے متعلق لوگوں نے ایسی انوکھی اور دلچسپ باتیں کہی ہیں کہ ان کا جواب خاموشی ہے۔ اس لئے نہیں کہ ان سے اختلاف ہے بلکہ اس لئے کہ یا تو وہ باتیں پیش پا افتادہ ہیں۔ اور کہنے والوں کو نئی نظر آرہی ہیں۔ یا اس لئے کہ ان کا انداز خالص غیر علمی ہے۔ گو آہستہ آہستہ بادل چھٹ رہے ہیں اور اعتدال پیدا ہو رہا ہے۔ لیکن طرح طرح کے وجوہ سے اختلاف کو برقرار رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

بحث اگر صحیح نتائج تک پہنچنے کے لئے کی جائے تو مفید ہے۔ لیکن جہاں یہ خیال ہو کہ ادبی مسائل کے نتیجہ خیز ہونے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہاں اسکی حیثیت چھیڑ چھاڑ کے سوا کچھ نہیں رہ جاتی۔ ہر شخص دوسروں کو چند گالیاں دے کر اپنے کو غیر جانب دار اور خالص آزاد نقطۂ نظر رکھنے والا ظاہر کر کے مضمون شروع کرتا ہے۔ اور ہر طرح کے ادعا کے باوجود وعظ و پند، فتوے اور اعلان پر اتر آتا ہے۔ بہرحال مجھے یقین ہے کہ آخر کار فتح وقت اور تعقل کی ہوگی۔"

خدا کے فضل و کرم سے احتشام صاحب کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہو رہی ہے۔ اور شدت پسند جدیدیت کی جو ہوا کچھ دن ہوئے ہمارے ادب میں چل رہی تھی، اس کی رفتار سست پڑ گئی ہے۔ خس و خاشاک میں سے جواہر پارے رفتہ رفتہ سامنے آرہے ہیں۔ وہ جدید شعراء جن کو اپنی شدت پسند جدیدیت پر ناز تھا۔ قصۂ جدید و قدیم کو دلیلِ کم نظری قرار دینے پر مائل نظر آرہے تھے۔ اس اعتبار سے احتشام حسین ترقی پسندی، جدید اور قدیم کی افراط و تفریط سے پاک صالح اور صحت مند شعر و ادب کی علامت کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ "کل نفس ذائقۃ الموت" کے مصداق ان کا وجود اس عالم ناپائدار سے ختم ہو چکا ہے۔ لیکن ادبی دنیا میں ان کی یہ علامتی حیثیت تاقیامت زندہ رہے گی۔"

ان کے انتقال کے بعد متعدد رسالوں نے "احتشام حسین نمبر" نکالنے کا اعلان کیا ہے۔ اس اعلان سے جہاں احتشام صاحب کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے وہیں اس مردہ پرست قوم کے رویّہ کا افسوس ہوتا ہے کہ احتشام صاحب کی زندگی میں ان کے لئے کچھ نہیں کیا۔ غالباً "شاعر" کے علاوہ کسی دوسرے رسالے نے "احتشام حسین نمبر" نکالنے کے بارے میں سوچا تک نہیں۔ اعجاز صدیقی مدیر "شاعر" کے ذہن میں تو یہ بات آئی تھی، لیکن بدقسمتی سے عملی جامہ پہننے سے قبل ہی احتشام صاحب راہی ملکِ عدم ہو گئے۔

احتشام حسین نے عملی تنقید کی بہ نسبت اصولی اور نظریاتی تنقید پر زیادہ توجہ دی ہے اور اردو کی اصولی اور نظریاتی تنقید کو بامِ عروج تک پہنچایا ہے۔ کسی زبان کی عملی تنقید سے وہی شخص دلچسپی لے سکتا ہے۔ جس کو اس زبان سے دلچسپی ہو۔ لیکن اصولی اور نظریاتی تنقید کا دائرۂ عمل زیادہ وسیع ہے اور دوسری زبان کے ادیبوں کے لئے بھی دلچسپی کا سامان مہیا کر سکتی ہے۔ اور ان کے لئے مشعلِ راہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ میں احتشام حسین کے پرستاروں "احتشام

یادگار کمیٹی" کے ممبروں اور نیشنل بک ٹرسٹ کے تمام ارباب حل وعقد سے درخواست کروں گا کہ احتشام صاحب کی اصولی اور نظریاتی تنقید کے اعلیٰ نمونوں کو ہندوستان کی اور بیرونی ممالک کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کر کے پیش کریں۔ تاکہ احتشام صاحب کو بین الاقوامی ادبی حیثیت حاصل ہو۔ ہم اردو والے، اس بات پر فخر کر سکیں گے کہ ہم میں بھی ایک ایسا جینئس (GENIUS) گزرا ہے جس کے کارناموں کو ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، آئی۔ اے۔ رچارڈز، سی۔ ڈے، لوئیس، کرسٹافر کاڈول جیسے بین الاقوامی ادیبوں کے کارناموں کے مقابل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

احتشام حسین نے اڑیسہ جیسے دور افتادہ علاقے کے ادیبوں کو وقتاً فوقتاً جس طرح سراہا ہے، اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔

حیدر نایاب صاحب کے شعری مجموعہ پر رائے دیتے ہوئے انھوں نے کہا ہے:

"یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کے ان علاقوں میں اردو شعر و ادب کو فروغ ہو رہا ہے۔ جو قدیم مراکز سے دور تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اردو کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے۔ اور وہ علاقائی حد بندیاں ٹوٹ رہی ہیں۔ جنھوں نے احساسِ نظر کو محدود کر رکھا تھا۔ اڑیسہ خود ایک اہم ادبی مرکز بن رہا ہے۔ اور اس تابانی کے ساتھ جو عصر جدید نے فکر و خیال کو بخشی ہے۔"

اے اردو زبان، تو احتشام حسین کا ماتم نہ کر۔ احتشام حسین اب بھی تجھ میں زندہ ہے۔ اور قیامت تک تیرے ساتھ رہے گا۔ اس نے تیرے اندر اعلیٰ روایات و اقدار کے جو درخشندہ نقوش چھوڑے ہیں، ان سے تیری جبیں تا ابد تابندہ رہے گی اور آنے والی نسل کے لئے یہ تابناکی یقیناً مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔

اقبال نے سچ کہا ہے۔

آدمی مرتا ہے لیکن یہ فنا ہوتا نہیں
درحقیقت یہ کبھی ہم سے جدا ہوتا نہیں

کرامت علی کرامت

دانش پریمی

سعید عارفی

(پروفیسر سید احتشام حسین کے سانحۂ ارتحال پر)

آج پھر ایک دیدہ ور نہ رہا

جو عدو کا بھی یار بن کے رہا
جو ہمیشہ ہی پیار بن کے رہا
گلشن زندگی میں ہر لمحہ
جو سراپا بہار بن کے رہا

جس کے درسوں سے کامیاب ہوئے
جس کی صحبت سے فیضیاب ہوئے
سیکڑوں لوگ ہو گئے ضوبار
علم و حکمت کے آفتاب ہوئے

جس نے تنقید کو ادا بخشی
جس نے تحقیق کو ضیا بخشی
عمر بھر خدمتِ ادب کر کے
جس نے ہر صنف کو جلا بخشی

ایک انسانِ باکمال تھا وہ
ایک استادِ خوش خصال تھا وہ
سچ تو یہ ہے کہ عصرِ حاضر میں
ایک فنکارِ بے مثال تھا وہ

آہ، وہ فردِ معتبر نہ رہا
با صفات اور با ہنر نہ رہا
چشمِ نرگس ہے آج پھر نمناک
آج پھر ایک دیدہ ور نہ رہا

★ ★

چراغ راہگذر

میں اپنے آپ کو لے کر کہاں کہاں نہ پھرا
ہزار جلتے ہوئے دیپ تو ملے مجھ کو
وہ روشنی کا منارہ مگر کہیں نہ ملا۔
وہ روشنی کا منارہ، فیوض کا چشمہ
نہ ہوتا جلوہ فگن میری زندگی پہ اگر
مجھے گرفت میں لیتی فضائے تیرہ و تار
وہی چراغِ سرِ رہگذر تھا کام آیا
رفیق و مونس و ہمدم پکاریے جس کو
حدودِ فہم سے آگے تھا جس کا بحرِ خلوص
ہر ایک حال میں ہم سب کا غم گسار رہا
ہزار جلتے ہوئے دیپ اب بھی باقی ہیں
نہ جانے کیوں مجھے محسوس ایسا ہوتا ہے
کہ اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی
وفا شعار بہاروں میں زندگی نہ رہی
(مطبوعہ شاعر بمبئی)

★ ★

شاعروں کی صلیب

معاصرین کی نظر میں

(اس باب کے تحت ہم صفِ اوّل کے ادیبوں کے ان خطوط کے اقتباسات کو شائع کر رہے ہیں جو مصنف کو "شاعروں کی صلیب" کی آراء کی شکل میں موصول ہوئے ہیں۔ ان خطوط کو شائع کرنے کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ آپ بھی ان آراء سے مرعوب، متاثر یا ضروری طور پر متفق ہوں۔ (کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہر باشعور قاری کی اپنی منفرد رائے ہوتی ہے۔ جس کی بڑی قدر و قیمت ہے) ہمارا مقصد یہ ہے کہ ایک ایسا شعری مجموعہ جس نے اپنی تاریخ اشاعت سے چند مہینوں کے اندر پوری ادبی دنیا میں اس قدر تہلکہ مچا دیا ہے کہ اس کے مطالعہ کا شوق قارئین کرام کے اندر پیدا ہو۔ اگر آپ نے اب تک اس مجموعہ کا مطالعہ نہیں کیا ہے تو اسے کہیں نہ کہیں سے اور کسی نہ کسی طرح حاصل کر کے ضرور پڑھئے اور ہمیں اپنی رائے مرحمت فرمائیے۔ ہم سخت سے سخت مخالف رائے بھی خوش دلی سے شائع کریں گے۔ بشرطیکہ بات پوری سنجیدگی کے ساتھ کہی گئی ہو۔ خود کرامت علی کرامت کا قول ہے کہ "عام قارئین کی رائے کی میرے نزدیک بڑی اہمیت ہے۔ کیونکہ میری شاعری اگر زندہ رہے گی تو عام قارئین کے دلوں ہی میں زندہ رہے گی۔") (ادارہ)

علامہ جمیل مظہری

افضل پور، پٹنہ نمبر ۹

[illegible] دسمبر [illegible]

عزیز کرم کرامت علی صاحب سلام خلوص۔

میں پچھلے مہینوں میں پٹنے سے باہر تھا تو آپ کا ارمغان محبت شاعروں کی صلیب کی صورت موصول ہوا۔ ذرہ نوازی کا شکریہ۔ باوجود اپنے ضعفِ بصر کے بڑے شوق سے ان اوراق زریں کا مطالعہ کیا۔ جہاں تک آپ کی غزلوں کا سوال ہے وہ جدت و قدامت کے درمیان ایک ایسا نقطۂ مفاہمت ہے۔ جس کی مثال آپ کے معاصرین میں کم ملتی ہے۔ بعض اشعار تو ہم بوڑھوں کے لئے بھی قابلِ رشک ہیں۔ ع

"اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"

اب رہیں آپ کی نظمیں تو وہ چونکہ میرے ذوق اور فہم دونوں سے بعید ہیں، اس لئے میں ان کے متعلق کوئی رائے دینے کا اپنے کو اہل نہیں سمجھتا۔ البتہ اپنا تعارف آپ لکھ کر آپ نے ایک ایسی رسم کی بنیاد ڈالی ہے۔ جو ادب کی نئی نسل کے لئے

دعوتِ تقلید ہے۔ ظاہر ہے دوسروں سے سفارشی مقدمہ لکھوانے کی جگہ اگر شاعر خود ہی اپنے مزاجِ شاعری کا تجزیہ کر دے تو قاری کے ذہن پر بھی احسان ہو۔ اس سلسلے میں آپ کا مقالہ علمی اور فکری حیثیت سے بھی قابلِ ستائش ہے۔ بلاشبہ آپ شاعر بھی ہیں مفکر بھی۔ فکر و فن کا یہ اختلاط بہترین اردو ادب کے ارتقاء کے لئے ایک فال نیک ہے۔

دعاگو ار

جمیل مظہری

امتیاز علی عرشی

رضا لائبریری۔ رامپور۔

۱۱ر نومبر ۷۲ء

مکرمی و محترمی، زیدت مکارمکم!

آپ کا مرسلہ تحفہ "شعاعوں کی صلیب" ملا۔ اس کرم کا دلی شکریہ عرض کرتا ہوں۔ میں بیسویں صدی کی پہلی دہائی کے وسط میں پیدا ہوا ہوں۔ یہ آج کل کی شاعری مجھ ۷۰ برس کے بوڑھے کو متاثر نہیں کرتی۔ بلکہ یہ کہوں تو معاف رکھا جاؤں کہ یورپ کی تقلید میں جو رجعتِ قہقری ہم کر رہے ہیں، اس سے مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ مگر آپ کی نظمیں میں نے دلچسپی سے پڑھیں۔ یہ آپ کی کرامت معلوم ہوتی ہے۔ خدا آپ کو تا دیر علم و فن کی خدمت کے لئے باقی رکھے۔ کیا اچھا ہو اگر آپ اپنی اعلیٰ دماغی صلاحیتوں کو، اقبال کی طرح ان شعری سانچوں سے کام لینے میں لگا دیں۔ اگر ایسا ہوا تو میں تو موجود نہ ہوں گا۔ مگر میرے یہ لفظ شاید باقی رہ جائیں کہ بزمِ شعر کے صدر نشینوں میں شمار کئے جائیں۔ اس تحریر میں کوئی بات نامناسب قلم سے نکل گئی ہو تو معاف کیا جاؤں۔

والدعا

احقر عرشی

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

دہلی یونیورسٹی

۴ر جنوری ۷۳ء

محبِ مکرم۔ آپ کا مجموعہ "شعاعوں کی صلیب" بہت لطف لے کر پڑھا اور ایسا محسوس ہوا کہ اس ویرانہ میں پھر بہار آگئی ہے۔ آپ کی حیثیت لالۂ صحرائی سی ہے۔ آپ کی دل سوزی، سرمستی و رعنائی پر مجھے حیرت بھی ہے اور رشک بھی۔ آپ کا

ارادت مند

خواجہ احمد فاروقی

عرش ملسیانی

F4/11 MODEL TOWN
DELHI - NO 9.

۴ر نومبر ۱۹۷۲ء

مکرم مرے

تسلیم "شعاعوں کی صلیب" کا تحفہ ملا۔ آپ نے مجھے ممنونِ وقت کیا۔ اس کے مطالعے سے مسلسل دو دن محظوظ ہوتا رہا۔ نظم ہو یا غزل یا کوئی فرد، آپ کی شخصیت کی کرامت ہر جگہ نمایاں نظر آئی۔ حیرت تو یہ ہے کہ اڑیسہ جیسے دور افتادہ صوبہ کی پیداوار ہو کر آپ نے اردو میں شگوفہ کاریاں کی ہیں۔ کسی ایک شعر یا نظم کا ذکر نامناسب ہوگا۔ مجموعی تاثر یہ ہے کہ شاعر کو علم بصیرت اور احساس و جذبہ کا مالک ہونا چاہئے۔ وہ ماشاءاللہ آپ پورے طور پر اور صحیح و صادق طریق سے ہیں۔ اتنی کم عمری میں اتنا زورِ بیان اور اس میں خیال کا عمق میں نے بہت کم دیکھا ہے۔ ادھر ادھر آپ کا کلام اکثر پڑھتا رہتا تھا بھی گاہ گاہ ملتا رہا ہے۔ مخمور صاحب سے نیاز مندی ہے۔ لیکن میں زیادہ شور و غوغا کا آدمی نہیں۔ اب ملازمت

سبکدوش ہو کر تو پڑھ لکھ کر وقت کاٹ لیتا ہوں، اور
جانتا ہوں کہ گونگا گڑ کا مزہ کسی اور کو نہ بتا ہی سکتا ہے۔
اور نہ اس کے اشاروں کو کوئی سمجھ ہی سکتا ہے۔ یہ دنیا مالش
کی دنیا ہے۔ میں بہت یہ کھیل کھیل چکا ہوں۔ اب اس سے
متنفر ہوں۔ آپ ایسے نوجوان کبھی نوازتے ہیں قرآن کے افکار
...... دیکھ کر خیال آتا ہے کہ زمانہ بہت تیز رفتار
ہے۔ ہم لوگ تو پرانا مال ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اتنی صلاحیت
موجود ہے کہ کھوٹے کھرے کو پرکھ لیں۔ بخدا آپ تو کھرے ہی کھرے
ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنی خاندانی روایت کو بہت آگے
لے جائیں گے۔ آپ کے کتنے ہی شعر بے ساختہ داد لیتے ہیں۔
اور نظمیں غور کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ آپ کی اس عنایت
بے غایت کا پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مخلص

عرش ملسیانی۔

علی جواد زیدی

DI/63, SATYA MARG
NEW DELHI-21

میرے کرم فرما۔

"شعاعوں کی صلیب" ملی۔ بہت شکریہ۔ ابھی تو صرف
ظاہری خوبیوں کو دیکھ پایا ہوں۔ کتابت، طباعت، اور
تزئین، سبھی سے نفاستِ طبع کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ آپ کی
شاعری کے معاملے میں تو پہلے ہی سے جنبہ دار ہوں اور آپ
کو موجودہ شعرا اور نقادوں میں سب سے زیادہ بالغ نظر
اور رموز آشنائے فن و رد یاتِ فن سمجھتا ہوں۔ "لفظ
"موجودہ" کا اطلاق اس نسل پر ہے جو ۱۹۵۰ء کے
آس پاس ابھری ہے۔ کہیں میں جذبات کی رو میں غیر
متوازن تو نہیں ہو گیا۔؟ ... آپ کا۔

علی جواد زیدی۔

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی

۱۴ر دسمبر ۷۲ء

محبی کرامت صاحب، سلام علیکم

آپ کے تحفہ "شعاعوں کی صلیب" کا بہت ممنون ہوں۔
آپ کی شاعری نے نہ صرف اس عام خیال کو باطل کر دیا
کہ ایک سائنس داں شاعری نہیں کر سکتا بلکہ یہ ثابت
کر دیا کہ وہ عام شاعروں سے کہیں بہتر شعر کہہ سکتا ہے۔
کیونکہ اس کی نظر میں جو وسعت اور گہرائی ہوتی ہے۔ وہ
عام شعراء کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ وجدان شرط ہے۔
خدا جسے چاہے اسے بخشش دے رشق ۔ اور مزاولت
نے آپ کے کلام میں حسن بھی پیدا کر دیا ہے۔ اور معنی خیزی
بھی۔ میں آپ کی غزلوں سے خصوصاً بہت لطف اندوز
ہوا۔ اس عنایت کا مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ کے
ترجمے بھی اردو میں خاصہ کی چیزیں ہیں۔

خیر اندیش

نورالحسن ہاشمی

نشور واحدی

کانپور۔

۲۵ر نومبر ۷۲ء

عزیز گرامی پروفیسر کرامت علی کرامت

اخلاص و محبت

گراں قدر تحفہ "شعاعوں کی صلیب" کی جمال انگیز
صورت میں نظر سے گزرا۔ سبحان اللہ و بارک اللہ۔
جدیدیت سے بلند تر لیکن جدید شاعری کی طرف بہترین
رہنمائی۔ اور اس کی مثال اگر ہو سکتی ہے تو آپ عزیز کی
سخن گوئی۔ مجھے موقع دیجئے اور یاد دہانی کرائیے تو میں

کہ اس مجموعۂ فن پر لکھ لوں جو بنیادی اعتبار سے ایک وجد ورقص ہے۔ لیکن ماہیت شعری کے لحاظ سے ایک فردوس تخیل میں سیر کر سکوں گا۔"

نیاز آگیں
نشور واحدی

دہلی ۔ ۷ر نومبر ۱۹۶۲ء

کوثر چاند پوری

جناب محترم کرامت صاحب تسلیم۔

آپ کا مجموعۂ کلام "شعاعوں کی صلیب" ملا۔ آپ کے شریفانہ اور شاعرانہ خلوص کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے ایسی قیمتی چیز ارسال فرمائی۔ ۔ ۔ ۔ آپ میرے لئے نئے نہیں ہیں۔ آپ کی نظم و نثر عرصے سے دیکھ رہا ہوں۔ شاعرانہ اور ناقدانہ صلاحیت کا معترف ہوں۔ آپ کی۔ میرا عقیدہ ہے کہ شاعری کے لئے علمی پس منظر نہایت ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ شخصیت کا ایسا آئینہ بھی لازمی ہے۔ جس میں سے علم کی شعاعیں گذر سکیں۔ جن لوگوں کے پاس ایسی پتھریلی شخصیت ہے جس کے اندر سے روشنی کا انعکاس نہیں ہو سکتا اور جس میں ذوق و وجدان کی تھرتھراہٹ نہیں، ان کے لئے علمی پس منظر بھی بیکار ہے۔ آپ کی شخصیت میں احساس کا خزانہ دبا ہوا ہے۔ اور ذوق جمال کی نزاکت و رعنائی بھی۔ اس میں بدرجۂ اتم موجود ہے اس لئے آپ ایک اچھے شاعر بن سکے۔ مجھے ایک ہی نظر میں مجموعے میں بہت سے اشعار ایسے مل گئے جن کے پڑھنے سے فطرت مسکرا اٹھی۔ ابتدائی نظم شعاعوں کی صلیب پروفیسر احتشام حسین کے خیال میں نئی شاعری کی نمائندہ نظم ہے۔

اس خیال سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ احتشام صاحب بہت کم باتیں ایسی کہتے ہیں جن سے کوئی سمجھدار آدمی اختلاف کر سکے۔ تاہم اتنا ضرور عرض کروں گا کہ اور نظمیں بھی فکر انگیز ہیں۔ مجھے آپ کی غزلوں میں بھی بڑی جان اور حرارت ملی۔

دیار انجم کے رہنے والو فریب دو تم نہ ہوش کا !
گلوں کے اوراق سے زیادہ مزاج نازک ہے عاشقی کا"

عاشقی کا یہ احترام جو اردو شاعری میں بہت کمیاب ہے۔ شاعر کی انا کا بڑا روشن ثبوت ہے اور ناچیز کی رائے میں وہ چیز ہے جو صرف شاعر ہی کی لطافت ذات کا پتہ نہیں دیتی۔ بلکہ اس میں پوری کائنات کا خلوص سمٹ آتا ہے۔ شعر

"نہ ہو گناہوں کی جس میں لذت ہر لطف کیا ایسی زندگی کا"

مذہبی عقائد کا احترام کرتے ہوئے بھی میں آپ کے اس مصرع کو ایک ناقابل انکار حقیقت سمجھتا ہوں۔ آپ نوجوان ضرور ہیں مگر آپ کی نگاہیں زندگی کی گہرائیوں تک پہونچتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ "شعاعوں کی صلیب" کو ۱۹۶۲ء کے مجموعوں میں سب کے اوپر جگہ ملے گی۔

آزاد غزل کہہ کر آپ نے غزل کی تکنیک میں اضافہ ضرور کیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں اس سے غزل کی روح کو صدمہ پہنچا ہے۔ غزل اور اس کی تکنیک اپنی قدامت کے باوجود دلوں کی دھڑکنوں کی ترجمان ہے۔ غزل میں جب تک دل کی آوازیں سنائی نہ دیں، اس وقت تک اس میں تاثیر اور کشش پیدا نہیں ہوتی۔

اس مجموعہ کی اشاعت پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

نیاز کیش
کوثر چاند پوری

پروفیسر اختر قادری

برادر عزیز کرامت علی کرامت

سلام و رحمت!

"شعاعوں کی صلیب" دو دن رات دل نوازی کرتی رہی

سرورق، کتابت، طباعت اور کاغذ ہر چیز معیاری، پھر
کلام کا کیا کہنا۔ ع
"کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست"
حسنِ مقال، ندرتِ خیال، لفظوں کا استعمال کس کس کی
داد دیجئے!! ع
"اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!!!"
میں شعر منثور اور بیشتر آزاد نظموں سے الجھن محسوس کرتا ہوں
لیکن آپ کے افکار کی دمک اور دل کی کسک، بچے تلے
الفاظ کی مہک روح کو کیف و سرور بخشتی ہے۔ یوں مجھے آپ
کی غزلوں نے بہت محظوظ کیا اور "سرگزشت سفر" نظموں
میں مجھے زیادہ پسند آئی۔۔۔۔۔

اختر قادری
۱۰ اکتوبر ۱۹۷۲ء

پروفیسر اسلوب احمد انصاری

علی گڑھ
مورخہ ۲ دسمبر ۱۹۷۲ء
محبی کرامت صاحب السلام علیکم۔
"شاخوں کی صلیب" کا ایک نسخہ کافی عرصہ ہوا ملا۔ اس
نوازش اور محبت کے لئے سراپا سپاس ہوں، رسید میں تاخیر کیلئے
عذرخواہ ہوں۔ کچھ ایسی مصروفیت رہی کہ مجموعہ کو اچھی طرح پڑھنے
کے لئے وقت نہ نکال سکا۔ اور بغیر پڑھے محض اخلاقی طور پر
رسید بھیج دینا گوارا نہ ہوا۔ آپ کی علمی اور صحافتی لیاقت کا
اندازہ تو "شاخسار" پڑھ کر ہوتا تھا لیکن آپ کی شعری
صلاحیتوں کا اندازہ اس مجموعہ سے ہوا۔ آپ کے فکر اور انداز
بیان دونوں میں ایک اچھوتا پن اور انفرادیت ہے جو زمانۂ
حال کے کم شعراء کے یہاں نظر آتی ہے۔ اور آپ تحت الشعور
کے خزانوں کو جس طرح بروئے کار لاتے اور اپنی سائنٹفک
بصیرت کو جس طرح ادب کے تخلیقی آرٹ میں استعمال کرتے ہیں
اس کی مثال تلاش کرنا آسان نہیں۔ آپ کی آواز جدید اردو
شاعری میں ایک نرالی آواز ہے۔ ع
"اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"

خیر اندیش
اسلوب احمد انصاری
صدر شعبۂ انگریزی

ڈاکٹر مسیح الزماں

الہ آباد
۱۳ اکتوبر ۱۹۷۲ء
محب گرامی۔ تسلیم۔
آج کی ڈاک سے "شاخوں کی صلیب" پہنچی۔ اس سے
پہلے بھی سعید عارفی مجھے اس کی دید سے مسرور کر چکے تھے۔
آپ کی محبت اور قدر دانی کا ممنون ہوں۔ "ایک کیفیت"
اور "ذرہ کا سورج" میں آپ نے جس طرح احساس کی لرزشیں
پیش نظر رکھی ہیں ان سے میں خاص کر متاثر ہوا۔ امید ہے
کہ ادبی حلقوں میں اس مجموعے کا خوش آمدید استقبال
ہوگا۔ والسلام

مسیح الزماں

پروفیسر ذکاء صدیقی

RAMPUR
شنبہ ۱۹ دسمبر ۷۲ء
برادر مکرم۔ السلام علیکم
.....مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ میں
آپ کے مضامین نہ صرف پڑھتا رہا ہوں، بلکہ بڑے غور سے
پڑھتا رہا ہوں۔ آپ کی شاعری سے بھی لطف اندوز ہوتا
رہا تھا، لیکن آپ کا کلام نسبتاً کم دیکھنے کو ملتا تھا۔ اس لئے
آپ کا کوئی IMAGE ذہن میں قائم نہیں ہو سکا تھا۔۔۔

اب میں یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے پاس کوئی بات
نہ صرف کہنے کے لئے ہے۔ بلکہ اس بات کے حسبِ حال کہنے کا
ڈھنگ بھی ہے۔ آپ کا اسلوب جمالیاتی جلال لئے ہوئے
ہے۔ آپ نے یقیناً اس اسلوب کو اجاگر کرنے کی شعوری کوشش
کی ہوگی لیکن اس کے باوجود اس میں ایسی بے ساختگی اور
برجستگی ہے۔ کہ داد سے مستغنی ہے۔ آج کل کسی میں لہجے کی
شائستگی نظر آتی ہے۔ تو دل کو عجیب سی خوشی ہوتی ہے۔ یہی
وجہ ہے کہ میں آپ کی غزل کو نہایت مغتنم جانتا ہوں۔ اب
آپ کے مضامین کا مجموعہ بھی شائع ہونا چاہیئے۔

اخلاص کیش

ذکاء صدیقی

ابن فرید

ALIGAR-11

برادرم۔ السلام علیکم:۔

... پیش لفظ "میرے اوراق زندگی اور میری شاعری"
پڑھ کر سخت غصہ آیا۔ سب کچھ آپ نے ہی لکھ دیا۔ ہم لوگ
کیا لکھیں گے۔ جھک ماریں گے؟ تھوڑا سا تو صبر کیا ہوتا۔
دوسروں کو تو موقع دیتے۔ بعض نظموں کی وضاحت مناسب
بھی تھی۔ اور ضروری بھی۔ یہ دوسری طرح بھی ہو سکتی تھی۔
(مثلاً جیسے عبدالعزیز خالد آخر میں NOTES کی شکل میں کرتے
ہیں) البقیہ کی ضرورت نہیں تھی۔ حالات زندگی بھی برمحل ہیں۔
لیکن آپ نے اپنی شاعری کا خود تنقیدی جائزہ پیش کرکے
اکثر لکھنے والوں کو ایک ہی انداز کے تبصرے لکھنے کا پابند کردیا
ہے۔ اس کا شاید آپ کو احساس نہیں ہوا۔ غصہ ختم۔

"شاعوں کی صلیب" کی اشاعت اگر نہ ہوتی
تو مجھے آپ کی شاعری کے بارے میں اپنی رائے تبدیل
کرنے کا موقع نہ ملتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں جدید
شاعری کا یہ پہلا مجموعہ ہے جو سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر پر
متوجہ کرتا ہے۔ اس میں خامیاں بھی ہوں گی، اختلافات
کی گنجائشیں بھی ہوں گی۔ لیکن ان کے علی الرغم اس میں
معیاری شعری تجربات اس کثرت سے مجتمع ہیں کہ مطالعے
کا شوق فزوں ہو جاتا ہے۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔۔

والسلام

ابن فرید

بلراج کومل

KALKAJI

NOVENBER 30,1973

برادرم کرامت صاحب تسلیم۔

آپ کے کلام کی خصوصیت اس کا نہایت پرخلوص
مہذب یا فنکارانہ لب و لہجہ ہے۔ جس میں ڈھل کر سنگین سے
سنگین موضوع میں دلآویزی اور بانکپن پیدا ہو جاتا ہے۔
آپ ہندوستانی کلچر کی بہترین روایات سے منسلک رہے۔
اور اس وابستگی کا حسن آپ کے پورے کلام کو منور
کرتا ہے۔ سائنسی علوم سے آپ کی واقفیت نے آپ کے
اور آپ کے شعری پیکروں کے درمیان کوئی دیوار حائل
نہیں کی۔ بلکہ آپ کو ایک ایسا ذہن بخشا ہے جو تجربوں کی
متنوع کیفیات کا احاطہ کرنے کے فن سے واقف ہے۔ آپ
کی نظمیں اور غزلیں یکساں طور پر کامیاب ہیں۔ اور یہ
دونوں اصناف آپ کی فنی چابکدستی اور ہمہ گیری کی
مظہر ہیں۔

جدید شاعری کے باب میں آپ کی تخلیقات یقیناً
ایک متوازن اور خوشگوار اضافے کی حیثیت رکھتے
ہیں۔

. . . . میں آپ کو اس
شاندار مجموعے کی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں۔ آپکا

بلراج کومل۔

ڈاکٹر وحید اختر

علی گڑھ ۲۰
۱۷ر نومبر ۸۲ء

برادرم۔ تسلیم۔

آپ کا مجموعۂ کلام "شعاعوں کی صلیب" آج ہی موصول ہوا۔ شکریہ! مجھے خصوصیت سے یہ بات پسند ہے کہ آپ کی شاعری قدامت اور جدت کی افراط و تفریط سے پاک ہے اور آپ جو کچھ کہتے ہیں سوچ کر اور محسوس کر کے رہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کی شاعری آپ کی اپنی ہے۔ اس پر کسی فیشن یا دوسرے اثرات کی چھاپ نہیں اور یہی چیز شاعری کی اصلیت کی اساس ہے...

آپ کا مخلص
وحید اختر

ڈاکٹر وارث علوی

احمد آباد ۱۰

محبی کرامت بھائی۔

"شعاعوں کی صلیب" کی پہلے تو کتاب کے خوبصورت نام اور دیدہ زیب سرورق پر مبارکباد قبول کیجیے۔ کتاب آپ کی نفاست طبع کی آئینہ دار ہے۔ آپ کی شاعری میں ایک کیفیت اور رنگا رنگی ہے۔ مجھے آپ کی غزلیں بہت پسند آئیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی طور پر آپ غزل ہی کے شاعر ہیں۔ کیونکہ غزل میں آپ نے اپنی آواز کو پا لیا ہے۔ ترجمے بھی بہا ہیں اور یہ ایسا کام ہے جو آپ ہی کر سکتے تھے۔

دوسری بات یہ کہ باوجود اس کے کہ میں نے اپنے مضامین میں آپ سے سخت اختلاف رائے کیا۔ آپ نے اپنا مجموعہ ارسال فرما کر جس کشادہ جبینی اور فراخ حوصلگی کا ثبوت دیا ہے اس سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ ورنہ لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہو جاتے تھے۔ میں آپ کے اس حسین سلوک کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ خدا آپ کو خوش رکھے اور آپ کے بال و پر تخیل کو اور بھی زیادہ قوت پرواز عطا کرے۔

خیر اندیش
وارث علوی

مظہر امام

PATNA-4 ۔ ۲۴ر ستمبر ۸۲ء

برادرم! سلام خلوص۔

آپ کا ارسال کردہ گرانقدر تحفہ ۱۲ر کو روانہ ہو کر ۲۳ر کو مجھے موصول ہو گیا۔ بیحد شکر گزار ہوں۔ یہ تحفہ پا کر غیر معمولی مسرت ہوئی۔ عرصے سے انتظار تھا۔ بڑے چاؤ اور دلچسپی سے پڑھا۔ آج پوری کتاب ختم کر ڈالی۔ آپ نے سختی اور خوش ذوقی سے انتخاب کیا ہے۔ ترتیب میں بھی بیحد سلیقہ ہے۔

آپ کی شاعری میں جو فکری لے ہے، وہ آج کی شاعری میں کم تر نظر آتی ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صرف منظر نگاری، پیکر تراشی، اسلوب کی تازگی اور بے ساختگی سے بڑی شاعری معرض وجود میں نہیں آ سکتی۔ مشاہدہ احساس اور جذبے کے ساتھ فکر و فلسفہ کی آمیزش بھی ضروری ہے۔ تمام اعلےٰ شاعری میں یہ اوصاف ملے جلے ہیں۔ آج کے بہت جدید شاعر اس نکتے سے ناآشنا ہیں۔ وہ علم کے بغیر محض فطری طباعی کے سہارے شاعری کرتے ہیں۔ یہ شاعری ہمیں پسند بھی آ سکتی ہے۔ کچھ اچھے شعر بھی مل سکتے ہیں۔ لیکن ایسی شاعری تاریخ ادب کا حصہ نہیں بن سکتی۔ مجھے خوشی ہوتی ہے کہ آپ کی شاعری میں وہ عناصر موجود ہیں، جن سے بڑی شاعری کی تخلیق ہوتی ہے۔ البتہ کہیں

ان عناصر کو زیادہ تابناک اور پروقار بنا دیا ہے۔ اور آپ کی ریاضت، لگن اور ذوقِ مطالعہ کو دیکھتے ہوئے آپ کے خوش آئند امکانات پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ آپ دوسروں سے الگ ہو کر کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بڑی بات ہے۔ یوں تو مجھے اکثر چیزیں پسند آئیں، لیکن نظموں میں "سرگزشتِ سفر" اور "تناسخ" اور غزلوں میں پہلی دو غزلیں "محنت کا" اور "آسمان" سے زیادہ مرکزِ توجہ بنیں ......"

آپ کا

مظہر امام"

فارم ۔ ۴ ۔

قانون ۸ دیکھئے

(۱) مقامِ اشاعت :۔ بخشی بازار، کٹک ۱

(۲) وقفۂ اشاعت :۔ ماہنامہ

(۳) طابع کا نام :۔ امجد نجمی ۔ شہریت ۔ ہندوستانی

پتہ :۔ بخشی بازار، کٹک ۔ ۱

(۴) پبلشر کا نام :۔ امجد نجمی، شہریت ۔ ہندوستانی ۔

پتہ بخشی بازار، کٹک ۱

(۵) ایڈیٹر کا نام :۔ امجد نجمی ۔ شہریت ۔ ہندوستانی

پتہ بخشی بازار، کٹک ۱

(۶) مالک کا نام :۔ امجد نجمی ۔

میں امجد نجمی، تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجۂ بالا اطلاعات میری دانست میں درست ہیں۔

امجد نجمی

(پبلشر کے دستخط)

اظہار اثر

چھوٹے بھائی کا دُکھ

(قارئین سے درخواست ہے کہ وہ اردو کے اس مضمون کو پڑھنے کے لئے انگلش ڈکشنری ساتھ لیکر بیٹھیں تاکہ انگلش الفاظ کے معنی دیکھنے کے لئے انہیں بار بار نہ اٹھنا پڑے — اگرچہ کوشش یہ کی گئی ہے کہ اس میں صرف وہی انگریزی الفاظ استعمال کئے جائیں جو وارث علوی صاحب نے اپنے معرکۃ آرا مقالہ میں تحریر فرمائے ہیں۔ امید ہے کہ اردو داں قارئین ان سے بخوبی واقف ہو چکے ہونگے — مصنف)

مثل مشہور۔ "سگ باش برادر خورد مباش" اس ضرب المثل سے ثابت ہوتا ہے کہ چھوٹے بھائی کا دکھ مسلم ہے۔ جب سے دنیا میں بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی پیدا ہونے شروع ہوئے ہیں چھوٹے بھائیوں کو بڑے بھائیوں سے ہمیشہ شکایت رہی ہے۔ چھوٹے بھائی کی سب بڑی شکایت یہ ہوتی ہے کہ بڑے بھائی صاحب اپنے تجربات کے زعم میں اسکو ہمیشہ ناسمجھ اور بچہ سمجھتے رہتے ہیں اور ہر ہر قدم پر بزرگوں کی طرح نکتہ چینی اور نصیحتیں کرتے رہتے ہیں۔ چھوٹا بھائی بڑے بھائیوں کی عقل اور تجربات پر یقین نہ رکھتے ہوئے اپنے تجربات خود کرنا چاہتا ہے۔ وہ زندگی کی حسینہ اور فن کی دوشیزہ کو اپنے انداز سے RAVISH کرنا چاہتا ہے۔ وہ چوراسی آسنوں والی کتاب پر بھروسہ نہ کرکے اپنے آسن خود ایجاد کرنا چاہتا ہے۔ وہ عروسِ فن کے جسم پر ناخنوں کی خراشوں سے غیر ارضی بیل بوٹے بنا کر "پکاسو" بننے کے خواب دیکھتا ہے۔ وہ چولی مسکانے کی بجائے پھاڑ دینے پر یقین رکھتا ہے۔ وہ بند قبا کھولنا نہیں چاہتا توڑ ڈالنا چاہتا ہے کیونکہ وہ بزعم خود یہ سمجھتا ہے کہ جو VIRILITY اس کو قدرت سے عطا ہوئی ہے بڑے بھائی کے حصے میں نہیں آئی۔ وہ روایات سے قطعی طور پر اپنا تعلق توڑ کر اپنے آپ کو محیر العقول قسم کی شئے بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے جسے وہ جدیدیت کا نام دیتا ہے۔

بڑا بھائی کہتا ہے — "میاں! کبھی ہم بھی تمہاری طرح AMBITIOUS تھے، ہم نے بھی نئے نئے تجربات کئے ہیں، کامرانیوں اور ناکامیوں کی صدہا منزلوں سے گذرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسان روایات سے ناطہ توڑ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجبوراً ایک دن تمہیں بھی آدرشوں اور خلعتوں کا معجون شباب آور اور روایات کی جوارشیں چاٹنی پڑیں گی۔"

چھوٹا بھائی منہ پھیر کر جواب دیتا ہے۔

"بڑے بھائی صاحب آپ BULLY ہیں اور
PHONY بھی۔ آپ صرف اپنے GANG میں رہ کر
ہی زندہ رہ سکتے ہیں۔ آپ کلیشیز میں باتیں کرتے ہیں
آپ کی زبان سوائے ہوا کے کوئی چیز
COMMUNICATE نہیں کرتی آپ
PERSECUTION MANIA کا شکار ہیں
آپ RAREFIED جذبات اور خیالات کو نہیں
سمجھ سکتے۔ آپ ادب کے ARENA میں پہنچ کر مخالف
کے SOLAR PLEXUS میں گھونسہ لگانے کی
بجائے FOUL کرنا چاہتے ہیں۔ آپ میں
SPORTSMANSHIP کا فقدان ہے۔ آپ
کو نہ کھیل کا ETIQUETTE آتا ہے نہ تنقید کے
آداب۔ آپ ہرگز GENUINE نہیں ہو سکتے کیونکہ
آپ میرے جدید تجربات کو IGNORE کرنے کی کوشش
کرتے ہیں۔ ایک REASONABLE آدمی سے
RATIONAL سطح پر ڈائیلاگ ممکن ہے PHONY
کو کیسے سمجھایا جا سکتا ہے کہ ROMANTICISM کیا
ہوتا ہے GLORY کیا چیز ہے اور INFLATED
اسلوب کس طرح بنتا ہے۔"

بڑا بھائی چھوٹے بھائی کا جوش اور غصہ کم کرنے
کے لئے نرم لہجہ میں AT EASE کرنے کی کوشش
کرتا ہے۔

"YOUNG BOY اس میں کوئی شک نہیں
کہ STYLE IS THE MAN۔ لیکن اگر تم اپنا
اسٹائل مضحکہ خیز بنا لو گے تو لوگ تم پر ہنسیں گے۔ میں
تمہارے جذبہ کی قدر کرتا ہوں لیکن تمہاری
APPORACH غلط ہے۔ تم ہر ISSUE کو
ECOLOGICAL نقطہ نظر سے دیکھتے ہو تم
ANTI-SOLEMNITY اور FRIVOLITY کو
دینا چاہتے ہو۔ کیونکہ تم ہائیڈروجن کی "گرم ریت" پر
بیٹھے ہوئے بندر کو دیکھ کر ڈر گئے ہو اس لئے
ANTI-SOLEMN TONE اختیار کرنا چاہتے ہو
کہ دنیا چونک کر تمہاری طرف دیکھے اور تمہیں اس بندر
سے بچائے۔"

چھوٹا بھائی گردن ہلا کر جواب دیتا ہے۔

"AT EASE مجھے OLD MAN کرنے کا
ATTEMPT بیکار ہو گیا۔ میں جانتا ہوں آپ
کی فطرت میں POSSESSIVENESS ہے
آپ اچھے کھلاڑی نہیں بلکہ DRILL MASTER
ہیں آپ صرف GOAL کرنا چاہتے ہیں کھیل میں کوئی
جدت لانا نہیں چاہتے۔ یہی آپ کے PRIMITIVE
ہونے کی دلیل ہے۔ آپ نے کبھی سیسل بی ڈیمل کی فلم
سمسن اور ڈلیلا نہیں دیکھی۔ اس لئے آپ اس منظر
کو نہیں سمجھ سکتے جب سمسن ہیکل گرانے کو بڑھتا ہے
اور بونے اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر اس کو پریشان
کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ نے کبھی ایلیٹ اور
"آڈن" کو نہیں پڑھا اس لئے آپ IRONY کی
لطافت نہیں سمجھ سکتے۔ آپ نے کبھی بیکیٹ نہیں پڑھا
لیکن اسکی چڑیلوں کی طرح آپ حلقے بناتے رہتے ہیں
اور یہ اعلان کرتے رہتے ہیں۔

'ALL HAIL MAEBETH, THAT
SHALL BE KING HEREAFTER'

آپ FAKE ہیں آپ کے بیانات عام طور پر
SWEEPING STATEMENTS ہوتے
ہیں۔ ایک کبھی آپ نے الیگزینڈر پوپ کا یہ
QUOTATION پڑھا ہے۔

'FIRST SLAVE TOWORDS, THEN
TO A NAME, THEN DUPE TO PARTY.'

مجھے یقین ہے کہ آپ نے نہیں پڑھا ہوگا۔ آپ نے برنارڈشا کو بھی نہیں پڑھا ہوگا آپ PENDANTIEBORE ہیں اس لئے آپ کا ذہن DULL ہے اور چونکہ PHILISTINISM ہر قوفی آدمی کا عنصر ہے اس لئے آپ سچائی کو نہیں سمجھ سکتے۔ چنانچہ پلیز مجھے UNDER ESTIMATE نہ کیجئے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے"

چھوٹے بھائی اور بڑے بھائی کی یہ چپقلش ازل سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گی۔ غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ چھوٹے بھائی کو واقعی طرح طرح کے دکھ لاحق رہتے ہیں اسی لئے تو وہ بے چارہ چلاتا ہے، چیختا ہے روتا ہے اور گالیوں پر اتر آتا ہے۔

معاف زمانئے میں اس مضمون کی وجہ آورد" بیان کرنے سے پہلے ہی چھوٹے بھائی اور بڑے بھائی کے جھگڑوں میں پڑ گیا۔ اس مضمون کو آگے بڑھانے سے پہلے میں اپنی صفائی میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میرے اس مضمون کا محرک وارث علوی صاحب کا ایک مضمون۔ "صالح ادب کے بڑے بھائی لوگ" ہے جو اگست سنہ ۷۶ء کے ماہنامہ "شب خون" کے چالیس صفحات پر شائع ہوا ہے۔

وارث علوی صاحب کے اس مضمون کو میں تنقید اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ وہ تنقید کے اصول اور روایات کے منافی ہے۔ البتہ اسکو ایک ناکام تضحیک یا تنقیص کہا جا سکتا ہے۔ ایک قاری کی حیثیت سے وارث صاحب کا مضمون پڑھنے کے بعد میں نے اپنے آپ سے سوال کیا تھا کہ اس مضمون پر چار پانچ گھنٹے ضائع کرنے کے بعد میں نے کیا حاصل کیا۔؟

جواب صفر تھا — کافی موٹا صفر۔

اس مضمون کے مطالعہ کے بعد میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ وارث علوی صاحب نے کچھ اقتباسات کچھ انگریزی کے الفاظ (جنکے متبادل اردو زبان میں انکو نہیں مل سکے) کچھ بازاری، کچھ سیاسی و ادبی اصطلاحات اور کچھ گالیاں جمع کرکے ایک جادو کے پٹارے میں ڈالیں۔ کچھ دیر انکو ہلاتے رہے اس کے بعد پٹارہ کھولا تو یہ مضمون برآمد ہوگیا — اس مضمون کا حاصل جو وارث صاحب نے اپنے مخصوص اسٹائل میں قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے یہ ہے کہ اردو ادب نے کلیم الدین، احمد حسن عسکری شمس الرحمٰن فاروقی اور خود وارث علوی صرف یہ چار عظیم نقاد پیدا کئے ہیں باقی سب انکے خیال میں فونی (PHONY) ہیں۔

اردو کے ہر چار الفاظ کے بعد ایک انگریزی لفظ اور ہر چار جملوں کے بعد ایک انگریزی اقتباس مضمون میں شامل کرکے وارث علوی صاحب نے اردو تنقید کو ایک نیا اسٹائل دینے کی کوشش کی ہے (یا ممکن ہے اس طرح وہ قارئین پر اپنی انگریزی دانی کا رعب جمانا چاہتے ہوں)

چالیس صفحات پر مشتمل اس مضمون میں انگریزی الفاظ اور اقتباسات اتنی وافر تعداد میں ہیں کہ اگر مضمون سے یہ تمام الفاظ اور جملے الگ نکالکر اسی ترتیب سے جمع کر دئے جائیں تو "دعوہ مبالغہ" کم از کم دس صفحات کا اسی "پایہ" کا ایک انگریزی مضمون تیار ہو جائے گا جس معیار کا یہ اردو مضمون ہے انہوں نے اپنا اسٹائل تخلیق کرنے کی وضع میں بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کی وہ مٹی پلید کی ہے کہ ان دونوں رشتوں سے نفرت ہونے لگتی ہے خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ ادب میں کسی نظریہ اور کسی مدرسہ فکر سے مطمئن نہیں ہیں، مضمون میں انہوں نے ہر مدرسہ خیال و نظر کے لوگوں کو دل کھول کر گالیاں دی ہیں ایک طرف وہ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کو

محمد دین زرنی کے قابل سمجھتے ہیں تو دوسری طرف جدیدیوں کے بھی خون کے پیاسے نظر آتے ہیں اور یکہ نواز فنکاروں کو بھی گولی مار دینا چاہتے ہیں اور روائتی شعرا سے بھی جینے کا حق چھین لینا چاہتے ہیں۔

ان کے مضمون کے چند اقتباس آپ کی ضیافت، طبع کے لئے حاضر ہیں ملاحظہ فرمائے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں۔

"احتشام حسین، سردار جعفری، آل احمد سرور فراق سبھی کی تنقیدوں کو جو چیز بڑی تنقید بننے سے مانع رکھتی ہے اس میں منجملہ دوسرے عناصر کے بڑے بھائی کی خصوصیات کا عطیہ کچھ کم نہیں۔ کلیم الدین احمد، حسن عسکری اور شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقیدوں کے باوجود ان کے بہت سے غیر تشفی بخش پہلوؤں، اٹکل فیصلوں اور انقلابی مباحث کے جو چیز ایک تربیت یافتہ پختہ ذہن کی تخلیق ہوتی ہے وہ ان کے بڑے بھائی صاحب کو مکمل طور پر اپنی تنقید سے باہر رکھنے کی کوشش کی ہے۔"

"دوسری مثال ڈاکٹر محمد حسن کی ہے، ڈاکٹر صاحب تنقید میں کم لکھتے ہیں صفحہ دو صفحہ کے ایسے بیانات زیادہ دیتے ہیں جو لحیم و شحیم ناولٹ نمبروں میں برکت کی خاطر تعویز کی طرح آویزاں کئے جائیں (میری درخواست ہے کہ کوئی صاحب وارث صاحب کو بھی اس مضمون کی برکت کے لئے تعویز روانہ فرمادیں)"

"ان بڑے بھائیوں کا بس چلتا تو غالب کے بول و براز کو بھی "شیشہ" پلا دیتے (غالباً یہاں انکی مراد سلسہ وجاہت سے ہے) کہ ہندوستان جیسے لوگوں کے شایانِ شان نہیں (نزاکت خیال اور لطافت زبان ملاحظہ فرمائیے)"

"نقاد جانتا ہے کہ فن کار اس مقام پر ٹھوکر کھائے گا اور اگر اس نے اپنی چال نہ سدھاری تو زندگی بھر ٹھوکریں کھاتا رہے گا اس لئے ٹھوکر کھانے پر وہ اُٹھاتا ہے اور کان میں دو ایک باتیں کہہ کر چوتڑ پر تھپڑ رسید کرکے اُسے پھر آگے روانہ کر دیتا ہے (الفاظ کے انتخاب کی داد دیجیے)"

"ایک چیز ہوتی ہے جسے ذہن کا کیڑا کہتے ہیں۔ کسی کے ذہن میں لیڈر بننے کا کیڑا سرسراتا ہے تو کسی کے ذہن میں فلسفی بننے کا (وارث علوی صاحب کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے)"

"ہمارے پاس وزیر آغا، جمیل جالبی، جگن ناتھ آزاد اور کرامت علی کرامت جیسے لوگوں کا دل گردہ تو ہے نہیں کہ مار واڑیوں کی طرح ہاتھ میں لوٹا لیکر نکل پڑیں اور جیب فلسفہ کی دنیا سے کاروبار کرکے وطن مالوف کو واپس لوٹیں تو فلسفہ کی ایک پوری پیڑھی کی دستاویز بغل میں دبائے ہوں"۔

"گوپال متل اور مخمور سعیدی کی جوتیاں چاٹنے والے جدیدئیے بھی اتنے ہی عیار ہیں جتنے ترقی پسند ادیب"۔

"بشیر بدر اور مخمور سعیدی جیسے لوگ بھی دنیا میں ہوتے ہیں جنہیں نقاد بننے کے لئے کسی قسم کی کوشش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ایک صبح وہ اٹھتے ہیں اور خود کو نقاد پاتے ہیں (واقعی حیرت کا مقام ہے جبکہ وارث صاحب کی نقاد بننے کی کوشش میں عمر گذر گئی اور آج تک نہیں بن سکے)"

"متین صاحب ایک معمولی صحافی ہیں، ایک چیتھڑے سے پرچے کے ذریعہ انہوں نے اس ملک کی ترقی پسند طاقتوں کے خلاف جس قسم کی مورچہ بندی کی ہے اس نے ان کے کردار کو شریف لوگوں کی نظر میں گرا دیا ہے (کاش، وارث صاحب یہاں "شریف" کی وضاحت فرما دیتے)"

بیشتر برادر کمار پاشی نازیبا حرکتیں کرکے اپنا وقار بڑھاتے نہیں کھوتے ہیں (وارث علوی صاحب کی خوش نصیبی ہے کہ انہیں وقار کا مسئلہ درپیش نہیں)"

یہ تو تھی ادیبوں اور نقادوں کے بارے میں انکی رائے۔ اب ذرا ادب اور سیاست کے بارے میں موصوف کے بیش بہا نظریات ملاحظہ فرمائیے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ہمارے نقاد تنقید میں صاف لکھتے ہیں
لیکن بات گول کیا کرتے ہیں وہ پتے چھپائے
رکھتے ہیں اور موقع محل دیکھ کر ہی چال
چلتے ہیں۔ وہ ہمیشہ سنت کی بات کرتے
ہیں۔ ذرا کامیو کی طرح دو چار قدم چلتے
تب انہیں پتہ چلتا کہ سیاست میں اخلاقی فیصلے
کرنے والے کیسے خون تھوکتے ہو جاتے ہیں
(محاورہ کی داد دیجئے) خود مارکسزم کا
گلقند لگا پان چباتے رہنا اور یک جدید
شاعروں پر دُرانی بد مذاقی ہے اور یکہ پر
تنقید کا حق بھی وہی رکھتا ہے جو دوسروں کی
خامیوں کو بے نقاب کر سکے۔"

اپنے اعلیٰ سیاسی شعور کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں۔

"دوسری بات۔ کیا صنعتی نظام نے مغرب میں جو سماجی، نفسیاتی اور اخلاقی مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان سے ہم واقف ہیں۔ کیا یہی مسائل یہاں پر پیدا نہیں ہو سکتے"

گویا اس ڈر سے کہ وہ مسائل یہاں بھی پیدا ہو جائیں گے ہمیں صنعتی نظام کو فوراً ختم کرکے جاگیرداری نظام اور اگر ممکن ہو سکے تو غلامانہ نظام واپس لے آنا چاہیئے۔۔۔

آگے چل کر وہ تحریر فرماتے ہیں۔

"پھر ذرا اس بات پر غور کیجئے کہ مغرب میں صنعتی انقلاب آیا تو وہاں کے لوگوں نے کیا کیا نہیں بھگتا، بچوں کو کیسے کانوں میں کام کرنا پڑتا تھا۔ عورتوں پر کیا نہیں بیتی۔"

بے وقوف تھے یورپ کے لوگ وارث علوی صاحب کے ملک میں آجاتے ٹھاٹ سے زمینداری کرتے اور عیش اڑاتے۔ خیر یہ تو سیاسی سوجھ بوجھ کی بات تھی اب ذرا شاعری پر چند موشگافیاں ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں۔

"ہمارے ترقی پسند دوستوں کی شاعری IRONY کے عنصر سے بڑی حد تک محروم ہے۔"

اور اس IRONY کی مثال کے طور پر انہوں نے جو مصرعے درج کئے ہیں وہ ملاحظہ فرمائیے اور سر دھنئے (اپنا نہیں وارث علوی صاحب کا) وہ لکھتے ہیں۔

"ارے خود غالب کے یہاں دیکھئے۔۔۔
ع کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں
(واہ کیا IRONY ہے)
ع مجھ کو ستم ظریف نے آکر اٹھا دیا کہ یوں
(شاید ٹھوکر مار کر IRONY ذرا سخت ہو گئی ہے)
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
سر کھجاتا ہوں جو زخم سر اچھا ہو جائے (مصرعوں کے انتخاب کی داد دیجئے)"

دیکھئے آپ نے وارث صاحب کی IRONY کے نمونے اب انگریزی کے الفاظ اردو ادب میں سمو دینے کا فن ملاحظہ فرمائیے۔

"وہ (یعنی چھوٹا بھائی) فن کی حسینہ کو ہمیشہ RAVISH

کرتا ہے (سبحان اللہ)"

"یہ اسکی VIRILITY کی نشانی ہے (کیوں نہ ہو خاندانی شفاخانہ سلامت چاہئے)"

"انکی زبان سوائے ہوا کے کوئی چیز COMMUNICATE نہیں کرتی" (یہ فزکس کا شاید نیا نظریہ ہے کہ زبان سے ہوا COMMUNICATE کی جاسکتی ہے۔)

"بڑا بھائی ہمیشہ BULLY ہوتا ہے"

"BULLY ہمیشہ اپنے GANG میں گھومتا ہے۔

"کمزور اپنی بے تکلفی سے سامنے والے کو DISARM کرنا چاہتا ہے۔ طاقتور اسے AT EASE کرنا چاہتا ہے"

"GENUINE۔ آدمی ہمیشہ REASONABLE ہوتا ہے (یہ اس صدی کی سب سے بڑی دریافت ہے) کہئے اب تو آپ وارث صاحب کی انگریزی دانی کے قائل ہو گئے۔ یہ تمام الفاظ ایسے ہیں جن کے متبادل اور مترادفات اردو زبان میں موصوف کو نہیں ملے یا پھر وہ اردو ادب میں اس طرح کے الفاظ شامل کرکے اپنا "اسٹائل" منوانا چاہتے ہیں کیونکہ بقول ان کے STYLE IS THE MAN اب ذرا کچھ ادبی جملے ملاحظہ فرمائیے۔

"بڑے بھائی صاحب آدرشوں، فلسفوں، خوابوں اور منصوبوں کی جوارشیں چاٹ چاٹ کر چوہا سی آنکھوں والی کتاب دیکھ کر حجلۂ عروسی میں داخل ہونے چلے (شکر ہے کتاب ساتھ لے کر نہیں جاتے ورنہ کو کا چنڈرٹ کی آتما کو شرمسار ہونا پڑتا)

"نہ چھینا جھپٹی ہوتی ہے، نہ نفس تیز ہوتا ہے، نہ جلی مسکتی ہے، نہ بند قبا ترڑختے ہیں نہ بدن میں چنگاریاں دوڑتی ہیں۔ نہ آنکھوں میں ستارے ٹوٹتے ہیں (زور بیان ملاحظہ فرمائیے)"

"نہایت تجریدی نہایت RAREFIED خیال کی مہین سرحدوں پر گردش کرتی ہے۔ (کیا غضب کا مشاہدہ ہے)"

"بحث کا مزہ اسوقت آتا ہے جب منہ میں کسیلا مزہ نہ چھوڑے گھونسہ باز حریف کو خون تھوکتا کر دیتا ہے۔ (ذرا خون تھوکتا کر دیتا ہے کی ترکیب کی داد دیجئے) لیکن خون تھوکنے اور ابکائی کھانے میں فرق ہے (میڈیکل سائنس کے اسٹوڈنٹ توجہ دیں)"

"تنقید اس پر کرنی چاہئے جو آپ کی تنقید کا وزن جھیل سکے (لیجئے ثابت ہوا کہ تنقید ہمیشہ فن کار پر کرنی چاہئے فن پر نہیں)"

فی الحال میں صرف ان چند اقتباسات پر اکتفا کرتا ہوں۔ چالیس صفحات پر پھیلے ہوئے اس بے مثال مضمون کے یہ چند نمونے ہیں جو مشتے نمونہ از خروارے کے طور پیش کئے گئے ہیں یا ہو سکتا ہے مجھے قارئین سے دشمنی ہو اور میں یہ نمونے دکھا کر انکو بچانا چاہتا ہوں تاکہ وہ بھی میری طرح اس پورے مضمون کو پڑھ کر اپنا وقت ضائع کریں
ان چند اقتباسات سے ہی آپ نے اندازہ لگا لیا ہو کہ وارث علوی صاحب کا زور قلم محض یہ بات ثابت

کرنا چاہتا ہے کہ اردو ادب نے صرف چار عظیم ادیب پیدا کئے
ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی، کلیم الدین احمد، حسن عسکری
اور وارث علوی صاحب۔ ان چاروں کے علاوہ احتشام حسین
(مرحوم) آل احمد سرور، وحید اختر، ڈاکٹر محمد حسین، فراق
بشیر بدر، مخمور سعیدی، کمار پاشی، کرامت علی کرامت
جمیل جالبی، وزیر آغا، گوپال متل وغیرہ سب ادیب اور
نقاد "بونے" ہیں۔

چنانچہ اب میں آپ کی خدمت میں ان چار عظیم
نقادوں میں سے ایک نقاد کی تنقید اور تبصرے کے چند
نمونے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ شمس الرحمن فاروقی صاحب
نے حسن اتفاق سے اپنے اک شمارے میں باقی کے مجموعہ
کلام "صرف معتبر" پر تبصرہ کیا ہے جس میں وہ تحریر
فرماتے ہیں۔

"یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ ظفر اقبال کے سامنے
باقی کی غزل "زاہد" معلوم ہوتی ہے۔ وہ ظاہر ہے
ظاہری مماثلت کے باوجود باقی اور ظفر اقبال مختلف
طرح کے شاعر ہیں۔ بعض بعض اشعار جہاں خیال کی
نہج ایک ہی معلوم ہوتی ہے اس فرق کو واضح کرتے ہیں
ہی نہیں کرتے۔ (مثلاً)

نظر نواز تو ہیں بحر و بر ہمارے لئے
وبال جاں ہی سہی بال و پر ہمارے لئے
(ظفر اقبال)

مجھے بچھڑنے کا غم تو رہے گا ہم سفرو
مگر سفر کا تقاضا جدا ہے میرے لئے (باقی)

ظفر اقبال پرواز کے تقاضے کا شکار نہیں، بال و
پر کے وبال جان ہونے کے باوجود وہ ارادی طور پر اپنے
پرواز کو حرکت دیتے ہیں۔ ان کے یہاں کوئی اضطراری
کیفیت نہیں جو مجبور کردے۔ باقی سفر کے تقاضے سے
مجبور ہیں اور بچھڑنے کا غم بھی انہیں مجبور کرتا ہے۔

ظفر اقبال نے یہاں بحر و بر، بال و پر، نظر نواز، وبال جاں
میں ترصیع کے علاوہ معنوی توازن بھی ہے باقی کا شعر
فارسیت ترصیع اور معنوی توازن سے عاری ہے۔

گویا شمس الرحمن فاروقی صاحب کی نظر میں اچھے
شعر میں "فارسیت" ہونا بھی ضروری ہے۔ جن اشعار
میں فارسیت نہ ہو وہ بلند پایہ شعر نہیں کہے جا سکتے۔

جہاں تک دونوں اشعار کے نفس مضمون کا تعلق
ہے ظفر اقبال کا شعر باقی کے شعر کی کیفیت اور بلندی کو
نہیں چھوتا۔ بال و پر ہمیشہ سے جدوجہد اور قوت عمل
کا نشان (SYMBOL) رہے ہیں لیکن وہ ظفر اقبال
کے لئے وبال جان ہیں اور اپنے اس وبال جان کو وہ
صرف اس لئے برداشت کر رہے ہیں کہ بحر و بر کے مناظر تو
انکے سامنے ہیں۔ گویا بال و پر کی مجبوری نے بحر و بر کے
مناظر دیکھنے کا جو موقع انکو فراہم کیا ہے انکے اطمینان
کے لئے وہی کافی ہے جبکہ باقی کے یہاں سفر جاری
رکھنے کی حمایت اور عزم ہے اور ہم سفروں سے بچھڑنے
کا دکھ بھی ہے یہاں بڑی خوبصورتی سے وہ اپنی تیز روی
کی جانب بھی اشارہ کر رہے ہیں کیونکہ انکی تیز روی کے
باعث تو انہیں اپنے ساتھیوں سے جدا ہونا پڑ رہا ہے
اور یہی تیز روی ان کے قوت عمل سے بھرپور ہونے کی
آئینہ دار بھی ہے۔ دو شعر اور ملاحظہ فرمائیے۔

کنار دشت پہ دیوار سا کھڑا ہے ابھی
بلا سے تو آب سفر کا خطر ہمارے لئے
(ظفر اقبال)

گذر سکوں گا نہ اس خواب خواب بستی سے
یہاں کی مٹی بھی زنجیر پا ہے میرے لئے
(باقی)

ان دونوں اشعار کا موازنہ کرتے ہوئے فاروقی صاحب
تحریر فرماتے ہیں۔

"بانی کے دوسرے مصرعہ میں "مٹی" کی یائے تحتانی مجروح ہے۔"

عروض دانی کے دعویدار ہونے کے باوجود فاروقی صاحب کو شاید یہ علم نہیں کہ ہندی الفاظ کے آخر سے حروف علت کا گرنا جائز سمجھا گیا ہے۔ اسی مضمون میں انہوں نے ظفر اقبال کا ایک شعر تحریر فرمایا ہے۔

کوئی برستا رہا قہر کی گھٹا بن کر
کوئی ترستا رہا عمر بھر ہمارے لئے

اس شعر کے دونوں مصرعوں میں "برستا" اور "ترستا" کے الف کہاں گئے؟۔ اگر یہاں الف گرنا جائز ہے تو مٹی کی یائے تحتانی نے کیا قصور کیا ہے؟

اسی بحث میں وہ تحریر فرماتے ہیں۔

"ظفر اقبال کا آہنگ، بلائے خواب سفر کی دوہری اضافت اور خفر خواب کی تجنیس حلوتی سے مرکب ہے۔ "خواب خواب بستی" بانی کا مخصوص استعارہ ہے، مٹی کا زنجیر پا ہونا ظفر اقبال کے یہاں نہیں مل سکتا۔ ظفر اقبال اپنی داخلی کیفیت کو نمو کے استعاروں میں ظاہر کرتے ہیں۔ بانی اسکے لئے جمود و سکوت کے استعارے دریافت کرتے ہیں۔"

سب سے پہلے تو آپ "بلائے خواب سفر" کی دوہری اضافت کی عجیب وغریب ترکیب ملاحظہ فرمائیے، یعنی سفر کے خواب کی بلا کا خطرہ دشت کے کنارے پر انکا لیتا ہے روک لیتا ہے۔ کیا اس سے بزدلی اور جمود کا اظہار نہیں ہوتا؟

اس کے مقابلے میں "خواب خواب بستی" کا حلوتی اور معنوی اعتبار سے خوبصورت استعارہ دیکھئے جو بانی کا اپنا رنگ ہے اور پھر مٹی کے زنجیر پا بننے کا اچھوتا خیال یہاں پھر بانی کا آگے بڑھتے رہنے کا جذبہ نمایاں ہے وہ اس خواب خواب بستی سے اس لئے خوفزدہ ہیں کہ یہاں کی مٹی انکے پاؤں کے لئے زنجیر بن کر ان کے رواں دواں رہنے میں رکاوٹ ڈالے گی۔

کیا فاروقی صاحب اپنے فیصلے پر نظر ثانی فرمائیں گے کہ جمود و سکوت کس کے یہاں ہے اور قوت نمو اور جذبہ عمل کس کے یہاں کارفرما ہے۔؟

ظفر اقبال کے چند اشعار میں استعمال کی گئی تراکیب کے بارے میں فاروقی صاحب تحریر فرماتے ہیں

"فلک فضا، عکس تاب، ہوس ہوا، لوح سبز، سنگ سیاہ، بلائے خواب سفر اس طرح کے مرکبات کا بانی کے یہاں پتہ نہیں"۔

ظفر اقبال کے وہ اشعار درج ذیل ہیں جن میں یہ تراکیب استعمال کی گئی ہیں۔

فلک فضا میں بسایا ہے عکس تاب کا شہر
ہوس ہوا میں بنایا ہے گھر ہمارے لئے

کاش فاروقی صاحب اس شعر کی تفسیر لکھ دیتے تاکہ اردو داں طبقہ کا بھلا ہوتا۔ فلک فضا، عکس تاب اور ہوس ہوا جیسی تراکیب سے شاید فاروقی صاحب ہی معنی نکال سکتے ہیں۔ اس شعر کو سمجھنے کے لئے اس کی نثر کی جائے تو اس طرح ہوگی عکس تاب کا شہر فلک فضا میں بسایا ہے (اور) ہمارے لئے ہوس ہوا میں گھر بنایا ہے۔

پہلا سوال تو یہ ہے کہ وہ کون ہے جس نے فلک فضا میں عکس تاب کا شہر بسایا ہے اور ہوس ہوا میں ہمارے لئے گھر بنایا ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ فلک فضا اور ہوس ہوا کونسے مقام ہیں اور عکس تاب کیا چیز ہے؟ کیا فاروقی صاحب آئندہ کسی مضمون میں ان کی وضاحت فرمائیں گے۔؟

ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے۔

پڑے ہوئے تھے خس و خاک کی طرح لیکن
اٹھا نہ سنگ سیہ سے شرر ہمارے لئے

جہاں تک "خس و خاشاک" کا تعلق ہے وہ تو سنگ سیہ کے شرر سے جل سکتے ہیں لیکن یہ پہلی بار پتہ چلا کہ سنگ سیہ کے شرر سے خس کے ساتھ خاک" بھی جل سکتی ہے۔

کیا ہلاک ہمیں دشمنوں نے رستہ میں
سجے ہوئے تھے یہاں بام و در ہمارے لئے

پہلا اعتراض —— دوسرے مصرعہ میں لفظ "یہاں" سے ثابت ہے کہ آپ اسی جگہ قتل ہوئے ہیں جہاں بام و در سجے تھے۔ پھر "رستہ میں" کیسے ہلاک ہوئے۔

دوسرا اعتراض —— جب آپ کو دشمنوں نے راستے میں ہلاک کر دیا تھا تو آپ کو کیا پتہ کہ بام و در سجے تھے یا نہیں۔

تیسرا اعتراض۔ (برائے اعتراض) ہلاک ہونے کے بعد بھی آپ افسوس کر سکتے ہیں یا اظہار حال کر سکتے ہیں کیا آپ بھوت پریت ہیں یا از قسم جنات ؟؟

ان اشعار کی تعریف میں فاروقی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

فلک فضا، عکس تاب، ہوس ہوا، خطر کو زلزلے سے استعارہ کرنا، آخری شعر میں باندھنے کی بجائے "ٹوٹا نکلنے" کا فعل استعمال کرنا۔ سنگ سیہ خس و خاک اور شرر کو متصادم کرنا یہ اس غزل کے بعض اشعار میں قوت ایجاد کے نمونے ہیں۔

اس قوت ایجاد اور قوت نمو کے بارے میں اوپر کہا جا چکا ہے اس لئے مزید بحث فضول ہے۔ آگے چل کر وہ تحریر فرماتے ہیں۔

باقی کے یہاں زبان و بیان کے عیوب موجود ہیں۔ اگرچہ وہ اتنے باریک ہیں کہ اکثر نظر انداز ہو سکتے ہیں (مثلاً "بھولوں بھرا" ہندی کا صرف و نحو ہے ہے اردو میں اس طرح نہیں بولتے۔ تیسرے شعر میں "ہمسفرو" غیر ضروری ہے یا پانچویں شعر میں زرگل مشتبہ ہے۔ چھٹے شعر میں مٹی کی یائے تحتانی دب گئی ہے۔ ساتویں شعر میں "آپ جاؤں" مخدوش ہے ؟

اس بحث سے پتہ چلا کہ فاروقی صاحب کے نقطہ نظر سے اردو کے اچھے اشعار میں ایک "فارسیت" ضروری ہے۔ دوسرے ہندی صرف و نحو کا استعمال ناجائز ہے۔ بھولوں بھرا راستہ اگر اردو لفظ نہیں ہے تو پھر اس کا متبادل اردو میں کیا ہے —؟ ظفر اقبال کے ہی دو شعر ہیں۔

آپ ہی قزاق تھے خود ہی سے تھی مار دھاڑ سو رہے کر الم سے جب تھی لڑ

گر پڑے ہوئے پتوں میں شہر ڈھونڈتا ہے
عجیب طور ہے اس جنگلوں کے باسی کا

مار دھاڑ، بستی اجاڑ، گر پڑے —
ہندی صرف و نحو کے مطابق ہیں جنکو ظفر اقبال نے اشعار میں استعمال کیا ہے۔ ان پر اعتراض کیوں نہیں باقی کا شعر ہے۔

مجھے بچھڑنے کا غم تو رہے گا ہم سفرو
مگر سفر کا تقاضہ جدا ہے میرے لئے

فاروقی صاحب کے نقطہ نظر سے اس شعر میں ہم غیر ضروری سا ہے — اگر یہاں ہم سفروں سے خطاب غیر ضروری ہے تو باقی کس سے خطاب کرتے ؟ کیا فاروقی صاحب سے ؟

آخر ان کو ہمسفروں سے ہی تو بچھڑنے کا غم۔ ہم سفرو سے خطاب ہی تو ان کی تیز روی کی جانب اشارہ کرتا ہے اگر ہم سفر ہم قدم رہتے تو افسوس کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

مٹی کی یائے تحتانی کے بارے میں عرض کر

ہوں۔ "درگذری" کے بارے میں خود فاروقی صاحب بھی مشکوک ہیں یعنی ان کو علم نہیں کہ یہ درست ہے یا غلط — بانی کا شعر ہے۔

عجیب درگذری کا شکار ہوں اب تک
کوئی کرم ہے نہ کوئی سزا ہے میرے لئے

قواعد کی رو سے "درگذری" کی ترکیب قطعی درست ہے اور یہی لفظ اس شعر کی روح ہے۔ یہ شاعر کے جمود اور سکوت سے گھبرا جانے کی دلیل ہے شاعر تو کوئی عمل چاہتا ہے۔ فعال رہنا چاہتا ہے لیکن درگذری کے رویئے نے سکوت و جمود پیدا کر دیا ہے جس سے وہ گھبرا اٹھتا ہے اور اس بے اعتنائی کا شکوہ کرتا ہے۔

بانی کے ایک اور شعر پر موصوف نے اعتراض فرمایا ہے۔

اب آپ جاؤں تو جا کر اُسے سمیٹوں میں
تمام سلسلہ بکھرا پڑا ہے میرے لئے

فاروقی صاحب فرماتے ہیں۔

"اس شعر کی قوت" اب آپ جاؤں تو جا کر اُسے سمیٹوں میں" کی منفی قطعیت میں ہے۔ یعنی متکلم بکھرے ہوئے سلسلے کو جا کر سمیٹنے کا کوئی ارادہ یا ہمت نہیں رکھتا۔"

منفی قطعیت دراصل شعر میں نہیں تبصرہ نگار کے انداز فکر میں ہے۔ شعر میں صاف ظاہر ہے کہ متکلم اس حقیقت سے آشنا ہے کہ تمام سلسلہ جو بکھرا پڑا ہے اُسے متکلم کے علاوہ کوئی نہیں سمیٹ سکتا۔ وہ سینکڑوں دعویداروں کو دیکھ چکا ہے اور کوئی اس سلسلے کو نہیں سمیٹ سکا اس لئے اب وہ خود ہی جا کر اس کو سمیٹنے اور تنظیم میں لانے کا عزم کرتا ہے۔ یہ شعر شاعر کی خود اعتمادی کا آئینہ دار ہے اس کی نظر میں سلسلہ سمیٹنے کا کام ہیچ ہے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا ہے کہ صرف وہی اس مہم کو سر کر سکتا ہے اس لئے وہ کہتا ہے۔

"اب آپ جاؤں تو جا کر اُسے سمیٹوں میں"

یعنی یہ کام دوسروں کے بس کا نہیں میں ہی جا کر اس کو انجام دوں گا۔ اس سے زیادہ مثبت قطعیت اور کیا ہو سکتی ہے۔

آخر میں فاروقی صاحب نے بانی کے چند اشعار کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

(اس طرح کے بیسیوں اشعار ہیں جن پر
جدید غزل کیا اردو غزل فخر کر سکتی ہے
ایسے ہی شعروں کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ
ہندوستان میں اس وقت بانی سے اچھی غزل
کم کہی جا رہی ہے لیکن یہ سمجھ لینا کہ بانی نے
اردو غزل کے امکانات یا اکتسابات میں
کوئی واضح توسیع کی ہے قبل از وقت ہوگا
بانی کے یہاں ابہام و اسرار ہونا بھی لازم
قرار پایا۔)

جن اشعار کی یہ تعریف کی گئی ہے وہ درج ذیل ہیں آ[illegible] ذرا دیکھیں کہ فاروقی صاحب کے بقول اردو غزل ا[illegible] جدید غزل کے یہ نمائندہ شعر فن کی کسوٹی پر کہاں تک پورے اُترتے ہیں۔

۱۔ ذرا چھوا تھا کہ بس پیڑ آ گرا مجھ پر
کہاں خبر تھی کہ اندر سے کھوکھلا ہے بہت

۲۔ قدم قدم رم پامال سے میں تنگ آ کر
ترے ہی سامنے آیا ترا شکار جو تھ[illegible]

۳۔ خیمہ گرد جو راہوں میں تنا ہے بانی
اب یہی سب کا پتہ ہے یہ نشاں ہے سب[illegible]

۴۔ پھر ایک موج تہہ آب اسکو کھینچ گئی
تماشہ ختم ہوا ڈوبنے ابھرنے ک[illegible]

۵۔ بکھر رہا ہے فضا میں یہ دودِ دود شن کیا
ادھر پہاڑ کے جلتا ہوا سا کچھ تو ہے

شعر نمبر ایک کے پہلے مصرعہ میں لفظ "بس" حشو متوسط ہے۔ دوسرے مصرعہ میں "کہاں" کی بجائے "کیسے" ہونا چاہئے تھا۔

شعر نمبر دو میں "رم پامال" کی ترکیب معنوی اعتبار سے مہمل ہے اس کے معنی فاروقی صاحب ہی سمجھ سکتے ہیں۔

شعر نمبر تین کے دوسرے مصرعہ میں "یہی" کہنے کے بعد دوسرے ٹکڑے میں "یہ" کہنا شاعر کا عجز ہے۔ دوسرے ٹکڑے میں بھی "یہی" ہونا چاہئے تھا۔

شعر نمبر چار میں "کھنچ گئی" کا ٹکڑا فصاحت کے منافی ہے "کھینچ لے گئی" کا محل تھا۔

شعر نمبر پانچ میں شاعر نے "کیا" کے معنوں میں "کیا" استعمال کیا ہے جو غلط ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فاروقی صاحب نے دانستہ بانی کے اچھے اشعار کے بخیئے ادھیڑنے کی کوشش کی ہے اور کمزور اشعار کو مثالی اشعار بنا کر پیش کیا ہے تاکہ صاحب ذوق حضرات بانی کے بارے میں غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جائیں۔

یہ ہے وارث علوی صاحب کے عظیم ترین نقاد کا ہلکا سا پوسٹ مارٹم۔ امید ہے کہ دونوں معظم حضرات میری اس جسارت کو معاف فرمائیں گے لیکن اگر وہ میرے اعتراضات کا جواب دینا چاہیں تو میں "خوش آمدید" کہونگا ــــ

شعیب شمس

قیامت

تمدن
شاخ گل کی طرح
بچکوں پہ زندہ ہے
روایات کہن بھی ہوگئیں
فرسودہ
بے معنیٰ
نئی رسمیں
مشینوں کے شکم میں جنم لیتی ہیں
مشینوں کی زبانوں پر
لہو کا ذائقہ اب تو
نئی تاریخ کو ترتیب دیتا ہے
مجھے محسوس ہوتا ہے
سوا نیزہ پہ جیسے صبح آ کے رک ہی جائے گی

★ ★

عظیم قریشی

زرتشت

عقل ازل سے باغی ٹھہری
آب و باد و خاک و آتش سب میں اسی کا نعرہ ہے
پتے کو جو پھول سمجھ لو
پھول ہی بنتا جائے گا
اسے جو چاند سمجھ لو

چاند میں ڈھلتا جائے گا
آگ سے کھیلا ہے وہ طوفان جس میں عقل کا افسوں تھا
عقل ازل سے باغی ٹھہری
آب و باد و خاک و آتش سب میں اسی کا نعرہ ہے

★

نجیب رامش

غزل

کس کس کے گلشن مہکائے، صحرا میں رشتہ ہی رہا
اے میرے دل! تو ہر دور میں تنہا تھا، تنہا ہی رہا
وہ جو اپنی نسل کا شجرہ جوڑ رہا تھا فرشتوں سے
اسکے ننگے ہو جانے پر میں اس پر ہنستا ہی رہا
ان پانچوں کے زخم سے پھوٹا نور کا جو فوارہ تھا
اپنے کالے جسموں پر وہ اک اجلا دھبہ ہی رہا
لوگوں نے اپنے پتھر سے اس پر کتنے وار کئے
لیکن وہ شاید ہیرا تھا جیسا تھا ویسا ہی رہا
خود سے بدلہ لینا سیکھو، جہد کے میدان میں اترو
اپنی ناکامی کے دکھ پر جو رویا، روتا ہی رہا
ضبط کی عادت، خوب مگر معصوم اہل ضبط بھی دیکھ
موجوں کی چوٹیں کھا کر ساحل پیچھے ہٹتا ہی رہا

★ ★ ★

قریشی

غزلیں

لفظ کو منزلِ معنی سے گذر جانے دو
سوختہ ذہنوں میں کچھ نور سا بھر جانے دو

خستگیِ دیوار، در و بام کی صورت بگڑی
اب یہ سیلاب کسی اور کے گھر جانے دو

راکھ بنکر ہی بکھرنا جو مقدر ٹھہرا
مجھ کو بھی تیرہ خلاؤں میں بکھر جانے دو

کربِ احساس کا اندازہ نہیں ہے تم کو
کبھی سینے میں یہ خنجر بھی اتر جانے دو

یاس کا تیر چلا اب رات کے ترکش میں بچا
آخری وار ہے یہ وار بھی کر جانے دو

خودکشی جرم سہی، خود پہ یہ الزام نہ لو
اس کا الزام بھی حالات کے سر جانے دو

خشک پتوں کے کھڑکنے کی صدائیں جاگیں
نصرتؔ ہوگا کوئی سرگرم سفر، جانے دو

لہو لہو یہ اچھلتا ہے رنگ کی صورت
سروں پہ برسے ہے اک تیز سنگ کی صورت

الجھ کے ٹوٹ گئی ڈور پھر بھی دستِ غیب
اڑائے جائے ہے مجھ کو پتنگ کی صورت

ہر ایک برسرِ پیکار اپنے آپ سے ہے
دکھائی دیتی ہے ہر سمت جنگ کی صورت

شکست و ریخت کے منظر بکھر گئے ہر سو،
امیرِ شہر ہے بے نام و ننگ کی صورت

سراپا درد بنے اپنے شہر میں اب ہم
کھڑے ہوئے ہیں اسیرانِ جنگ کی صورت

بکھر گیا ہے خیالوں کا دلنشیں پیکر
ابھاریں دل میں کہاں سے امنگ کی صورت

کھڑے ہو نصرتؔ سرِ راہ دیر سے، بلا لو
کوئی نظر تو پڑی ہوگی ڈھنگ کی صورت

٭ ٭

مرتب:۔ کرامت علی کرامت

امجد نجمی کے خطوط

عبداللطیف عارف کے نام

۸ رفروری ۱۹۶۵ء

عزیز مکرم!

خوش رہئے۔ مہینے بھر کی مسلسل علالت نے گو میرے وجود بے بود کے رس جس، کس بل، آب وتاب اور رنگ و روغن تمام پر پانی پھیر دیا ہے۔ لیکن قلم ہے کہ ہاتھ میں آنے کے لئے بیقرار ہے۔ کاغذ نقش فریادی بنکر پکار رہا ہے کہ میری سادہ اوراق کو اپنے قلم کی شوخی و رنگینی سے بھر دیجئے۔ اور میں حیران ہوں کہ لکھوں تو کیا لکھوں؟ اپنے غمنامے کا آغاز کروں تو کس طرح کروں۔ سہ

غم نامہ اپنا صفحۂ محشر سے کم نہیں
ہے شورِ النیاث صریر قلم نہیں

بہرحال ایک طویل بیماری کے بعد ذرا ہنس بول لیں تو کیا مضائقہ ہے؟ کیونکہ ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ خوش طبعی اور ہنسنا ہنسانا صحت انسانی کے لئے بڑی مفید چیز ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ اکثر لوگ طبعاً بڑے ظریف ہوتے ہیں اور بعض بالکل خشک مزاج۔ خواص تو خواص، عوام میں بھی بذلہ سنجی اور خوش طبعی پائی جاتی ہے۔ ناخواندہ ہونے کی وجہ سے عوام کی طرز گفتگو سوقیانہ قسم کی ہوتی ہے۔ اور خواص کی نہایت سنجیدہ، شگفتہ اور موثر، دونوں اگرچہ بات ایک ہی کہیں گے۔ لیکن ان کی نوعیتوں میں بڑا فرق ہے۔ شگفتہ مزاجی انسان کے لئے ضروری ہے بخصوصاً ایک ادیب، شاعر، مصنف اور مقرر کے لئے تو یہ لابدی ہے۔

عربی میں مثل ہے "المزاح فی الکلام کالملح فی الطعام" باتوں میں مزاح ایسا ہے۔ جیسے کھانے میں نمک۔ اب دو ایک چٹکلے سنئے۔

حیاتِ جاوید میں حالی لکھتے ہیں کہ سرسید جیسے بڑھاپے میں بذلہ سنج تھے، جوانی میں اس سے بھی زیادہ ظرافت اور حاضر جوابی ان کی طبیعت میں تھی۔ دلی میں ایک مشہور طوائف شیرین جان نامی نہایت حسین تھی۔ مگر اس کی ماں بھدی اور سانولے رنگ کی تھی۔ ایک مجلس میں جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ مجرے کے لئے آئی تھی۔ سرسید بھی موجود تھے اور دو ہی ان کے ایک قدر دان دوست بھی بیٹھے تھے۔ وہ ان کی ماں کو دیکھ کر بولے۔"

"مادر مش بسیار تلخ است"

سرسید نے فوراً یہ مصرعہ پڑھا۔ ؎

گرچہ تلخ است ولیکن بر شیریں دارد۔

ایک دفعہ کسی اور طوائف نے سنا کہ آپ کالج [illegible] بنوا رہے ہیں۔ جس کے لئے یوں گھر گھر بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ طوائف امیر تھی اپنے کسی دوست کے آگے ظاہر کیا کہ میں بھی اس چندے میں کچھ دینا چاہتی ہوں۔ اگر سید صاحب منظور کریں۔ یہ خبر سرسید تک بھی پہنچ گئی۔ انہوں نے کہا کیا حرج ہے۔ دوا نکیں۔ آپ فوراً اس کے مکان پر ضمیر باقبل الذکر کی طرح جادھمکے، اور اس سے وہ رقم بڑی خوش دلی اور شکریہ کے ساتھ لے لی۔ ان کے احباب نے اس رقم کے حلال ہونے پر اعتراض کیا تو سرسید صاحب نے جواب دیا کہ [illegible]

یہ بھی غنیمت ہے۔ کالج کا پاخانہ ہی بن جائے گا۔

دیکھا جواب من آپ نے؟ کس قدر سچا جذبہ، کتنا ولولہ انگیز خیال اور کیا پختہ دیوانگی تھی!

حیاتی گیلانی نے سچ کہا ہے۔ ؎

ترا ہرگز گریبانے نہ شد چاک
چہ دانی لذتِ دیوانگی را؟

ہاں آپ نے کل شب کو مشاعرے میں جو غزل پڑھی تھی۔ اس کے ایک شعر میں "زلف عنبر" لکھ گئے۔ یعنی چہ؟

(نجمی)

۱۶ر فروری ۱۹۶۵ء

مولانا صاحب

سلام مسنون و شوق افزوں۔

خاقانیٔ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق کا شہرۂ آفاق مقطع ہے۔ ؎

اے ذوق دیکھ دخترِ رز کو نہ منہ لگا۔
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

منہ سے چھوٹے یا نہ چھوٹے۔ لیکن واقعہ ہے کہ یہ کافرہ یہ بنت عنب، یہ انگور کی بیٹی یہ آتش سیال، یہ آپ بزرگوں پر رام زندگی پر چلو میں الو بنانے والی اور یہ شیشہ کی پتلی سرزمین عرب سے نکل کر ایران تو ایران کے سینے میں دندناتی ہوئی ہندوستان کے گرد و نواح میں در آنکلی کہ ہمارے شعر و ادب کے ریشے ریشے میں کچھ اس طرح سرایت کر گئی ہے کہ الامان والحفیظ! عرب و عجم کے جس شاعر کا دیوان اٹھائیے جس کلیات پر نظر ڈالئے اس کے ذکر سے خالی نہیں تا آنکہ بڑے بڑے صوفی شعراء بھی اس کے ذکر خیر سے اپنا پیچھا چھڑا نہ سکے۔ خیام و حافظ کے متعدد اشعار اس کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ خواجہ صاحبؒ کے رندانہ اور مستانہ اشعار کو دیکھ کر ہی یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان کا فلسفۂ زندگی بھی وہی ہے جو یونانی فلاسفر ابیکورس (EPICURUS) کا نظریۂ اخلاق ہے۔ یعنی

(PLEASURE IS THE CHIEF GOOD)

عیش و عشرت ہی انسانی زندگی کا مقصود عین ہے ؎

حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معمارا!

آپ کو معلوم ہوگا کہ اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے دور حکومت میں دیوانِ حافظ کا پڑھنا پڑھانا عوام کے لئے ممنوع قرار دیدیا تھا۔ صرف اس خیال سے کہ لوگ اس کو پڑھ کر بہک نہ جائیں۔ اس نقطۂ نظر سے اقبال نے اپنی مشہور مثنوی "اسرارِ خودی" میں حافظ پر بڑے کڑے الفاظ میں حملہ کیا تھا اور ان کا یہ اعتراض خالص ادبی نقطۂ نظر سے تھا۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

ہوشیار از حافظ صہبا گسار
جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار
نیست غیر از بادہ در بازار او
از دو جام آشفتہ شد دستار او
رفت و شغلِ ساغر و ساقی گذاشت
بزمِ رندان نشہ باقی گذاشت

غرض کلام مولانا اشعار سے بڑے سخت۔ لیکن جب سارا ملک ان کے خلاف ہوگیا۔ تو انھوں نے معذرت کے ساتھ وہ اشعار مثنوی سے قلمزد کر دیئے۔

چونکہ اردو شاعری۔ فارسی کی عین کاربن کاپی ہے۔ خصوصاً صنفِ غزل اس لئے۔ اس میں بھی خمریات کا ایک خاصہ ذخیرہ پایا جاتا ہے۔ کسی اردو شاعر کا کلام اس کی آلودگی سے خالی نہیں۔ خصوصاً ریاض احمد ریاضؔ خیرآبادی تو خمریات اور شرابیات کے امام کہلاتے ہیں۔ نقادوں نے حساب لگایا ہے کہ ان کے ہاں ایک ہزار تین سو چھپن اشعار صرف شراب اور ذکر شراب پر پائے جاتے ہیں۔ یہ انھیں کا شعر ہے۔ ؎

کمبخت نے شراب کا ذکر اس قدر کیا
واعظ کے منہ سے آنے لگی بو شراب کی!

مجھے یاد ہے آپ نے بھی کسی وقت کہا تھا۔ گھبرا کے پی گیا، ہچکچا کے پی گیا۔ اٹھا کے پی گیا۔ ہرا کے پی گیا، جھکا کے پی گیا، سلجھا کے پی گیا۔

بلا کے پی گیا، اٹھلا کے پی گیا، دکھلا کے پی گیا، پہونچا کے پی گیا، سا کے پی گیا، عزا کے پی گیا، شرما کے پی گیا، [illegible] کے پی گیا، [illegible] کے پی گیا، بہلا کے پی گیا، برسا کے پی گیا، بہلا کے پی گیا، جھنجھلا کے پی گیا وغیرہ، غرض کسی اردو مصدر کو آپ کی "پیٹے تو شحا" کے تیر نے نہیں چھوڑا۔ ؏

"ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں"

اسی سلسلے میں ایک تاریخی لطیفہ بھی ملاحظہ ہو۔

ملا شیدا نے جو صاحب قران شاہ جہاں بادشاہ کا درباری شاعر تھا، ایک قصیدہ کہا جس کا مطلع یہ تھا۔ ؎

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے
حسن راہ بر دردگارے عشق را پیغمبرے!

تو تمام اہل سخن نے پسند کیا اور خاص و عام میں مشہور ہو گیا۔ ارباب نشاط نے ترانوں میں گایا۔ شاہ جہاں نے بھی سنا مگر بجانے کیا خیال آیا کر سنکر بہت خفا ہوا۔ گویا ؏

"نازک مزاج شاہاں تاب سخن ندارد"

اور کہا کہ شراب ام الخبائث جس کی حرمت قطعی قرآن سے ثابت ہے۔ اور مخالفت اور مذمت شریعت سے، اس نے (شاعر نے) اسے یہاں تک پہنچا دیا! کہ دو کہ ہماری قلمرو کی حدود سے نکل جائے۔ یہاں شیدا چین بول گئے۔ مقربان دربار کی سفارش سے انکی خطا معاف ہوئی۔ شیدا نے ایک معذرتی قطعہ لکھا جس میں جامی کے ایک شعر کا حوالہ دیکر اپنی خطا معاف کروالی۔ اور بادشاہ کو پھر اپنے حال پر مہربان کیا۔

مولانا جامی کا شعر یہ ہے ؎

از مراحی دو بار قلقل ے
نزد جامی بہ از چہار قل است (یعنی چہار قل)

غرض اس سمع خراشی سے میری مراد یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہم کو شراب و کباب کے مضامین سے شعر و ادب میں احتیاط بلکہ احتراز چاہیے۔

[illegible] ۔ میں غالب کا یہ شعر پیش کر سکتے ہیں ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اور کہہ سکتے ہیں کہ آپ معرفت کو شراب، ارباب ذوق کو ساقی اور وجد کو مستی وغیرہ الفاظ سے تعبیر یا کنایہ کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں بجا ارشاد ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ کھلے بندوں رندی اور سرمستی ہے۔ غلو سے ہم کو دامن بچانا چاہیے۔

اہل یورپ جن کی گھٹی میں شراب پڑی ہے اور موجِ بادہ جنکے لئے عین الحیات ہے۔ کبھی تو اپنے شعر و ادب میں اس کا ذکر اس قدر شد و مد سے نہیں کرتے۔ جیسا کہ ہم ایشیائی شاعری کا دم بھرتے ہیں۔ کیا یہ امر غور طلب نہیں! کیا یہ خیال اصلاح طلب نہیں؟ ہم کو اپنے شعر و ادب میں سب سے پہلے اخلاقی قدروں کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ نیز واعظ، شیخ اور زاہد سے بھی زیادہ الجھنا نہیں چاہیے۔ گو یا کسی حد تک صحیح ہے۔ (APOETIS STRUGGLING WITH PREACH?) یعنی شاعر کبھی کبھی خطیب سے دست و گریبان ہو جاتا ہے، لیکن اتنا بھی نہیں کہ

"گریبانم دریدہ ز نخدانش شکستم"

یحییٰ

۲۳ فروری ۶۵ء

عارف مشہور و معروف۔

سلام علیکم۔ کیف مزاجکم؟

۱۹۰۰ء کا ذکر ہے کہ شہر لاہور میں انجمن حمایت اسلام کا عظیم الشان سالانہ جلسہ منعقد ہے۔ پنڈال حاضرین با تمکین کی کثرت سے ممنون منہ بھرا ہے۔ پنجاب کے بڑے بڑے شہروں سے لوگ آ منڈ آئے۔ ڈاکٹر نذیر احمد ایل ایل ڈی کرسی صدارت پر رونق افروز ہیں۔ مندوبین میں دیگر مشاہیر ملک کے ساتھ سعدیٔ ہندوستان مولانا الطاف حسین حالی۔ اور جناب شیخ محمد اقبال بھی تشریف فرما ہیں۔ ہر طرف چہل پہل تیزی اور پھرتی ہے۔ دھواں دھار تقریریں ہو رہی ہیں۔ سامعین ہمہ تن گوش بنکر کو سن رہے ہیں۔ معزز مقرر کے بعد دیگرے [illegible]

کا کرشمہ دکھا کر عرب کے بلغا اور فصحا کو شرما رہے ہیں۔ دریں اثنا اچانک ایک پندرہ سالہ لڑکا صدرِ جلسہ سے تقریر کرنے کی اجازت حاصل کر کے پلیٹ فارم پر آتا ہے۔ اس کا موضوع سخن ہے۔ "مذہب کی ضرورت"۔ گویہ نوجوان ڈاکٹر نذیر احمد کی انشا پردازی اور مولانا حالی کی شاعری کے غلغلہ سے آگاہ ہے۔ اور جانتا ہے کہ ان حضرات کے سامنے لب کشائی امر محال میں سے ہے۔ لیکن ان کا رعب اس پر ذرہ بھر بھی اثر انداز نہیں ہو رہا ہے۔ لوگ خندۂ زیر لب فرما رہے ہیں کہ یہ برخوردار جس کے گالوں، چہرے پر ابھی خط سبز بھی نمودار نہیں ہوا ہے۔ کیا تقریر کریگا؟ لیکن تقریر شروع ہوتی ہے۔ پہلے آہستہ پھر کسی قدر تیز پھر تیز سے تیز تر پھر اسی قدر رواں، دواں، جیسے تلاطم خیز سمندر کی موجیں ہوتی ہیں کہ فوراً آدمی کو آ لیتی ہیں اور بے دست و پا کر کے جدھر چاہتی ہیں۔ لے جاتی ہیں۔ جوش و خروش، ولولہ امنگ، زور و شور!

تقریر کیا تھی خیالات کا سیلاب، الفاظ کے موتیوں کو سمیٹ کر امنڈا چلا آ رہا تھا۔ یا جوالا مکھی کے دہانے سے لاوا ابل رہا تھا۔ حاضرین مبہوت، صدر دم بخود، اقبال حیران، حالی ششدر! تقریر ختم ہوتی ہے تحسین و آفرین کے پھول پنڈال پر برستے ہیں۔ حالی سے ضبط نہ ہو سکا۔ انھوں نے علانیہ کہدیا کہ انھیں یقین نہیں آتا کہ خطبہ اسی صاحبزادے کا ہے۔ چنانچہ انھوں نے امتحاناً خود ایک موضوع تجویز فرمایا اور جب یہ نوجوان اس موضوع پر بلا جھجک کامیابی کے ساتھ تقریر کر چکا تو چار و ناچار انھیں ماننا پڑا۔ لیکن ان کا استعجاب دور نہ ہوا۔ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کچھ آیا خیال شریف میں آپ کے۔ یہ صاحبزادہ کون تھا؟ یہ تھے۔ ابوالکلام احمد جو بعد میں مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے بین الاقوامی بلکہ عالمگیر شہرت کے مالک بنتے ہیں اور جو سیاسیات اور مذہبیات کے علاوہ اعلیٰ درجے کے لٹریچر کے مالک ہیں اور اردو زبان کے ایک ایسے اسکول کے بانی ہیں جس نے برصغیر ہندوستان میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ ہزاروں پر شکوہ الفاظ، سیکڑوں دلکش تراکیب، بیسیوں دلآویز استعارات اور درجنوں خوبصورت تشبیہات کا ایک کافی ذخیرہ جن کی تقریر، وب اور تحریروں میں پایا جاتا ہے۔ میرؔ نے کیا سچی بات کہی ہے۔ ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں!

زبان اردو کے دورِ اوّل سے قطع نظر، دور ثانی میں مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی، اور علامہ نیاز فتحپوری۔ تین شخصیتیں ایسی ہیں۔ جنھوں نے خود ایک طرز ایجاد کیا اور اس کے خاتم بھی ہوئے۔ ان کی طرز تحریر اور اسلوب بیان کسی کے بس کا روگ نہیں۔ بہتوں نے ہاتھ پاؤں مارے مگر تھک ہار کے بیٹھ گئے۔ ؎

عشق نادر نہ او باشد عاشقِ دیوانہ را
نیست تعلیم از کسے در سوختن پروانہ را

نجمیؔ۔

۔ مارچ ۶۵ء۔

جناب من

تسلیم۔ دو ہفتے ہوئے دونوں طرف سے سکوت ہے۔ آپ اپنے میں مصروف اور میں بزم کے سالانہ جلسے کے لئے سرگرداں۔ بہرحال آج اس مہر سکوت کو توڑتا ہوں اور خاندان مغلیہ کی دو چار بیگمات کا ذکر اختصاراً سپردِ قلم کرتا ہوں۔ آپ بھی بے شک ان کے ذوقِ شعری اور ادبی کارناموں سے واقف ہوں گے۔

گلبدن بانو بیگم:۔ یہ بابر کی بیٹی، ہمایوں کی ہمشیرہ اور شہنشاہ اکبر کی پھوپھی تھیں۔ ہمایوں نامہ اس کی تصنیف ہے۔ جس میں اس نے بابر ہمایوں کے حالات بڑے لطیف پیرائے میں لکھے ہیں۔ اس کی زبان بڑی نتھری ستھری ہے۔

سلیمہ سلطان بیگم:۔ یہ ہمایوں کی پھوپھی زاد بہن ہے۔ بڑی عالی فہم خوش تقریر اور لطیفہ گو تھی۔ اکثر شاہوں اور شہزادوں میں جو الجھا کرتے تھے سلجھایا کرتی تھی۔ یہ شعر اس کا بہت مشہور ہے:

کاکلت را من ز مستی رشتۂ جاں گفتہ ام
مست بودم زیں سبب حرفِ پریشاں گفتہ ام

اس پر "حرفِ پریشاں" کے عنوان سے میں نے چند اشعار تضمین کئے ہیں جو "طلوعِ سحر" میں آپ دیکھیں گے۔

مہرالنساء بیگم۔ یا نورجہاں برجستہ گوئی اور شعر فہمی کے علاوہ غضب کی ناقدانہ نظر بھی رکھتی تھیں۔ ابوطالب کلیم جو ملک الشعرا شاہ جہانی تھا، اس کی نکتہ چینیوں سے بڑا گھبراتا تھا۔ ایک دفعہ کلیم نے یہ شعر کہا۔ ؎

ز شرم آب شدم کاب را شکستے نیست
بحیرتم کہ مرا روزگار چوں بشکست؟

یعنی میں شرم سے پانی ہو گیا۔ تعجب ہے کہ زمانہ مجھے کیونکر توڑ سکا؟ کیونکہ پانی توڑنے کی چیز نہیں۔ نورجہاں نے فوراً ٹوکا "یخ بست وپس شکست" یعنی پانی کو پہلے برف بنا دیا پھر توڑا۔

جہانگیر رمضان بھر پیتا نہ تھا۔ غرہ شوال کو دیکھ کر ایک سال خوشی کے مارے بول اٹھا۔ مصرعہ

"ہلالِ عید بر اوجِ فلک ہویدا شد"

نورجہاں نے فی البدیہہ کہا۔ مصرعہ

"کلیدِ میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد"

ارجمند بانو بیگم۔ عرف ممتاز محل۔ شاہ جہاں کی رفیقۂ حیات زیورِ علم و فضل سے آراستہ تھی۔ شعر و سخن میں بھی خاصہ دخل رکھتی تھی۔ ایک دفعہ شاہجہاں جمنا کے کنارے بیٹھا محو نظارۂ قدرت تھا۔ ارجمند بھی ساتھ تھی۔ دریا کی موجوں کی طرف اشارہ کر کے ممتاز بیگم سے کہا ؎

آب از برائے دیدنت می آید از فرسنگہا

ممتاز نے فی الفور کہا۔ ؎

از ہیبت شاہجہاں سر می زند بر سنگہا

زیب النساء بیگم۔ یہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کی دختر بلند اختر تھی۔ ملا سعید اشرف اس کے استاد تھے۔ زیب التفاسیر اسی کے عہد کی تصنیف ہے۔ صاحب دیوان گذری ہے۔ مخفی تخلص کرتی تھی۔ یہ شعر اسی کا ہے ؎

بیروں ہمہ سر سبز و درونش ہمہ پر خون
از حالتِ من برگِ حنا را کہ خبر کرد؟

جہاں آرا بیگم۔ عرف بیگم صاحبہ۔ شاہجہاں کی بڑی صاحبزادی بڑی عالمہ فاضلہ اور صاحب سلیقہ تھی۔ مونس الارواح اسی کی تصنیف ہے۔ قید میں برابر اپنے بوڑھے باپ کی خدمت گزاری اور دلدہی میں مصروف رہتی تھی۔ ایک دن گلگشتِ چمن کو نکلی باغ کے چاروں طرف پردہ کرا دیا گیا۔ حیدی طہرانی شاعر بالا خانے سے چھپ کر تماشا دیکھنے لگا۔ شہزادی کی سواری جب سامنے سے گزری تو بے ساختہ یہ مطلع پڑھا ؎

برقع بہ رخ افگندہ برد ناز بباغش
تا نکہتِ گل بیختہ آید بہ دماغش

یعنی برقع منہ پر ڈالے وہ اس لئے باغ میں جاتی ہے کہ پھول کی خوشبو چھن کر دماغ میں آئے۔

شہزادی نے حکم دیا کہ شاعر کو سامنے لایا جائے۔ حیدی سامنے آیا تو یہ شعر بار بار اس نے پڑھوایا۔ پھر حکم دیا کہ پانچ ہزار روپیہ انعام دے کر اس کو شہر سے نکال دو!

دیکھا آپ نے مہربانی کے ساتھ قہر بانی اسی کو کہتے ہیں۔ لطف کے ساتھ ستم یہی ہے۔ مصرعہ

"تمھا لطف کرنا بھی مرے حق میں ستم نکلا!"

اس کا مقبرہ حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار کے پاس ہے۔ جس پر یہ عبارت کندہ ہے:۔

ھو الحی القیوم

بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا
کہ قبر پوشِ غریباں ہمیں گیاہ بس ست

اللہ بس باقی ہوس

تنجی

۵ / اپریل ۱۹۶۵ء

عارف صاحب

السلام علیکم۔ "بانگِ درا" کے بعد ڈاکٹر اقبال کی یادیں

اردو تصنیف "بالِ جبریل" ہے۔ جو ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ اردو میں پہلی کتاب ہے جس میں اقبال نے اپنے فلسفۂ خودی کی وضاحت کی ہے۔ اور جو تغزل کے لحاظ سے اردو شاعری میں بہت بلند پایہ تخلیق ہے۔ اس کا ترجمہ ماربرگ یونیورسٹی کی ایک خاتون پروفیسر نے جرمن زبان میں ۱۹۵۹ء میں کیا ہے۔ بہرحال جب یہ کتاب ۱۹۳۵ء میں منظرِ عام پر آئی تو سب سے پہلے علامہ سیماب اکبرآبادی نے اس کے چند اشعار پر اعتراضات کئے تھے۔ جن اشعار میں انھوں نے خامیاں بتلائی تھیں وہ حسبِ ذیل ہیں۔

شعر ۱
ضمیرِ لالہ مئے لعل سے ہوا لبریز!
اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز

شعر ۲
مدت سے ہے آوارۂ افلاک مرا فکر
کر دے اسے تو چاند کے غاروں میں نظربند

شعر ۳
مِرا سبو چہ غنیمت ہے اس زمانے میں
کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

شعر ۴
اے روزِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر!
مجھے معلوم کیا وہ رازداں تیرا ہے یا میرا!

شعر ۵
روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر!

شعر نمبر (۱) پر اعتراض تھا کہ "پرہیز" مذکر ہے۔ شاعر نے خلافِ جمہور اس کو مونث باندھا ہے۔

شعر نمبر (۲) پر اعتراض کیا گیا کہ "فکر" مونث ہے۔ اقبال نے اسے مذکر لکھا ہے۔

شعر نمبر (۳) میں لفظ "کدو" کو عامی اور بازاری لفظ کہا گیا۔

شعر نمبر (۴) پر یہ اعتراض کیا گیا کہ ضمیر "اسے" لکھ کر اور اسم "شیطان" کا ذکر کسی شعر یا قبل میں نہ کرنا ایک فاحش غلطی ہے۔ جو مبتدی بھی نہیں کر سکتا۔

شعر نمبر (۵) پر یہ نکتہ چینی کی گئی کہ اس میں عبودیت کا مقام توڑ کر اتحاد ہے۔

غرض آپ نے دیکھ لیا کہ یہ اعتراضات کچھ ایسے وزنی نہیں ہیں۔ اقبال کے شعر نمبر ۲ پر معترض صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ "چاند کے غار" سے شاعر کی کیا مراد ہے؟۔ یہ خیال تو بڑی بوڑھیوں کی کہانی سے جو وہ بچوں کو بہلانے کے لئے کہتی ہیں زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اس کا جواب جناب جعفر علی صاحب اثر لکھنوی نے دیا تھا۔ جو سائنٹفک انکشافات پر مشتمل ہے۔ انھیں کے الفاظ کو بعینہ میں یہاں دہراتا ہوں۔ تاکہ آپ بھی لطف اندوز ہوں۔ انھوں نے بتلایا کہ:۔

"۱۸۶۲ء کے لگ بھگ ایک جرمن سائنس داں زیگلر (ZEIGLER) نے دریافت کیا کہ چاند کی سطح براہِ راست روشن نہیں ہے بلکہ اس میں غار ہیں اور ان غاروں سے روشنی نکلتی پھیلتی اور پوری سطح کو منور کرتی ہے۔ انگریزی میں ان غاروں کو (FISSURES OF LIGHT) کہتے ہیں۔ جس کا لفظی ترجمہ نور کے غار ہوا۔ اب اس حقیقت کی روشنی میں اقبال کا مذکورہ بالا شعر پڑھئے۔ شاعر کہتا ہے مری فکر جو مدت سے آوارہ پھر رہی ہے تو اسے چاند کے غاروں میں بند کر دے تاکہ یہ وہاں سے ایک لمعۂ نور بن کر نکل آئے۔ اور تاریکیٔ شب (لوگوں کی جہالت) دور کر دے۔"

دیکھا آپ نے!۔ سچ کہا ہے گرامی نے ؎

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت!

یہ ہماری آنکھوں دیکھی بات ہے کہ ۱۹۵۹ء میں سویت روس نے اپنا "مون راکٹ" لونک خلا میں بھیجا تھا جو بہت اونچا اڑا تھا۔ اور سیاروں کے قلابے ملائے تھے۔ اس نے چاند کی سرزمین کا ایک فوٹو بھی لیا تھا۔ جو اخباروں میں چھپ چکا ہے۔۔۔۔

. . . . یہ نقشہ میری نظر سے بھی گزرا ہے۔ اس میں کئی دریا اور کئی خاک کے تودے بتلائے گئے تھے۔ ایک دریا کا نام مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ SEA OF TRANQUILLITY) تھا۔ میں نے اپنی نظم "مون راکٹ" میں اس کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا۔

چاند کے "بحرِ سکوں" میں ہے تلاطم پیدا
چاند سے جا کے اب انسان نے ٹکر لی ہے۔

بہر حال اس نقشے میں جو خاک کے تودے بتلائے گئے تھے، ممکن ہے یہی روشنی کے پربت یا پہاڑیاں ہوں جن کو اقبالؔ نے چاند کے غاروں سے تعبیر کیا ہے۔

چو لشنوی سخنِ اہلِ دل مگو کہ خطاست
سخن شناس نئی دلبرا خطا ایں جاست

تجمی

۱۲ اپریل ۶۵ء

مولوی صاحب!

خلوص بے پایاں۔ اس خط کو میرے گزشتہ مکتوب کا ضمیمہ تصور فرمائیے۔ کیونکہ روسی مون راکٹ کے ساتھ خلا بازی کی دھن میں جو باتیں مجھے کہنی تھیں وہ یکلخت بھول گیا۔ اور زمین کو چھوڑ آسمان کی کہہ گیا۔

بہر کیف کہنا میں یہ چاہتا تھا کہ اگر اقبالؔ سے کچھ سانی فروگذاشتیں ہو گئی ہیں یا انھوں نے چند الفاظ کو خلافِ جمہور مذکر یا مونث استعمال کیا ہے تو یہ کوئی ایسی قابلِ گرفت بات یا واجب التعزیر جرم نہیں ہے۔ اگلے اساتذہ نے بھی ایسا کیا ہے۔ اقبالؔ بھی اپنے وقت کے استاد تھے۔ لہٰذا وہ ایسا کرنے میں مجاز تھے۔ علاوہ ازیں یہ تذکیر و تانیث کا اختلاف تو ایسا ہے جیسے "آمین بالجہر" اور "آمین بالسر" کا جھگڑا۔ اسکو کسی طرح "آمین بالشر" بنانا مناسب نہیں۔ ملاحظہ ہو یہ شعر

نہ فقر کے لیے موزوں نہ سلطنت کے لیے
وہ قوم جس نے گنوایا متاعِ تیموری!

دیکھئے یہاں "متاع" کو اقبالؔ نے مذکر استعمال کیا ہے۔ حالانکہ یہ لفظ جمہور کے نزدیک مونث ہے۔ البتہ "مال متاع" مذکر ہے۔ اسی طرح اس شعر میں

میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ یہ بھی ہے حرام اے ساقی

"مینا" کو انھوں نے مونث باندھا ہے۔ اس لفظ پر جب ان کے ایک دوست نے انھیں ٹوکا تو اقبالؔ نے حضرت جلال لکھنوی کی "مفید الشعرا" منگا کر دیکھی۔ اور تسلیم کر لیا کہ ایسی لغزشیں ان سے کبھی کبھی ہو جایا کرتی ہیں۔

غرض اقبالؔ نے میر تقی میرؔ کی طرح کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ؏

مستند ہے میرا فرمایا ہوا!

اسی طرح اقبالؔ کے اس شعر پر

دلیلِ صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا، گیا دورِ گراں خوابی

ایک لکھنوی صاحب نے اعتراض کیا کہ یہ "صبح روشن" کیا ہے۔؟ اقبالؔ نے جواب دیا کہ حضرت جب صبح کاذب ہو سکتی ہے تو یہ "صبح روشن" ہے۔ اس کے ہونے پر اعتراض کیوں؟"

ایک معترض کہتے ہیں کہ "ان کی "بانگِ درا" میں جو لغزشیں ہیں وہ زیادہ تر محاورہ کی ہیں۔ تمثیلاً دو بیان کی جاتی ہیں

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت ترے سر
(نظم ہمالہ)

کسی کے سر باندھنا نہیں کہتا بلکہ سر پہ باندھنا محاورہ ہے۔ خالی سر باندھنا یا سر منڈھنا بھی بولتے ہیں۔ مگر اس کے دوسرے معنی ہیں مثلاً کہتے ہیں جب کوئی نہ ملا تو فلاں چیز تم نے میرے سر باندھی یا منڈھی۔ یعنی زبردستی دی۔ ؎

پروانہ تجھ سے کرتا ہے اے شمع پیار کیوں؟

کسی کو پیار کرنا بولتے ہیں۔ کسی سے پیار کرنا محاورہ نہیں ہے۔ البتہ پیار اور اخلاص ساتھ ... تو پوچھا گیا کہ ... ان سے آ گیا

بیار اور اخلاص بڑھا ہوا ہے۔ اس لئے ایسے موقع پر جہاں خالی بیار کا لفظ ہے۔ تجھے ہونا چاہیئے ۔" وغیرہ وغیرہ۔

تعجب تو یہ ہے کہ اقبال کی غزل بلکہ نظم کو بھی اہل لکھنؤ تسلیم نہیں کرتے۔ ایک دفعہ اقبالؔ لکھنؤ گئے اور پیارے صاحب رشیدؔ کو جو میر انیسؔ کے نواسے اور لکھنؤ کے مشہور مرثیہ گو اور اہل زبان تھے۔ اپنا کلام سنایا۔ اس زمانے میں اقبال پر فارسی کا خاصہ غلبہ تھا۔ پیارے صاحب رشیدؔ خاموشی سے نظم سنتے رہے اور اس کے بعد بولے: "صاحب یہ اردو ہے۔ یا فارسی؟ ہم نے تو ایسی اردو کہیں نہیں سنی۔"

دیکھا آپ نے؟ انیسؔ نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ ؎

غلط یہ لفظ، وہ مضمون برا، یہ بندش سست
ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو!

ایک اعتراض اقبالؔ پر یہ بھی ہوا تھا کہ وہ "گفتار کے غازی" ہیں "کردار" کے نہیں۔ یَقُولُونَ مَالَا یَفعلُونَ۔ اس پر بھی لگے ہاتھوں ایک چٹکلہ سن لیجئے۔

مولانا محمد علی جوہرؔ نے ایک دفعہ اقبالؔ سے کہا کہ حضرت! بہت ہو چکی قومی و ملی شاعری۔ اب میدانِ عمل میں اتر آیئے۔ تو اقبالؔ نے جواب دیا کہ "مولانا اگر قوال کو بھی حال آجائے تو خیریت نہیں!"

فانی بدایونی انھیں شاعر سے زیادہ ناظم سمجھتے تھے۔ مجنوںؔ گورکھپوری کا اعتراض ہے کہ "اقبالؔ کی تنگ نظری اور غلط فکری میلانات کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں۔ وہاں ایک سبب شاید یہ بھی ہو کہ وہ اتنی بڑی شخصیت کے باوجود ٹھیٹھ پنجابی تھے۔" لیجئے صاحب! پنجابی ہونا بھی گویا جرم ہو گیا۔ ؎

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامیؔ!
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

نجمی۔

۱۶ر اپریل ۶۵ء

دلایف علیف

صباح الخیر۔ زلفِ جاناں سے سوا آپ کا طویل والا نامہ بعد از انتظار بسیار ملا۔ جس کو پا کر میں نے "اہلاً و سہلاً" و "مرحبا" کہا!

نامہ کیا ہے پورے پانچ صفحات پر مشتمل ایک اچھا خاصہ پمفلٹ یا کتابچہ ہے۔ ماشاء اللہ آپ کو اردو انشا پردازی پر کس قدر عبور حاصل ہے! اور آپ طلباء کو کتنی تندہی کے ساتھ درس دیتے ہیں۔ اے کاش دوسرے "مولویانِ اسکول اور" پروفیسرانِ کالج" بھی اگر اسی شغف و انہماک اور اسی ہمدردی اور خلوص سے لڑکوں کو پڑھایا کریں، اور زبان کا صحیح ذوق ان میں پیدا کر دیں تو اس میں شک نہیں کہ اڑیسہ میں اردو کا بیڑا پار ہے۔ اس کے لئے میں سارا الزام معلمین حضرات پر تھوپنا نہیں چاہتا۔ ششصت بر صد اگر مدرسین ذمہ دار ہیں تو صد در صد طلبا پر بھی اس کا الزام عائد ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ گروہ غرض صرف میٹرک یا بی اے پاس کرنے پر اردو کو اپناتا ہے۔ پھر پاس ہونے کے بعد نہ انکو زبان سے کوئی غرض ہوتی ہے نہ مطلب۔ بھلا ایسی حالت میں اردو یہاں خاک پنپے۔ جو دو چار نفوس یہاں اردو کی بے لوث خدمت اور زبان کی روز افزوں ترویج میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کا وجودِ مسعود بہت غنیمت ہے۔ ؎

من و تو ہر دو لئے مجنوں بیا از بیخودی رقصیم
کہ در شہر جنوں دیوانہ با دیوانہ می رقصد!

آپ نے والیٔ افغانستان امیر حبیب اللہ خاں کا جو لطیفہ لکھا ہے، ان سے متعلق اور ایک چٹکلہ بھی بہت مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب یہی امیر صاحب دربار برخاست کرکے اپنے کیمپ لوٹ رہے تھے تو راستے میں انھیں استنجے کی ضرورت پیش آئی۔ انھوں نے حسبِ دستور کلوخ طلب فرمایا۔ انگریز آفیسل جو ان کی معیت میں تھے۔ ڈھیلے کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ اکبر الہ آبادی

نے اسی شعر پر یہ شعر کہا تھا ۔

کوئی دیکھے نمازی شاہزادے کے ڈکھیوں کو
کہ افسردہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں استنجے کے ڈھیلوں کو ۔

واقعہ صحیح ہو یا غلط لیکن اکبر نے اپنے کام کی بات اس سے نکالی ہے۔ غرض اس شہنشاہ ظرافت کے بیسوں لطیفے اور بے شمار برجستہ گوئیاں زبان زد خاص و عام ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ گوہر جان نام کی ایک طوائف ان کے وقت میں الہ آباد میں بہت مشہور تھی۔ اس کی آسودہ حالی اور دولتمندی کا ذکر سن کر اکبر نے برجستہ یہ شعر کہا۔

کون آرام سے دنیا میں ہے گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

دیکھا آپ نے گوہر اور شوہر کا سنگم؟ اور کتنی چبھتی ہوئی حقیقت ہے۔ اور یہ شعر بھی ملاحظہ ہو کتنی سچی بات کہی ہے حضرت نے۔ ہم مسلمانوں کی موجودہ حالات کا صحیح نقشہ ہے۔

تھے کو بھلا کے آپ فقط ہیں کو دیکھئے
ہم کا زمانہ اب نہ رہا ہیں کو دیکھئے

نجمی۔

۳۰ جولائی ۷۵ء

عزیزم مولوی صاحب

صبحک بالخیر۔ کل شب کو بہار الدین برائنہ کے مکان پر ہماری گفتگو کا پھیلاؤ جو تادیر قائم رہا، وہ نہایت دلچسپ تھا۔ اس خط کو اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھئے۔ چند انگریزی اصطلاحات جو ہمارے شعر و ادب میں آجکل بکثرت مستعمل ہونے لگے ہیں، ان کے اردو مترادف الفاظ ذیل میں سپرد قلم کرتا ہوں جو یقیناً آپ کی مزید دلچسپی کا باعث ہو۔

ROMANTIC.	رومانی ۔
IMPULSES.	ہیجانات ۔
ANALOGY.	مماثلت ۔
CONSIOUSMIND.	نفس شعوریہ ۔
SUBCONCIOUS MIND.	تحت شعوری ۔
PSYCHOLOGY.	علم النفس ۔
TECHNI QUE	ترکیب اظہار ۔
IDIOLOGY.	اخلاقیات ۔
EGOISM	انانیت ۔
TIME SPIRIT,	روح عصر ۔
LOGICAL SOUL.	نفس ناطقہ ۔
INCARNA.:TION.	حلول
SCIENTI FIC CERTAIN.	علم الیقین
VISUAL CERTAINY.	عین الیقین ۔
REAL CERTAINY	حق الیقین
SYM BOL	علامت، نشان ۔
EPICUREAN	شہوانی
NEO-PLATONISM.	جدید افلاطونیت ۔
SEXUALITY.	جنسیت
PROPORTION.	تناسب
IDEALISM.	تخلیت
REALISM	واقعیت
PROPOR TION	تناسب
DIVI ORDINANCE	امر الٰہی ۔

وغیرہ وغیرہ ۔

ما مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق
او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

نجمی۔

33698

۱۸ مئی۔

جناب والا۔

السلام علیکم۔ مزاج اقدس؟ جب گرما کے کا جاڑا پڑنے لگتا ہے تو فارسی میں کہتے ہیں۔ شمس در عقرب است؛ یعنی آفتاب برج عقرب میں آگیا ہے۔ اس نے کڑاکے کی سردی پڑنے لگتی ہے

معلوم نہیں آفتاب عالمتاب اس وقت کون سے برج میں داخل ہوا ہے کہ دن کو ایسی چلچلاتی دھوپ پڑنے لگی ہے کہ پناہ بخدا! گرمی کی وجہ سے کسی پہلو قرار نہیں پڑتا۔ سر بنا و قناعد آب استاد اکبر الہ آبادی کا یہ شعر کتنا صحیح ہے۔ ؎

پڑ جائیں ابھی آبلے اکبر کے بدن میں
پڑھ کر جو کوئی پھونک دے اپریل مئی جون!

بہرکیف اس "روح فرسا" گرمی میں ایک "روح افزا" لطیفہ سن لیجئے۔ جس کو ڈاکٹر منظر تیب شادانی نے حضرتِ حافظ شیرازی کے اشعار پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کسی بزرگ کا عرس تھا۔ مزار پر قوالی ہو رہی تھی۔ ہزاروں آدمی جمع تھے۔ قوال گا چکے تو ایک نوجوان، حسین اور شوخ اور چنچل طوائف کی باری آئی۔ اس نے محفل میں آتے ہی یہ غزل شروع کی۔ ؎

اگر یوں ہی توڑا مروڑی رہے گی
تو کاہے کو انگیا نگوڑی رہے گی

نسوانی حسن، آواز جادو بھری، ادائیں قیامت کی، اشارے غضب کے، غرض سارا مجمع دل تھام کر رہ گیا۔ سچ ہے۔ ؎

صوفیوں کو وجد میں لاتا ہے نغمہ ساز کا
شبہ ہو جاتا ہے پردے میں تیری آواز کا!

سجادہ نشین پیر صاحب پر تو کچھ ایسی حالت طاری ہوئی کہ الا اللہ کا نعرہ مار کر کھڑے ہو گئے اور محفل میں رقص فرمانے لگے۔ رقص کرتے کرتے آخر تھک کر گر پڑے۔ مگر طوائف برابر اسی شعر کو دہراتی رہی۔ تھوڑی دیر میں جب پیر صاحب کے ہوش و حواس درست ہوئے اور وہ اطمینان کے ساتھ گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھ گئے اور محفل سماع برخاست ہو گئی تو ان کے ایک مرید نے عرض کیا کہ حضور اس شعر کا ظاہری مطلب تو ہم لوگ بھی سمجھ گئے۔ لیکن اس میں جو رموزِ معرفت پنہاں ہیں ان تک ہماری عقل کی رسائی نہ ہو سکی۔ اگر حضور اس کی تشریح فرما دیں تو عین نوازش ہوگی۔ پیر صاحب نے فرمایا کہ بات تو سیدھی سی ہے۔ غور کرتے تو تم خود ہی سمجھ جاتے۔ انگیا سے مراد ہے جسمِ انسانی، روح اس میں قید ہے اور ہر وقت اس سے نکل جانے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ تاکہ ذات احدیت سے جا ملے۔

توڑا مروڑی سے مراد جسم اور روح کی کشمکش۔ بس شعر کا مطلب یہ ہوا کہ اگر جسم و روح کی رسہ کشی اسی طرح جاری رہی تو روح کا یہ قفسِ عنصری یعنی بدن، جلد ہی ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جائے گا۔

دیکھا جناب آپ نے کتنی خوبصورت تاویل ہے اور شعر کے معنی کو توڑ مروڑ کے کس طرح گنجینۂ اسرارِ معرفت بنا دیا گیا ہے۔ اقبال نے سچ کہا ہے۔ ؎

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند!

نجمی۔

۲۵ مئی ۶۵ء

عزیز من مولوی صاحب۔

السلام علیکم۔ مزاج مبارک؟

شہنشاہ نور الدین محمد جہانگیر اگر شعر و سخن کا بہت ہی اچھا اور شستہ مذاق رکھتا تھا تو اس کی رفیقۂ حیات ملکہ نورجہاں بیگم بھی سخن فہمی، سخن سنجی اور برجستہ گوئی میں اس سے کسی طرح کم نہ تھی۔ شعر و ادب میں ان دونوں کی نوک جھونک بڑی دلچسپ ہوا کرتی تھی۔

ایک دفعہ جہانگیر کے دربار میں امیر الامراء شریف خاں شیرازی کا یہ شعر پڑھا گیا۔ ؎

بگذر مسیح از سرِ ما کشتگانِ عشق
یک زندہ کردنِ تو بصد خوں برابر است

اس کے ایک درباری ملا احمد نے کہا۔ ؎

اے محتسب زگریۂ پیرِ مغاں بترس
یک خم شکستنِ تو بصد خوں برابر است

جہانگیر نے نورجہاں کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے کہا۔ ؎

از من متاب رخ کہ نیم بے تو یک نفس
یک دل شکستیں تو بصد خوں برابر است

نورجہاں نے فوراً جواب دیا۔ ؎

چوں تابم از تو رخ کہ توئی قبلہ مراد
رخ تافتن ز قبلہ بصد خوں برابر است

اسی طرح جہانگیر نے ایک موقع پر نورجہاں کی طرف مخاطب ہو کر کہا ؎

بلبل نیم کہ نالہ کنم دردِ سر دہم
پروانہ ام کہ سوزم و دم بر نیاورم

نورجہاں نے فوراً جواب دیا ؎

پروانہ من نیم کہ بیک شعلہ جاں دہم
شمعم کہ شب بسوزم و دم بر نیاورم

دیکھا آپ نے جناب ع

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

اور سنئے۔ جہانگیر نے ایک مرتبہ نورجہاں کے لباس پر زعفرانی چھینٹے دیکھ کر برجستہ یہ شعر کہا ؎

نیست جاناں برگریبانِ تو رنگِ زعفراں
زردیٔ رنگِ رخِ من شد گریباں گیرِ تو

نورجہاں بھلا کب چوکنے والی تھی؟ جہانگیر کی قبا پر لال بوتام ٹکا ہوا تھا۔ اس پر نظر ڈالتے ہوئے فوراً کہا ؎

تا اگر تکمۂ لعل است بر لباس حریر
شدہ است قطرۂ خونِ منت گریباں گیر

غرض یہ کہ بادشاہ اور بادشاہ بیگم جو ایک دوسرے کی محبت میں سرشار تھے، شعر و سخن کا کتنا اچھا اور شستہ مذاق رکھتے تھے۔ ہائے۔ ؎

اے ہم نفسانِ محفلِ ما!
رفتید ولے نہ از دلِ ما!

———

نجمی

۴؍ اگست ۶۵ء۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

مولوی صاحب سلامت۔ مزاجِ اقدس؟

میرے اور آپ کے "جنوں کی حکایاتِ خونچکاں" کا سلسلہ یکایک بند ہو جانا بڑے افسوس کی بات ہے۔ گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نا کردہ کسی نے ہمارے ہاتھ قلم کر دیئے بخدا ایسے بہت سے خیالات اور تاثرات میں جو نہاں خانۂ دماغ و دل سے نکل کر نوکِ قلم کے ذریعہ سے صفحۂ قرطاس پر الفاظ و معانی کی شکل میں نمودار ہونے کے لئے بیتاب رہتے ہیں۔ لیکن چونکہ آپ ادھر سے خاموش اور میں ادھر سے چپ تھا، اس لئے یہ سلسلہ چندے التوا رہا۔ اب میں اپنی طرف سے پھر اس کی تجدید کر رہا ہوں۔ ع

من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

چونکہ ان خطوط میں جواب طلب امور بہت کم ہوتے ہیں اس لئے آپ ان کے جواب میں چنداں فکر نہ کیجئے۔ صرف ایک نظر غلط انداز ان پر ڈال کر اپنے فائل میں رکھ چھوڑئے کہ داشتہ آید بکار کا اصول بہت اچھا ہے۔ ؎

بعد از وفات تربتِ ما از زمیں مجو!
در سینہ ہائے مردمِ عارف مزارِ ماست

ہاں تو میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ متقدمین میں محبت یار خاں محبت ایک اچھے سخن سنج اور صاحب ذوق شاعر گزرے ہیں جن کو نواب آصف الدولہ کی سرکار سے وظیفہ ملا کرتا تھا۔ یہ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی گاہ بگاہ طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ فارسی میں ان کے یہ دو شعر ملاحظہ فرمائیے۔ ؎

گر کشش من اثرے داشتے — یار بہ گریم گزرے داشتے!
آنکہ جہاں را بہ نگہ زندہ کرد — کاش بہ ما ہم نظرے داشتے!

ان اشعار میں کتنی سادگی اور واقعیت ہے۔ زبان کس قدر صاف اور کیسی ٹکسالی ہے!

اسی نظر گزرنے پر شریف تبریزی کے دو شعر بھی سن لیجئے۔ سہ

"ز دو دیدہ خوں فشاندم کہ نظر کنی نکردی
برہ تو خاک گشتم کہ گزر کنی نکردی!
دمِ مرگ ہیچ دانی ز چہ باز ماند چشمم؟
ز تو بود چشم آنم کہ نظر کنی نکردی!"

دیکھا آپ نے۔ آنا، جانا، دیکھنا وغیرہ معمولی باتیں ہیں لیکن حسین پیرایۂ اظہار نے ان کو کس قدر دل پذیر بنا دیا ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ کمالِ اظہار شاعری کی اولین شرط ہے۔ اسلوبِ بیان بھدّے سے بھدّے خیال اور المناک سے المناک جذبہ کو خوبصورت بنا دیتا ہے۔ خاقانی کہتا ہے۔ سہ

بہ رخت چہ چشم دارم کہ نظر دریغ داری
بہ ربت چہ گوش دارم کہ خبر دریغ داری

اس پر نواب میں واقفؔ بٹالوی کے دو اشعار بھی پڑھئے، سنئے اور سر دھنئے۔ سہ

تو بکار کسے نمی آئی — بجنازہ کسے نمی آئی!
از برائے تو چوں تواں مُردن — بہ مزار کسے نمی آئی!

نجمیؔ

۲۳؍اگست ۶۹ء

عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں یہ ستارے یہ نیلگوں افلاک!

مولانا صاحب سلام علیک۔ وہ جو ہماری زبان میں کئی محاورے رائج ہیں، جیسے آسمان زمین ہلا دینا، آسمان زمین ایک کر دینا، آسمان سے تارے توڑ لانا، آسمان ٹوٹ پڑنا، آسمان پھاڑ کے ٹکلی لگانا، آسمان زمین کے قلابے ملانا، آسمان سے پتال تک جانا وغیرہ وغیرہ، ان کے مجازی معنی کچھ ہوں لیکن انکے حقیقی معنی موجودہ دور میں جیتے جیتے ثابت ہو رہے ہیں، شاید اگلے زمانے میں ہو نہ پائے تھے۔ ایٹم بم سے قیامتِ صغریٰ کا ڈھانا، چاند پر ڈورے ڈالنا، مریخ پر کمندیں پھینکنا، طیاروں کا آسمان کے کنگرے چھونا، خلائی تسخیر کا سعی مشکور ہونا، آب دوزوں کا سمندر کا سینہ چیر کر پاتال تک پہنچنا، ایورسٹ پر پرچم لہرانا، راکٹوں کا ہزاروں میل

دور کی آوازوں سے کان کے پردے پھاڑنا، ٹیلی ویژن کی ایجاد نمائی۔ غرضکہ سائنس نے ہمیں بہت کچھ سکھا دیا ہے دے رہا ہے اور دیگا۔ "رازِ دہر کہ جو تھے اب فراریت باقی نہیں رہی بلکہ یہ زمانہ "منشرح" کا ہے۔ سہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

کہنے کا مدعا یہ ہے کہ استنبول سے ایک تازہ خبر ہے کہ کشتیٔ نوح ...... کا بھی پتہ لگ گیا ہے۔ ظ

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما؟

ایک انہتر ۶۹ سالہ امریکن جان لبی (JOHN LIBI) کا دعویٰ ہے کہ نوح علیہ السلام کی کشتی کوہ اگری (MT. AGRI) پر خاک اور کیچڑ سے آلودہ یا لودہ ایک تودے کی شکل میں دبی پڑی ہے۔ یہ پہاڑ مشرقی ترکی کی جانب واقع ہے جس کی بلندی سطح زمین سے ۱۶،۹۵۰ فٹ بتائی جاتی ہے۔ مسٹر لبی اس پہاڑ پر تین دفعہ چڑھ چکے ہیں۔ یہ صاحب سان فرانسسکو کے ایک متمول تاجر ہیں اور چھ بار اس سلسلے میں ترکی جا چکے ہیں۔ اور گزشتہ گیارہ سال کے اندر وہ اس مہم پر تیس ہزار پونڈ خرچ کر چکے ہیں۔ اس مرتبہ وہ اپنے ایک ترکی دوست میجر شہاب عطائے کے ساتھ کوہ اگری کو پھر سے سر کرنے کے لئے ساز و سامان اور آدمی جمع کر رہے ہیں۔ حکومت ترکیہ نے انھیں اس مہم کی اجازت دیدی ہے۔

دیکھا جناب آپ نے؟ یہ ہے پرکاہ بکھیر دیعنی انسانِ ضعیف البنیان کہاں سے کہاں پہنچ رہا ہے اور آسمان و زمین کے کیا کیا قلابے ملا رہا ہے۔؟

سچ کہا ہے اقبالؔ نے۔ سہ

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

بہرکیف طوفانِ نوح کے بعد کشتیٔ نوح جس پہاڑ پر جاکر ٹھہری تھی بائبل میں اسے (MOUNT ARARAT) (ارارا ط) کی پہاڑی کہا گیا ہے اور قرآن کریم نے اس کا نام جودی ....

بتلایا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ ہے۔ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ۔ یعنی کشتی نے جودی پر لنگر کیا تھا۔

عجائب المخلوقات کے مصنف کا بیان ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی سے باہر آنے کے بعد یہاں یعنی کوہ جودی پر ایک مسجد بنائی تھی اور اس مسجد پر عہد بنی عباس تک ناؤ کے تختے موجود تھے صاحب مجمع البحار کا کہنا ہے کہ دجلہ اور فرات دو دریاؤں کے بیچ میں ایک جزیرہ ہے۔ جس پر یہ جودی پہاڑ واقع ہے بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ پہاڑ موصل اور شام کے درمیان کہیں ہے۔

اقبال کے اس مصرع سے جو انھوں نے "ہندوستان کے بچوں کا قومی گیت" کے عنوان سے لکھا ہے۔ یعنی۔ ؏

نوح نبی کا آکر ٹھیرا جہاں سفینا

معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہاڑ ہمارے ہندوستان جنت نشان کی سرحدوں پر کہیں واقع ہے!

خیر کہیں بھی واقع ہو۔ دیکھنا اب یہ ہے کہ مسٹر لنگی کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؟ ؏

کہ سالک بےخبر نبود ز راہ و رسم منزلہا!

بالکل صحیح ہے۔

مدعی نے کچھ دیکھ بھال کے اور سمجھ بوجھ کے ہی تو یہ دعویٰ کیا ہے۔

نجمی

ابن فرید

علامت کا تصوّر زمانی و مکانی

ابن فرید نے اس مضمون میں علامت کا جو تصوّر زمانی و مکانی پیش کیا ہے، وہ بحث طلب ہے۔ قارئین کرام کو اس پر کھل کر گفتگو کرنے کی دعوت دی جاتی ہے۔

("ادارہ")

علامت پر بحث شروع کرتے ہی اس سوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ علامت ہے کیا؟ پھر جواب کے لئے جب اس کی ابتدا کا سراغ لگایا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ لفظ سمبل (SYMBOL) یونانی لفظ سمبالین (SYMBALINE) سے نکلا ہے۔ جس کے معنی ہیں "دو چیزوں کو ایک ساتھ رکھنا" بہ الفاظ دیگر "ایک شے کے بجائے دوسری شے کا استعمال!" یہ تصور کافی طویل عرصہ تک عام رہا۔ فلسفیوں نے اس تعریف پر مزید غور کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی کیونکہ سند کے طور پر ارسطو کو پیش کیا جا سکتا تھا۔ ماہرین عمرانیات و نفسیات بھی اس کلیہ کو سچ مان کر تشریحات و توضیحات میں الجھ کر۔ ولیم جیمز (WILLIAM JAMES) ارتسامی نظریہ (ASSOCIATIONISTIC THOERY) کے تحت صرف شے اور شے میں رشتہ تلاش کرتا رہا۔ اس کے نزدیک علامت کا صرف یہی ایک مقصد ہے۔ فرائڈ (FREUD) کے نظریات کی اساس بھی یہی نظریہ ہے۔ چنانچہ وہ بھی صرف ارتسامات ہی کا متلاشی رہتا ہے۔ البتہ اس کے جنسی محدّب شیشوں نے کچھ نئی ضرور تلاش کیں جن کی توجیہہ وہ ارتفاع (SUBLIMATION) اور امتناع (REPRESSION) وغیرہ کے ذریعہ کرتا رہا۔ اس تلاش میں اس نے غیر ارادی طور پر علامت کے ایک بُعد (DIMENSION) کو اہمیت دی جو زمانی (TEMPORAL) ہے۔ یعنی بُعد زمانی کے کسی نقطہ پر کوئی شے کسی دوسری شے سے مرتسم ہو جاتی ہے۔ پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اس کی علامت بن جاتی ہے۔ اس کے تمام علائم صرف اسی ایک خط پر سفر کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت اس کے یہاں علامت کی ان اقسام سے ملتا ہے۔ جو اس نے بیان کی ہیں۔ یعنی (الف) عارضی۔ (ب) دائمی علامتیں وقتی ہوتی ہیں۔ اور ایک قلیل عرصہ میں فنا ہو جاتی ہیں۔ دائمی علامتیں وقت کے ہاتھوں فنا نہیں ہوتیں۔

ینگ (JUNG) نے علامت کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے اس کے یہاں شاذ و نادر ہی ایسی تحریریں ملتی ہیں جو اس ذکر سے خالی ہوں۔ وہ علامت کو فرائڈ کی طرح بدل (SUBSTITUTION) یا موازنہ (COMPARISION) نہیں مانتا وہ یہ بھی نہیں مانتا کہ علامت ایک شے کے بجائے دوسری شے کا استعمال ہے۔ اسکے نزدیک علامت اتنی سادہ نہیں ہوتی کہ اسے بلاوی انظر میں سمجھ لیا جائے۔ اس صورت میں تو وہ صرف نشان (SIGN) یا نظیر

[illegible] (…ORUE)

مند اور پیچیدہ ہے۔ یہ صرف انسان کے ماضی کی طرف اشارہ نہیں کرتی۔ بلکہ اس کے مستقبل کی آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشوں کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔ اسی وجہ سے علامت کی حرکت کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک ماضی کی طرف (RETROSPECTIVE) دوسرا مستقبل کی طرف (PROSPECTIVE) یعنی علامت تفاعلی (FUNCTIONAL) بھی ہوتی ہے۔ اور وجودی (ONTOLOGICAL) بھی۔ تفاعلی اور وجودی پہلوؤں کو سمجھنے کے لئے زمانہ اور معاشرہ دونوں کو سمجھنا ہوگا۔ لیکن جب ینگ تفاعل و وجود کی وضاحت کرنے لگتا ہے۔ تو وہ بھی بُعد زمانی کو اس قدر اہمیت دیتا ہے کہ ایک نیا بُعد، جو وہ علامت کے لئے تلاش کر سکتا تھا، اسے گم کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے یہاں نقوش اولیں (ARCHETYPES) اس قدر زیادہ آفاقیت حاصل کر لیتے ہیں کہ کرۂ ارض پر پھیلے ہوئے معاشروں اور تہذیبوں کے امتیازات موم کی مانند پگھل کر رہ جاتے ہیں۔ اس طرح اس کے یہاں بھی علامت کا صرف ایک ہی بُعد ——— بُعد زمانی — باقی رہ جاتا ہے۔

ایرک فروم (ERICH FROMM) نے ضرور علامت کا ایک مختلف بُعد — بُعد مکانی (SPATIAL DIMENSION) پیش کیا ہے لیکن یہ پیش کش بھی غیر ارادی ہے۔ کیونکہ وہ بُعد زمانی اور بُعد مکانی میں شعوری طور پر کوئی امتیاز نہیں کر پاتا۔ اس کا ثبوت بھی اس کی بیان کردہ اقسام علامت سے ملتا ہے۔ اس کے نزدیک علامت کی تین قسمیں ہیں۔

(الف) روائتی، (ب) اتفاقی، (ج) آفاقی۔ روائتی علامتیں تہذیب و معاشرہ کی میراث ہوتی ہیں۔ اتفاقی علامتیں زمانی ہیں۔ اور آفاقی علامتیں تمام تہذیبوں اور معاشروں میں تقریباً مشترک ہوتی ہیں۔ وہ ان اقسام میں ارضی تعلق کو ینگ کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ البتہ اس اہمیت کے خلوص میں وہ علامت کے زمانی ارتقاء کو تقریباً نظر انداز کر دیتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ صرف قبیلہ اور گروہ کے ماحول تک ہی خود کو محدود کر لیتا ہے۔ ان نظریات کے بعد علامت کے لئے کوئی نیا طریقہ ڈھونڈ نہ

کیا جا سکا۔ بلکہ بدقسمتی سے لیون (LEWIN) اور مرفی (MURPHY) جیسے مبصری ایک بار پھر رجعت قہقہری کر گئے۔ اور انہوں نے علامت (SYMBOL) نشان (SIGN) اور نظریہ (ANALOGUE) کا امتیاز ہی ختم کر دیا۔ حالانکہ ضرورت اس امر کی تھی کہ اس موضوع پر مزید تحقیق کی جاتی۔ اور نئے امکانات تلاش کئے جاتے۔ بہر حال اس مرحلہ پر یہ اعتراف ناگزیر ہے کہ حقیقت کے اجزاء تقریباً ہر نظریہ میں موجود ہیں۔ لیکن زیادہ جامع حقیقت — حقیقت کلی کا دعویٰ تو کیا ہی نہیں جا سکتا — کا انکشاف باقی رہ گیا ہے۔ جو زیادہ توجہ کا متقاضی ہے۔ اس لئے راقم ایک نئے نظریہ کے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہے۔

ینگ اور فروم کی طرح ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ علامت بدل اور موازنہ کے بجائے نمائندگی (REPRESENTATION) ہے۔ یہ محض دوسری شے کی جگہ نہیں لیتی۔ بلکہ زیادہ مرتفع (SUBLIMATED) انداز میں تہذیبی معیار کے ساتھ کسی شے، تاثر، یا خیال کی نمائندگی کرتی ہے۔

مثلاً میر کہتے ہیں۔ ؎

رلیت اک ماندگی کا عرصہ ہے
یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر

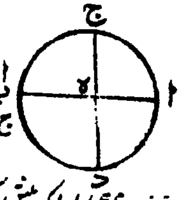
یہاں زلیست حیاتیاتی (BIOLOGICAL) نہیں ہے۔ بلکہ اس کے اور بھی لطیف پہلو ہیں۔ جو فرد، معاشرہ اور وقت کے رشتہ سے تھوڑے بہت متنوع ہوں گے۔ اس کی تشریح صرف ایک لفظ سے نہیں کی جا سکتی۔ البتہ وہ ساری تشریح جو کسی بھی فرد کے ذہن میں آ سکتی ہے۔ اس کی نمائندگی یہ ایک لفظ ضرور کر رہا ہے۔

نفسیات کے متذکرہ بالا نظریات کے مطالعہ سے ہم بہ آسانی یہ اخذ کر سکتے ہیں کہ علامت کے لئے دو ابعاد (DIMENSIONS) ضروری ہیں۔

(۱) زمانی، (۲) مکانی۔

جنھیں شکل نمبر ا میں اس طرح دکھایا گیا ہے کہ (ا ج)

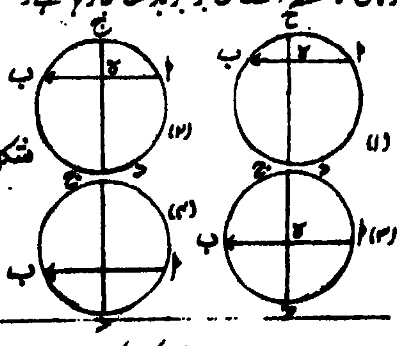
شکل نمبر ۱



ا۔ ب = بُعدِ زمانی
ج۔ د = بُعدِ مکانی

عرصۂ حیات (LIFE-SPACE) کو پیش کرتا ہے۔ جو زمان و مکان کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔ اس عرصۂ حیات میں انسان مختلف تجربات کرتا رہتا ہے۔ اور مختلف تاثرات قبول کرتا رہتا ہے۔ جو ایک وقت میں ایک خاص مکانی حالت (SITUATION) میں ہوتے ہیں۔

زمان و مکان کے رشتہ سے یہ تجربات و تاثرات جب جامع صورت اختیار کر لیتے ہیں تو علامت کے پیکر میں ڈھل جاتے ہیں۔ گویا یہ علامت کے لئے بُعدِ مکانی اور بُعدِ زمانی کا ارتصال ہوتا ہے۔ بُعدِ مکانی کو ہم اپنی آسانی کے لئے تہذیب یا معاشرہ[1] بھی کہہ سکتے ہیں۔ اب فرض یہ کیا جائے کہ ایک علامت کسی تہذیب یا معاشرہ میں سند کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے۔ اور ایک عرصہ سے اس میں رائج ہے۔ اس صورت میں خط، ا، ج، د، ثابت ہو جائے گا (CONSTANT) اور خط، د، ا، ب، نقطہ 'ک' پر ہی حرکت کرے گا۔ ملاحظہ ہو شکل نمبر ۲ جس میں بُعدِ مکانی کا دائرہ عرصۂ حیات کے ساتھ نقطۂ اتصال نہیں بدلتا۔ البتہ بُعدِ زمانی کا نقطۂ اتصال برابر بدلتا جا رہا ہے۔



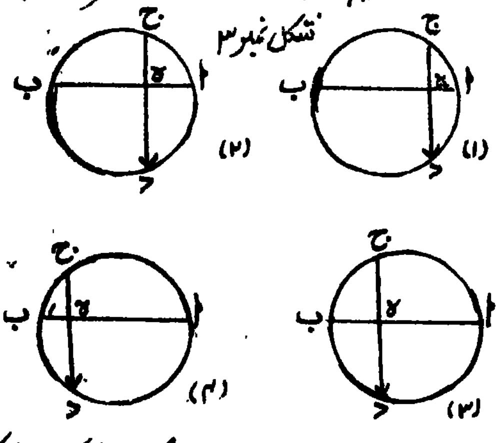
شکل نمبر ۲

اس طرح علامت امتداد زمانہ کے باوجود اپنے ابتدائی ابلاغ سے محروم نہیں ہوگی۔ مثال کے طور پر غزل کے کچھ علائم پیش کئے جاتے ہیں۔ جیسے شمع و پروانہ، گل و بلبل، وغیرہ۔ یہ عام طور سے محبوب اور محبت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کا ذکر آتے ہی ذہن اسی مفہوم کی طرف راجع ہوتا ہے۔

اگر خط، ا، ب، کو ثابت تصور کر لیا جائے اور (ج، د) کو متحرک، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ علامت بُعدِ زمانی کے لحاظ سے مستحکم ہے، لیکن بُعدِ مکانی کے لحاظ سے اس مفہوم میں تنوع ہوتا رہا ہے۔

ملاحظہ ہو شکل نمبر ۳ جس کے مختلف مراحل کا جائزہ

شکل نمبر ۳

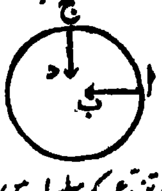


لینے سے بین طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ بُعدِ مکانی کے بدلنے کی وجہ سے تہذیب و معاشرہ میں بھی تبدیلی واقع ہوتی جا رہی ہے۔ اس نوعیت کو سمجھنے کے لئے اس مثال سے مدد لی جا سکتی ہے کہ ساحلی علاقوں میں پانی کی قلت کی وجہ سے عیسائی راہبوں میں یہ تصور عام ہو رہا ہے کہ بپتسمہ کے وقت متبرک پانی کے جسم مس ہونے کے بعد جسم کو دوبارہ عام پانی سے مس نہ کیا جائے گا۔ ورنہ طہارت نہیں رہے گی۔ اس کے برخلاف ہندوستان جیسے علاقوں میں، جہاں پانی کی فراوانی ہے۔ جتنی بار چاہے تر دریا

[1] تہذیب یا معاشرہ کی ترکیب سے مراد یہ نہیں ہے کہ یہ دونوں اصطلاحات مترادف ہیں، بلکہ اس مضمون میں آسانی بیان کے لئے تہذیب کو وسیع معنوں میں اور معاشرہ کو سوسائٹی کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ (ا، ف)

میں غسل کیا جائے۔ اتنی ہی بار انسان گناہوں سے پاک ہوگا۔ اس
مثال سے صاف طور پر عیاں ہوتا ہے کہ دائرۂ عرصۂ حیات کے
ساتھ بُعدِ زمانی کا نقطۂ اتصال ثابت ہے۔ لیکن بُعدِ مکانی کا نقطۂ
اتصال تبدیل ہوگیا ہے۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ ۔ا،ب اور ج، د
ان دونوں خطوط کے نقطۂ اتصال (یعنی نقطہ "ہ" کے پاس
علامت پیدا ہوتی ہے۔

بہر صورت کسی بھی علامت کی تشکیل کے لئے ضروری ہے کہ
بُعدِ زمانی اور بُعدِ مکانی کا اتصال ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو علامت
تشکیل نہیں پائے گی۔ ملاحظہ ہو شکل نمبر ۴، اس شکل کے ذریعہ
ہم متعین نہیں کر سکتے کہ "ہ" کا مقام کہاں ہے۔؟ اس لئے
ہم یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ علامت کہاں ہے؟ یعنی اس کا زمانہ
اس کا معاشرہ اور اس کی نوعیت کچھ بھی نہیں بتائی جا سکتی۔



شکل نمبر ۴۔

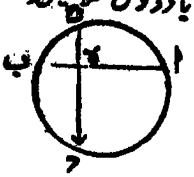
بُعدِ مکانی میں تنوع کے سلسلہ میں ایک سوال یہ بھی پیدا
ہوتا ہے کہ اس کی توجیہہ کیونکر کی جائے گی کہ بعض اوقات
ایک ہی معاشرہ میں علامت کے ابلاغ میں تنوع ہوتا ہے۔
فروم نے اس تنوع کی توجیہہ اس طرح کی ہے کہ فرد کے موڈ یا
میلان میں ایک تغیر کی وجہ سے یہ تنوع پیدا ہوتا ہے۔ لیکن میرے
نزدیک یہ پوری بات نہیں ہے۔ یہ صرف ایک پہلو ہے۔ حقیقت
اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔

مثلاً "حیا" کو لے لیجئے۔ اب سے صرف پچاس سال
پہلے "حیا" کا جو تصوّر تھا۔ وہ اب نہیں ہے۔ پہلے عورت یہ
بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ اسے نکاح قبول ہے یا نہیں۔ اب وہ
شوہر کے انتخاب کے بارے میں بھی رائے دے سکتی ہے۔ لیکن
اس تبدیلی کے باوجود "حیا" کے دونوں تصورات اس زمانہ
میں بھی موجود ہیں۔ اور دونوں کا بُعدِ مکانی بھی سرزمین ہے۔
فروم یہ کہتا ہے کہ یہ اختلافات گروہ یا قبیلہ کے اختلاف

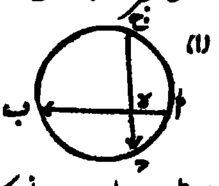
کی وجہ سے ہوتا ہے۔ لیکن ہم اکثر و بیشتر یہ دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں
تصوّرات ایک ہی گھر کے افراد میں مختلف فیہ ہوتے ہیں۔ اس لئے
فروم کی تاویل پوری طرح کامیاب نہیں ہو پاتی۔

زیر بحث نظریہ کے مطابق اگر ہم بہ نظر غائر دیکھیں تو
معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نوعیت کی علامتوں کے لئے طبعی۔
(PHYSICAL) ماحول تو یکساں ہے۔ لیکن عرصۂ حیات
یا دائرہ کے باہر سے کچھ عوامل کے در آمد ہو جانے کی وجہ سے
بُعدِ مکانی میں بھی تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ اور بُعدِ زمانی تو بہر حال
تبدیل ہو گیا ہے۔ اس طرح اوّل الذکر علامت کا نقطۂ اتصال
شکل نمبر (۱) ہ کے مطابق اور ثانی الذکر علامت کا نقطۂ اتصال
شکل نمبر (۲) ہ کے مطابق ہوگا۔ گویا دونوں علامتیں

(۲)



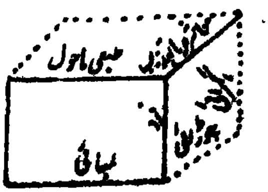
(۱)



ہی طبعی ماحول میں ہونے کے باوجود مختلف عمرانی و نفسیاتی ماحول
میں اپنا وجود رکھتی ہیں پھر بھی چونکہ ان میں طبعی ماحول
کا رشتہ باقی ہے۔ اس لئے ان میں روایت کا ابلاغ بھی کسی نہ
کسی حد تک باقی رہے گا۔ یہ عرصۂ حیات کے یکسر باہر نہیں جاتی
یعنی یہ ان اوصاف کی حامل نہیں ہو سکتی جو خارج کے اسی
عرصۂ حیات کے اوصاف ہیں۔ جس سے کچھ عوامل کو در آمد کیا
گیا ہے۔ مثلاً عورت کی آزادی کا جو تصوّر ہم نے مغرب سے در آمد
کیا ہے وہ ہماری سرزمین میں بالکلیہ ویسا نہیں ہے جیسا مغرب
میں ہے۔ ہم اس سے یہ تقاضا تو کر لیتے ہیں کہ وہ اپنے
آنچل سے ایک پرچم بنا لے۔ لیکن اب بھی ہم یہ قبول کرنے کے
لئے آمادہ نہیں ہیں کہ وہ اپنا آنچل پارہ پارہ کر دے۔ یہ
احتیاط دراصل ماضی اور حال کے درمیان مصالحت نہیں ہے۔
بلکہ عرصۂ حیات میں فرد کا توافق (ADJUSTMENT)
ہے۔ جس کے لئے اسے مکانی عوامل (SPATIAL FACTORS)
اور زمانی تسلسل TEMPORAL CONTINUITY.

دونوں سے ہم آہنگ ہونا ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی ایک سے بھی اپنا رشتہ منقطع کرلے تو اس کا عرصۂ حیات ہی منتشر ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ باہرے درگاہ کی ہوئی علامتوں میں جب تک روایت کی رنگ آمیزی نہیں ہوتی وہ اس مخصوص تہذیب یا معاشرہ کے لئے ناقابل قبول ہوتی ہے۔ ان میں ابلاغ بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ اس خاص عرصۂ حیات کے ابعاد زمانی و مکانی کے کسی نقطۂ اتصال پر واقع نہیں ہوسکی ہیں۔ بلکہ ان کے لئے ارادی طور پر ایک ذہنی نقطۂ اتصال بنایا گیا ہے۔ جس کا تعین نہ تو معاشرہ ہی کر پاتا ہے۔ اور نہ فرد، چنانچہ وہ علامتیں قاری کے لئے قطعاً اجنبی رہتی ہیں۔ ان کا مفہوم صرف فی بطن شاعر ہوتا ہے۔ اور بقول فردم ان کو سمجھنے کے لئے طویل حواشی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر قاری ایسی علامت کے لئے علامت سازسے حواشی کا مطالبہ کرتا ہے تو اس میں قصور قاری کی نافہمی کا نہیں۔ بلکہ علامت ساز کی ناعاقبت اندیشی کا ہے۔ بہرحال یہ علامتیں صحیح طور پر علامتیں ہوتی ہی نہیں ہیں۔ بلکہ علامت سے زیادہ ذاتی نشان (PERSONAL SIGN) قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ یہ مکمل طور پر مکانی سمتوں کی بھی حامل نہیں ہوتی ہیں۔

طبعی ماحول، تہذیب یا معاشرہ، اور فرد کا ذکر گذشتہ صفحات میں اس آزادی کے ساتھ ہوا ہے کہ ہم بآسانی یہ فیصلہ نہیں کرپاتے کہ ان میں سے کسی کو بعدِ مکانی کو تسخیر کرکے تہذیب و معاشرہ کو وجود میں لاتا ہے یعنی اسکی ذات بیک وقت طبعی ماحول صرف خط نہیں ہے بلکہ یہ تین جہتوں کا حامل ہوتا ہے اسکی وضاحت کیلئے ہم مکان کو ایک مکعب کی شکل میں پیش کرسکتے ہیں ملاحظہ ہو شکل نمبر ۲۔ بالفرض مکعب کی لمبائی طبعی ماحول ہے۔ تو اسے چوڑائی تہذیب یا۔



شکل نمبر ۲

معاشرہ عطا کرتا ہے۔ اور گہرائی فرد کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ طبعی ماحول بذاتِ خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ اس کے تمام عناصر انفرادی طور پر جامد اور غیر حرکی ہوتے ہیں تہذیب و معاشرہ کے ذریعہ ان میں افادیت اور معنی کے پہلو پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن خود تہذیب و معاشرہ میں جب تک فرد کا تعامل شامل نہ ہو تہذیب و معاشرہ کی زندگی اور ارتقا کا سوال پیدا نہیں ہوتا مثلاً سیری، بابلی، قبطی، دراوڑی، پالی نیزی، وغیرہ تہذیبوں کو ہم اسی لئے مردہ قرار دیتے ہیں۔ کہ ان میں فرد کا تعامل عرصہ ہوا ختم ہوچکا، اور اب یہ تہذیبیں مردہ ہوکر رہ گئی ہیں۔ ان کی تحریروں کا پڑھنا اور ان کے نظام زندگی کا صحیح خاکہ ذہن میں لانا اسی لئے مشکل ہوگیا ہے کہ بعد زمانی منقطع ہوچکا ہے۔ اور بعدِ مکانی کی صرف ایک جہت (طبعی ماحول) باقی ہے دوسری جہت (تہذیب و معاشرہ) منہدم ہوچکی ہے۔ اور تیسری جہت (فرد) ختم ہوچکی ہے۔ اس مثال سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ بعدِ مکانی صرف ایک خط نہیں ہے۔ بلکہ تین جہتوں پر مشتمل بُعد ہے۔ اس لئے جب بھی بعدِ زمانی کا اتصال اس سے کسی نقطہ پر ہوگا تو وہ صرف سطحی نہیں ہوگا۔ بلکہ تہہ دار ہوگا۔ گویا علامت کے مکان کے تعین کے لئے اس کے طبعی ماحول، تہذیب و معاشرہ اور افراد تینوں کو ملحوظِ خاطر رکھنا ہوگا۔

فرد کو میں نے مکان کی ایک سمت قرار دیا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں اس سے قبل عرض کرچکا ہوں۔ کہ تعامل کا منصب فرد ہی ادا کرتا ہوں، اور تعامل حرکیت (LOCOMOTION) کے بغیر ممکن نہیں ہے اور حرکیت بغیر زمان کے نہیں ہوسکتی یوں تو بقول آئنسٹائن (EINSTINE) کوئی مکان بغیر زمان وجود ہی نہیں رکھتا، اور یہ حقیقت بھی ہے۔ البتہ ہم یہاں تفہیم کے لئے اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ بعدِ مکانی اور بعد زمانی کے درمیان ذریعہ اتصال فرد ہی ہوتا ہے۔ وہ جہاں ایک طرف فعال شے، ہوتا ہے وہاں دوسری طرف طبعی ماحول کو تسخیر کرکے تہذیب معاشرہ کو وجود میں لاتا ہے یعنی اسکی ذات بیک وقت طبعی ماحول

ا اساسی عنصر! اس لئے جہاں بھی بعدِ زمانی، بعدِ مکانی سے
متھال کرے گا وہاں فرد ضرور ہو گا۔ اس لئے علامت ساز ز
رت زمان و مکان کے لئے ذریعہ اتحاد ہو گا۔ بلکہ اس کی پیش
،وہ علامت بھی اس اتحاد و اتصال کی نمائندگی کرے گی۔
نمائندگی صرف ایک تنہا فرد (علامت ساز) کی نہیں۔ بلکہ اس
ہر کے فرد کی ہو گی۔ کیونکہ ہر علامت اپنے ابعاد اور اپنی جہتوں
جلو میں ایک تاریخ، ایک تجربہ اور ایک جذبہ و تاثر رکھتی
ہے۔ یہ تاریخ، تجربہ اور جذبہ و تاثر، صرف ایک فرد تک
محدود نہیں ہو سکتا۔ اسے فرد سے فرد تک پہنچنا ہے۔ ورنہ علامت
ز جس ترسیل و ابلاغ کا خواہش مند ہے وہ اسے حاصل
ہو سکے گا۔ اور علامت کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ فرد اپنے
تجربات صرف اپنی ذات تک کبھی بھی محدود نہیں رکھتا، وہ
ہمیشہ ان میں دوسروں کو شریک کرنا چاہتا ہے۔ اسی وجہ سے
وہ قلیل وقفہ میں وسیع تجربات کے ماحصل کو سمیٹنا چاہتا ہے۔
جامعیت اسے علامت میں نصیب ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اس
وسیلہ کو استعمال کرتا ہے۔ اور دیکھتا ہے کہ دوسرے اس کے
اظہار کو بحسن و خوبی سمجھ رہے ہیں، لیکن جب ایک فرد یہ طے
کرے کہ علامت اس کی ذاتی میراث ہے تو پھر وہ صرف خودکلامی
کر سکتا ہے۔ ابلاغ و ترسیل نہیں! اور یہ خودکلامی، کسی بھی
جامعیت سے اپنے اندر علامت کے جراثیم نہیں رکھتی۔

علامت کے ان ابعاد کے تعین سے علامت کا مطالعہ نہ
صرف مربوط و منظم ہو سکتا ہے، بلکہ ہم بہ آسانی یہ بھی سمجھ سکتے ہیں
علامت جس شئے سے استفادہ کرتی ہے اس کے معاشرہ، تہذیب
زمانی تسلسل اور افراد کے تاثر جذبہ و تجربہ کی روح کو اخذ کر لیتی
ہے۔ جس کی وجہ سے قاری ہر زمانہ، ماحول، اور میلان یا موڈ
کے حسب حال اس سے لطف اندوز ہوتا ہے، اور ہمیشہ اسے
وقت کے ساتھ ساتھ تنوع کا کیف بھی حاصل ہوتا ہے۔ اسی
لئے ینگ کا یہ قول ہمیں کافی معقول معلوم ہوتا ہے کہ علامت
جتنا اتنا آسان نہیں ہوتا ہے جتنا ہم سمجھتے ہیں۔ ایسا ادعا سے

ینگ کا مقصد یہ نہیں ہے کہ علامت کے لئے ایمال یا ابہام ضروری
ہے۔ بلکہ پیش نظر نظریۂ زمانی و مکانی کے مطابق کسی بھی علامت
کو ہم اس وقت تک پوری طرح نہیں سمجھ سکتے، اور نہ اس کی
نزاکتوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ جب تک ہم اس کے ابعادِ
زمانی و مکانی سے مانوس نہ ہوں اور ان ہمہ جہتی عوامل سے متعارف
نہ ہوں جو کسی علامت کی تشکیل میں کارفرما ہیں۔ علامت ساز کیلئے
بھی ان حقائق کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہو گا۔ اگر وہ ابعادِ زمانی
و مکانی اور کارفرما عوامل کا لحاظ نہیں رکھتا۔ بلکہ کسی بھی علامت
کو کسی بھی سرزمین اور کسی بھی دورِ تاریخ سے ابلاغ کا لحاظ کئے
بغیر مستعار لے لیتا ہے۔ تو وہ اپنے قارئین کے لئے اجنبی بن جاتا
ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ صرف ایسی علامتیں سسک سسک
دم توڑ دیتی ہیں۔ بلکہ ان کا خالق بھی اپنی ہی دنیائے ادب میں
گمنام موت مر جاتا ہے۔

ہمیں اس امر کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے کہ علامت خود ایک
تاریخ ہے۔ ایک تسلسل ہے۔ جو ہمیشہ حال میں زندہ رہتی ہے۔
لیکن اس میں ماضی کے تجربات اور مستقبل کے عزائم سب ہی
شامل ہوتے ہیں۔ اس حال (PRESENT) کو بھی جو ختم کرنے کی
کوشش کرے گا وہ گویا زمان و مکان دونوں کے اس نقطۂ اتصال
سے ہٹ جائے گا۔ جہاں پر علامت کا وجود ہے۔

ایک نظم، چار تجزیئے!

(شاعر کا نام مخفی رکھ کر حیدر نایاب کی نظم "آج کے انسان کا المیہ" بیک وقت کئی نقادوں کو ریویو کی غرض سے بھیج دی گئی تھی۔ ان میں سے چار نقادوں نے (جو مختلف ادوار سے تعلق رکھتے ہیں) اظہارِ خیال کرنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے۔ نظم اور چاروں تجزیے ذیل میں ہم شائع کر رہے ہیں۔ اس نوعیت کی تنقید کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ فنکار کی شخصیت قاری اور فن پارے کے درمیان حائل نہیں ہو پاتی۔ امید قوی ہے کہ قارئین "شاخسار" اس سلسلے کو پسند فرمائیں گے اور آئندہ بھی ہمارے نقادوں کا تعاون اسی طرح برقرار رہے گا۔)

(ادارہ)

حیدر نایاب

آج کے انسان کا المیہ!

وہ وحدت الوجود جو
رچا بسا ہوا ہے میری ایک ایک سانس میں
ہر ایک پل حیات نو سے کر رہا ہے سرفراز،
وہ حکمرانِ کائنات
جو میری آنکھ کی ہے آنکھ اور میرے دل کا دل
مرے خیال کا خیال اور بیان کا بیان
مرے شعور کا شعور،
وہ جس نے بن کے روح
میری آنکھ میرے ذہن و دل، میری زبان و عقل کی۔
مجھے بنا دیا ہے چشمۂ نشاطِ رنگ و بو
عطا کیا ہے جس نے اقتدار کائنات پر
میں اس کے سامنے ہوں کیا؟
مری بساط کیا ہے کوئی مجھ کو یہ بتائے تو؟!
نہیں نہیں ـــــ

میں وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو مجھ کو ہم نشیں۔
میں حاملِ وفا نہیں
میں راضی بہ رضا نہیں
میں بندۂ خدا نہیں
میں سایۂ ہما نہیں۔
میں جذب ابتدا بھی، پہ وصفِ انتہا نہیں
ہوں پیکرِ غرور، نقشِ عجز و التجا نہیں
ہوں جھوٹ کا میں راز داں
میں سچ کا دیوتا نہیں
نہیں نہیں ـــــ
بنوں میں نقشِ جاوداں یہ میری آرزو نہیں
بنوں میں حق کا ہم عناں یہ میری جستجو نہیں
شبیہہ ہوں میں روشنی کی، ظلمتوں کا عکس ہوں
لبادۂ خلوص میں شرارتوں کا رقص ہوں۔

بٹ میرا یہ بانکپن
بٹ یہ علم و فکر فن
یہ دل تپیدہ کا نشاں ملے تو کیا ملے۔
جل کے راکھ ہو گیا ہو اس کا کیا پتہ ملے!
یہ تحفۂ حیات، یہ عطائے چشم التفات
رم یہ جس کا ہے میں آخر اس کو کیا جواب دوں۔
میں کیسے آدمی بنوں
میں کیسے آدمی بنوں
میں کیا کروں، میں کیا کروں
میں کیا کروں، میں کیا کروں ــــ!!

تجزیے

(۱) ل۔ احمد اکبر آبادی

آپ نے منسلکہ نظم پر مجھ سے تبصرہ کرنے کی فرمائش کی ہے۔ اس عزت افزائی کے لئے شکر گزار ہوں مگر ساتھ ہی سمجھتا ہوں کہ میں تعمیل ارشاد کر سکنے کا اہل نہیں ہوں۔ آپ واقف ہیں کہ میں شاعر نہیں ہوں۔ اس لئے شعر شاعری پر تبصرہ کرنے کا اہل بھی نہیں ہوں۔ آپ شاید جوش اور پرویز مرحوم کے مجموعوں پر میرے پیش لفظ کا حوالہ دیں گے۔ مگر اس باب میں میرا عذر یہ ہے کہ وہ میرے ذاتی تعلقات اور نجی محسوسات کے تقاضے کا نتیجہ تھے۔ علاوہ بریں شعر و ادب کے بارے میں میں قدامت پرست واقع ہوا ہوں۔ زبان کے معانی علم و بیان کا اتباع مستلزم مانتا ہوں۔ جمہور ارسطو سے لیکر آج تک مسلمہ اصول نقد ادب کی تعمیل کے بغیر ادب کی تحقیق کو نا ممکن باور کرتا ہوں۔

نقد ادب کے چار گانہ اصول یعنی تجزیہ (احساس) اظہار نیابت اور ابلاغ (تاثیر) آج بھی دنیائے ادب میں مستند مانے جاتے ہیں۔ اس موضوع پر پروفیسر ابسر کرومبی کی تصنیف "اصول نقد ادب" آج بھی ہماری یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ حیرت اس پر ہے کہ ہمارے نوجوان شعراء کالجوں میں اس کتاب کو پڑھتے ہیں اور سخنوری کے میدان میں جب اترتے ہیں تو اسے اپنے ذہنوں سے یکسر محو کر دیتے ہیں۔ محو ہی نہیں کر دیتے۔ بلکہ انکار کر دیتے ہیں:

مجھے بتایا گیا ہے کہ جدیدیت کے پیرو شعراء کا دعویٰ ہے کہ انکا مقصود ابلاغ ہی نہیں۔ یہ اگر غلط نہیں تو ان سے پوچھا جائے کہ پھر آپ لوگ اپنا کلام مجلسوں میں سناتے کیوں ہیں اور ماہناموں میں شائع کیوں کراتے ہیں؟ ابلاغ اگر مقصود نہیں تو اپنا کہا گنگنا کر خود ہی داد دے لیا کریں۔"

میرے نزدیک شعر میں نغمگی شرط اوّل ہے۔ اوائل صدی میں اردو شعراء نے نظم معریٰ پر کچھ توجہ دی تھی۔ اس میں بہرحال وزن ہوتا ہے۔ اور اس طرح کلام موزوں کی شرط پوری ہو جاتی تھی۔ مگر وہ صنفِ شعر اردو میں مقبول نہیں ہو سکی۔ اس کے برخلاف جدید شاعری میں جملوں اور فقروں کا مفہوم بھی عنقا ہوتا ہے۔ میرے اس خیال کی تائید کرنے والے آپ کو بہت مل جائیں گے۔

اس نظم کو پڑھنے کے بعد میرا اولین تاثر کچھ ایسا ہے کہ:

" نظم کا عنوان "آج کے انسان کا المیہ" ہے۔ مگر یہ المیہ اگر ہے تو صرف آج ہی کے انسان کا نہیں، تو ہر انسان کا المیہ ہے۔ اور اس وقت سے انسان نے سوچنا شروع کیا اللہ تعالیٰ نسل انسان تک باقی رہنے والا المیہ ہے۔ اس نظم میں جو تصورات و محسوسات بیان کئے گئے ہیں وہ میں سمجھتا ہوں کہ ہر زبان اور زمانے کے شعراء متنوع شکلوں میں بیان کرتے آئے ہیں۔ اردو فارسی میں تو مختلف پیرایوں میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔

ایک قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ "وحدت الوجود" شاعر کی ہر سانس میں رچا بسا ہونے کے باوجود شاعر پوچھتا ہے کہ میں آدمی کیسے بنوں؟ اور پھر کمال درجے بے بسی میں پکار کر کہتا ہے کہ "میں کیا کروں؟" میری ناچیز رائے میں وجود [illegible]

سے اتنا قریب محسوس کرتا ہو وہ بنا بنایا آدمی ہے۔" میں ایسکے سامنے ہوں کیا؟" اس تقابل کا جواز بھی نظم کے اندر واضح نہیں ہوا ہے۔

اپنی جگہ میں سمجھتا ہوں کہ میری عمر اردو زبان سیکھتے گزری [illegible] نظم کے ایک مصرعے میں "جذب ابتدا" اور "وسعت انتہا" کی ترکیبوں کی معنویت کو پہنچنے میں بکھرنا کام رہا۔ یہ یقیناً کہوں گا کہ اس نظم کے جملوں اور فقروں کے معانی و مفہوم بالکل واضح نہیں۔ اور بیان کی روانی مستحق تحسین ہے۔ یہ تاثرات۔ بہرحال ایک ایسے شخص کے ہیں جو "دقیانوسی" ہونے کا معترف ہے اور اس پر شرماتا بھی نہیں ہے۔

---

(۲) ابنِ فرید

نظم "آج کے انسان کا المیہ" مذہبی قدر اخلاق کی ناسپاسی کا اعتراف یا (CONFESSION) ہے احساس جرم یا (GUILTY CONSCIENCE) شاعر کے ذہن پر اس قدر حاوی ہے کہ وہ مثبت اور منفی افکار کی کشمکش کا نشانہ بن گیا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا واقعی شاعر ذاتِ واحد کی طرف مراجعت کو شکستِ باطن کا مداوا تصور کرتا ہے؟ نظم اتنی واضح اور راست انداز میں ہے کہ جواب بغیر کد و کاوش مثبت ہی فراہم ہوتا ہے۔ شاعر ایسا کیوں سمجھتا ہے۔؟ ممکن ہے اکثر قارئین اس پہلو پر شدید تنقید کریں، لیکن میں شاعر کو اس کے حق سے محروم کرنے کو انصاف تصور نہیں کرتا۔ اسے پورا حق ہے، وہ جس طرح چاہے اپنے داعیہ کا اظہار کرے۔ میرے نزدیک سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس نے اپنے داعیہ کو فنی نقطۂ نظر سے کس پختگی بدرجۂ کمال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس لئے میں اسی پہلو کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔

نظم کو بہ آسانی چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا حصہ، حکمرانِ کائنات کی تعریف میں ہے۔ اسی حصہ کے آخر میں شاعر نے اس امر کو بیان کیا ہے۔ کہ انسان کو اقتدار کائنات خدا نے ہی عطا کی ہے۔"

دوسرے حصہ میں انسان ایک نافرمان ہستی کی طرح ا[illegible] ہے۔ وہ ہر اس توقع کو توڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ جو اس سے افضل المخلوقات کی حیثیت سے قائم کی جا سکتی تھی۔

تیسرے حصے میں انسان غیر معمولی طور پر قنوطیت ز[illegible] نظر آتا ہے۔ اور آخری حصہ میں وہ اپنی اخلاقی اصلاح کے [illegible] عالم مایوسی میں سوال کرتا ہے۔ مکرر سوال وہ نظم بیان سے [illegible] ہو کر استفہام پر ختم ہوتی ہے۔

پہلا سوال دو مرتبہ دہرایا جاتا ہے لیکن دوسرا سوال چار مرتبہ! گویا اصل سوال یہ نہیں ہے کہ وہ آدمی کیسے بنے ر[illegible] بنیادی الجھن کہاں تک حق بجانب ہے؟ اسے بھی بحیثیت قا[illegible] نظر انداز کیجئے! توجہ اس طرف منعطف کیجئے کہ پوری نظم کے سانچے میں اچانک یہ سوال فطری طور پر ابھرتا ہے یا نہیں! میرے خیال میں اس معاملہ میں مایوسی ہوتی ہے۔ آپ کہیے کہ بنیں اور کیا کریں؟ ہمیں نہ تو اس کا نسخہ معلوم ہے اور نہ ہم اس نسخہ کی تلاش کے لئے سرگرداں ہو سکتے ہیں، کیونکہ شاعر کے پیش کردہ سوالات نظم سے باہر جا پڑتے ہیں۔ نظم اس سے پہلے ہی کہیں ختم ہے۔ جس کا شاعر کو احساس نہیں ہوا کیونکہ اس کے لاشعور پر سوالات کا اژدحام رہا ہے۔ اور انھیں کسی نہ کسی طرح سے نظم میں محبوس کرنا ضروری سمجھتا رہا ہے۔ کیا سوالات کے بجائے خود پوری نظم ایک سوال نہیں بن سکتی تھی؟"

اس میں شاعر بار بار انسان کی اخلاقی حیثیت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور باری تعالیٰ اسے سرتابی کو بڑی تحقیر کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ہمارے دینی اخلاقی ادب میں انسان کو معلون کرنے کا یہ انداز بہت عام رہا ہے۔ اسی انداز کو مادی دہریوں نے بھی من و عن قبول کر لیا۔ چنانچہ دینی ادب میں جہاں ایک طرف خدا کی تعریف اور بندہ کی تنقیص کی جاتی تھی وہاں مادی دہریہ ادب میں خدا اور بندہ دونوں پر بیک وقت سب و شتم روا رکھا جاتا ہے۔ گویا انسان بحیثیت انسان کسی [illegible]

تحقیر و تذلیل سے نجات نہ پا سکا۔ یہ ایک مسئلہ ہے جس کی طرف شاید کبھی توجہ دی جائے کہ جسے فرشتے سجدہ کریں کیا وہ کبھی اعترافِ ذات کا مستحق بھی ٹھہرے گا۔؟ میں اس نظم کو پڑھنے کے بعد پھر اسی کشمکش کا شکار ہو گیا ہوں۔

نظم کا آہنگ بہت تیز رفتار ہے۔ ایک لفظ کی منزل ہوتی ہوئی آواز میں سے دوسرا لفظ بڑے واضح انداز میں ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ صوت کے زیر و بم میں مدغم ہوتی ہوئی آواز کی بازگشت بڑی طرب انگیز معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس محفل صدا صد میں مترادف اور ہم معنی الفاظ و فقرات رکاوٹ پیدا کر دیتے ہیں۔ کاش تکرار کا اہتمام نہ کیا گیا ہوتا۔

"وحدت الوجود" تصوف کی ایک اصطلاح ہے۔ اس سے مراد "ذاتِ واحد" نہیں بلکہ وجود کو ذاتِ واحد میں مرکوز تصور کرنا ہے۔ اس طرح یہ اصطلاح کا غیر محتاط استعمال ہے۔

نظم یک سطحی ہے۔ اس لئے اس میں تہہ بہ تہہ معنی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔"

۳۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی

آپ کا خط اور آپ کی مرسلہ نظم موصول ہوئی۔ آپ نے مجھے اس نظم پر تبصرہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ مگر اس کے مصنف کا نام نہیں بتایا ہے۔ اگرچہ مجھے تصنیف ہی سے مطلب ہے اور مصنف سے کوئی واسطہ نہیں۔ بہرحال میں تو اندھیرے میں تیر چلا رہا ہوں۔ اب جو بھی اس کا نشانہ بن جائے۔

آپ کی ارسال کردہ نظم کا عنوان ہے "آج کے انسان کا المیہ" یہ نظم مختلف قسم کے جذبات و احساسات پر مشتمل ہے۔ نظم کے ابتدائی حصے میں وحدت الوجود کا ذکر ملتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق صوفیائے کرام تمام کائنات کو خدا کا وجود تصور کرتے تھے۔

وصالی خراسانی نے اپنے مندرجہ ذیل شعر میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ؎

دیگر بہ چشمان دل مبیں جز دولت
ہر چہ بینی بداں کہ مظہر او ست

اس اردو شاعر نے بھی مرسلہ نظم میں خدا کو "حکمرانِ کائنات" تصور کیا ہے۔ یہی خدا انسان کی سانس میں رچا بسا ہے اور اس کی آنکھ، ذہن، دل، زبان اور عقل پر چھایا ہوا ہے۔ اس کے بعد شاعر نے اپنی ہستی کا مقابلہ خدا کی ذات سے کیا ہے اور خود کو ہیچ قرار دیا ہے۔ اسی طرح اس نے عدم جسمانیت (DEPER-SONA LIZATION) کے نظریہ کو پیش کیا ہے۔ عدم جسمانیت وہم کی ایک قسم ہے۔ اس نظریے کو پہلی بار ڈوگس (Dogas) نے ۱۸۹۸ء میں پیش کیا ہے۔ اس کے بعد اس نظریے سے دیگر ماہرینِ نفسیات نے بحث کی۔

چنانچہ (A!P NOYES) نے (MODERN-CLINICAL PSYELIATRY) میں اس نقطۂ نظر کو واضح کیا ہے۔

اس نظم میں بھی عدم جسمانیت کا تصور ملتا ہے۔ اس کے بعد شاعر نے اپنی نظم میں غرور (CORCEIT) کا اظہار کیا ہے۔ جو ایک نرگسی رجحان (NARCISSISTIC EN) ہے۔ مگر اس کے بعد ہی اس نے اپنی انکساری (INFERIO-RITY COMPLEX) کو بھی پیش کر دیا ہے۔ نظم کے آخری حصے میں شاعر نے اپنی پریشانی (ANXIETY) کا اظہار کیا ہے۔ کیونکہ وہ آدمی بننا چاہتا ہے مگر بن نہیں سکتا ہے۔

اس نظم کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ شاعر کا ذہن الجھن میں گرفتار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں کئی انحرافات (DE GR ESSINS) نمودار ہو گئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس میں تضادات (CONTRADICTION) بھی موجود ہیں۔ مثلاً ؎

مشتبہ ہوں میں روشنی کی ظلمتوں کا عکس ہوں
پھول ... [illegible]

کامیاب ضرور ہے۔ مگر انحرافات اور تضادات نظم کے فطری ارتقار میں حائل ہو رہے ہیں۔ اور وحدت تصور کو پاش پاش کر رہے ہیں۔ اگر اس نظم میں انحرافات اور تضادات کی زیادتی نہ ہوتی تو یہ نظم کامیاب تر ہوتی۔

جہاں تک اس کے اسلوب کا تعلق ہے وہ کامیاب نہیں ہے۔ بلکہ بڑی حد تک خام اور ناقص ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نظم میں بعض الفاظ کا انتخاب سلیقہ کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کچھ مصرعے نہایت رواں دواں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مجموعی طور پر یہ نظم ہمارے دل پر گہرے اثرات ثبت کرنے سے قاصر ہے۔ میرا ذاتی نظریہ یہ ہے کہ آزاد نظم حسن روانی۔ موسیقی اور تاثیر کے اعتبار سے پابند نظم کے مقابل ہی نہیں آسکتی ہے۔ پابند نظم میں قافیہ اور ردیف کی وجہ سے ایک حسین تکرار پیدا ہوتی ہے۔ اور اسی تکرار کے ساز سے موسیقی کی دیوی ابھرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پابند نظم تاثر پیدا کرنے میں زیادہ کامیاب ہو جاتی ہے۔

اس کا تو امکان ہے کہ پابند نظم میں قافیہ اور ردیف کی بنا پر خیالات نظم کرنے میں کہیں کہیں دقت محسوس ہو۔ مگر ایک کہنہ مشق شاعر اس قسم کی دقتوں پر قابو حاصل کر لیتا ہے۔ البتہ ایک اوسط درجہ کا شاعر کچھ نہ کچھ دقت محسوس کر سکتا ہے۔ اس کے باوجود پابند نظم دائمی تاثرات پیدا کرنے میں زیادہ ہی کامیاب ہوتی ہے۔

اس نظم میں ایک املائی بھی غلطی ہے۔ اس میں "پتہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ چونکہ "پتا" ہندی لفظ ہے اس لئے اس میں "ہ" کے بجائے "الف" ہونا چاہئے۔ اگر یہ لفظ فارسی زبان کا ہوتا تو حرف "ہ" کا استعمال جائز ہوتا۔ بہر حال "پتا" کا املا الف ہی سے درست

۴۔ مناظر ہرگانوی :

انسان خلقت کے ریگستان کا ایک ناچیز ذرہ ہے۔ لئے اس نظم میں تشکیک اور بے چینی کا مضمون ہے۔ چونکہ ا کو اطمینان نصیب نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان اپنی کو نہیں پا سکتا اور وجود و عدم کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ آ انسان اسی "پیچ و تاب" کو سمجھنے کے درپے ہے۔ لیکن یہ ا المیہ ہے کہ جس قدر پیچیدگیوں کو حل کرنے کی کوشش کر اپنی حقیقت سے دور ہوتا جاتا ہے۔ موجود معدوم، یقین، وحدتِ صفات و ذات اور اختلاف و اشترا کے مضمون کو بیشتر شعراء نے قلم بند کیا ہے۔ اور ا ڈھنگ سے بیان کیا ہے۔

اس نظم میں شاعر اعتدال قائم نہیں سکا ہے۔ اور آج کے انسان کے المیہ کو سلیقے سے نہیں پیش کر سکا ہے۔

اس پوری نظم پر غالب کا یہ شعر بجا ہے۔ ؎

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے
جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں۔

جگناتھ آزاد

سینہ کہ ہے دفینہ

(گزشتہ سے پیوستہ)

راولپنڈی میں حاجی سید وحید الدین المتخلص بہ حاجی تاریخ گوئی کے فن میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ آپ نے ادھر ہم سے تاریخ کا مطالبہ کیا۔ ادھر مادہ تاریخ مصرعے کی صورت میں ان کی زبان پر موجود ہے۔ اپنی زندگی میں انھوں نے ہزاروں تاریخیں نکالی ہوں گی۔ "نقش دوام" کی بھی تاریخ انھوں نے نکالی۔ مصرع تاریخ تھا۔ "تابندہ باد نیّر لمعاتِ رشیدی۔"

(۱۳۵۰ھ)

کبھی کبھی والد سے ملنے کے لئے عبدالعزیز فطرت، اور امرتسری، اور آغا صدیق حسین ضیا بھی آجایا کرتے تھے۔ اور ضیا کم آتے تھے۔ فطرت مقابلتاً زیادہ۔ لیکن اتنا نہیں جتنا عدم۔ ان کا تو ہر روز کا معمول تھا۔

عدم صاحب بالعموم دفتر سے چھٹی ہوتے ہی سائیکل پر نکلتے تھے۔ ہمارے یہاں آجاتے تھے۔ رات کو بہت گئے رخصت ہوتے تھے۔ ان کے یہاں دوست مختار قریشی بھی ان کے ساتھ ہی ہوتے تھے۔ مختار قریشی اکثر ہمیں بتاتے تھے کہ رات کو بائیسکل میں لیمپ نہ ہونے کی وجہ سے عدم صاحب کا چالان ہوگیا۔

یہ صورتِ حال کوئی تین برس تک رہی اور میں راولپنڈی سے باہر نکلنے سے پہلے ہی ہندوستان کے شاعرانہ ماحول کی ایک ہلکی سی جھلک عدم اور والد کی تین برس کی گفتگو میں دیکھ چکا تھا۔ اس مختصر سے وقفے کے بعد عدم صاحب مصر چلے گئے۔ اور یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ لیکن میرے دل میں ذوقِ ادب اور ذوقِ مطالعہ کا جو شعلہ اس زمانے میں روشن ہوا تھا وہ بڑھتا ہی گیا۔

عبدالعزیز فطرت مرحوم راولپنڈی کی ادبی محفلوں کی جان تھے۔ شہر میں انجمن ترقی اردو کا قیام اور پہلے یوم اقبال کا انعقاد انھیں کی کوششوں کا مرہونِ منت ہے۔ اس یوم اقبال کا انعقاد ، ڈی۔ اے۔ وی کالج میں ہوا۔ اور دوسرے دن گارڈن کالج میں۔ ممکن ہے اتنا بڑا جلسہ لاہور یا حیدرآباد میں منعقد ہوا ہو۔ لیکن امکان نہیں کہ کسی اور شہر میں اسی طرح دو دن تک مسلسل یوم اقبال منایا جاتا رہا ہو۔ اور اس ساری کامیابی میں عبدالعزیز فطرت کا خلوص اور ان کی شبانہ روز کی دوڑ دھوپ کارفرما تھی۔ میں نے اس میں اپنا مقالہ "اقبال کی منظر نگاری" پڑھا جو شیخ سر عبدالقادر مرحوم کو اتنا پسند آیا کہ وہ اسے اپنے ساتھ لاہور لے گئے اور اسے "ہمایوں" میں شائع کرایا۔ بعد میں یہ "ہمایوں" سے "ادبی دنیا" میں نقل ہوا۔

؎ [illegible] گزشتہ [illegible] میں [illegible] ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بہرالمسنہ پزفطرت ہی کے اصرار پر میں نے باقاعدہ طور پہ انجمن کی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ گارڈن کالج ہماری سرگرمیوں کا جولانگاہ تھی۔ استاذی سید مقام حسین جعفری اردو کے پروفیسر تھے۔ ان کی وجہ سے ہمیں کالج میں ہر طرح کی آسانیاں میسر تھیں۔ ہر پندرہویں بیسویں دن ہم وہاں کوئی نہ کوئی ادبی جلسہ منعقد کر دیا کرتے تھے۔ جب کوئی موضوع نہ ملتا تو طرحی یا غیر طرحی مشاعرے کا ہم لوگ انعقاد کر دیتے تھے۔ والد بھی ان مشاعروں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ اگرچہ ہمارا مکان گارڈن کالج سے بہت دور تھا۔ عدم صاحب کرکٹ کے میدان سے سیدھے مشاعرہ گاہ میں پہنچتے تھے۔ اکثر وہ کرکٹ کا بیٹ ساتھ ہی لے کر آتے تھے۔

صدیق حسن ضیا ان مشاعروں کی ایک خاص شخصیت تھی۔ ان کی شاعری فلسفیانہ شاعری تھی۔ انداز بیان سلجھا ہوا، اور ژولیدگی سے پاک تھا۔ فلسفیانہ افکار کو وہ بڑی خوبصورتی سے نظم کرتے تھے۔ ان کی ژرف نگاری اردو شاعری کے لئے بڑی دولت تھی۔

افسوس ہے کہ ان کا کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا۔ ہاں دو مثنویاں جو قریباً دو، دو سو اشعار پر مشتمل تھیں۔ "مقام محمود" اور "ہبوط آدم" کے نام سے شائع ہوئی تھیں۔

برج لال رعنا انہیں کے شاگرد ہیں۔ اگر رعنا صاحب کہیں سے اپنے استاذ کا کلام ڈھونڈ ھ نکالیں اور اس کی اشاعت کا بندوبست کر دیں تو یہی نہیں کہ استاد مرحوم کی روح کھشا دو کام فرمائیں گے۔ بلکہ اردو ادب پر بھی ان کا بہت بڑا احسان ہوگا۔

زندگی میں ضیا صاحب کی کوئی قدر نہ ہوئی۔ لیکن جیسا کہ ہم مردہ پرستوں کا دستور ہے۔ ان کی موت کے بعد ان کی یاد میں سالانہ جلسے منعقد ہونا شروع ہو گئے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو "مقام محمود" اور "ہبوط آدم" دونوں ان کی موت کے بعد شائع ہوئیں۔

مجھے یاد ہے کہ تقسیم ہند تک ضیاؔ صاحب کی برسی بڑی باقاعدگی سے راولپنڈی میں منائی جاتی رہی[1]۔ بعد میں مجھے معلوم نہیں کہ ان کی یاد منانے کا یہ سلسلہ جاری رہا یا نہیں غالباً جاری رہا ہوگا اور اب بھی منائی جاتی ہوگی۔ کیونکہ برسیاں منانے کے فن میں ہم ہندوستانی اور پاکستانی بڑے ماہر ہیں۔ جوش نے کیا عمدہ کہا ہے۔ ؎

تا قبر پہ ناقدانِ گل پھول پڑھائیں
خوبانِ سمن عذار موتی برسائیں

کہتا ہے مرا وطن یہی اب مجھ سے
حضرت آپ انتقال ہی فرما جائیں

اسی زمانے میں میں نے ایک بہت بڑی شخصیت کو دیکھا اور وہ شخصیت تھی رابندر ناتھ ٹیگور۔

غالباً ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ ٹیگور لاہور تشریف لائے وشوا بھارتی کے لئے چندہ جمع کرنے۔ بریڈلا ہال میں ان کے اعزاز میں ایک مشاعرہ ہوا۔ سروجنی نائیڈو کی صدارت

---

[1] والد محترم کی یہ رباعیات ضیا صاحب کی پہلی برسی کی یادگار ہیں۔

ایک شاعر خوش نوا کی برسی ہے آج اک صوفی باصفا کی برسی ہے آج
تازہ صدمہ ہے اہل دل کے دل پر صدیق حسن ضیا کی برسی ہے آج

اللہ رے آب و تاب اشعار ضیا تھی ابر رواں طبع گہر بار ضیا
ہیں دیدہ و دل آج بھی روشن اس سے اشعار ضیا تھے کہ تھے انوار ضیا

مدعو شعراء کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے باہر سے صرف تین شعراء کو مدعو کیا گیا تھا۔ جوش ملیح آبادی، اور ساغر نظامی غالباً پونا سے آئے تھے۔ اور والد محترم راولپنڈی سے۔ جوش صاحب نے اپنی نظم "پروگرام"۔۔۔

آئے شخص اگر جوش کو تو ڈھونڈنا چاہیے"

ترنم سے پڑھنے کی کوشش کی لیکن چل نہ سکے۔

ہال میں دس ہزار افراد کی جگہ اور اس میں بیس ہزار کا مجمع۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ پولیس امن قائم کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ والد صاحب نے اپنی نظم "شاعرِ اعظم کے نام" شروع کی۔ انھوں نے صرف پہلا بند جو پانچ سات اشعار پر مشتمل تھا پڑھ کے بیٹھ جانے میں مصلحت دیکھی۔

ساغر نظامی واحد شاعر تھے۔ جنھوں نے رنگ جما دیا۔ انھوں نے "بھکارن" پڑھی۔ آواز میں جادو کا اثر تھا۔ آپ مشاعرے پر چھا گئے۔ بعد میں ڈاکٹر ٹیگور نے اپنی بنگالی نظم سنائی۔ نظم تو کسی کی سمجھ میں کیا آتی آواز کا طلسم اپنا کام کر رہا تھا۔ ہال میں ایک سناٹا تھا سننے والے یوں جھوم رہے تھے۔ جیسے سپیرے کی بین پر سانپ جھومتا ہے۔

کئی برس بعد اسی بریڈلا ہال میں میں نے ایک اور نقشہ دیکھا۔ کانگریس کے زیرِ اہتمام مشاعرہ منعقد ہوا۔ حفیظ جالندھری اور ساغر نظامی اس مشاعرے کے دو ممتاز شاعر تھے۔ انوار صابری نئے نئے مشاعروں میں قدم رکھ رہے تھے۔

راقم الحروف ایک تو مبتدی تھا۔ دوسرا جس کالج میں زیرِ تعلیم تھا اس کے ضابطہ کے مطابق کانگریس کے جلسے میں شریک نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے صفِ سامعین سے آگے نہ بڑھ سکا۔ یہ مشاعرہ حفیظ جالندھری کے ہاتھ رہا۔ انور صابری نے بھی اچھی داد پائی۔ انھوں نے سیاسی انداز میں غزل پڑھی تھی۔ ساغر نظامی نے وہی نظم "بھکارن" شروع کی۔ اور وہ نظم جو ایک بار اسی بریڈلا ہال میں طلسم بن کے چھائی تھی اب کے شاعر کے ہوٹ ہو جانے کا باعث بنی۔

ساغر صاحب تین چار بار مائیکروفون پر تشریف لائے اور ہر بار سامعین نے ان کے ساتھ ایک سا سلوک کیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ بعض لوگوں نے ساغر صاحب کے خلاف سازش کی تھی۔ اور ساغر صاحب کی نظم "بھکارن" اسی سازش کا شکار ہو گئی۔[۲]

ڈی۔اے۔وی کالج سے ایف۔اے کا امتحان پاس

(بقیہ صفحہ ۵۸ کا)

تھا سوئے چمن بادِ صبا کا آنا   یا دل میں یادِ دلربا کا آنا

بھولے گا نہ اربابِ سخن پرور کو   بزمِ شعراء میں وہ ضیا کا آنا

ٹوٹے ہوئے ساز کی صدا باقی ہے   مٹے اڑ گئی اور اس کا نشاں باقی ہے

ہر چند ہے خوابیدہ تہِ خاکِ ضیا   ہنگامہ محفل میں ضیا باقی ہے

[۱] مقامی شعراء میں قابلِ ذکر حضرات پنڈت ہری چند اختر اور احسان دانش تھے۔ ہری چند اختر تو بھیڑ بھڑکے باعث ہال کے اندر داخل ہی نہ ہو سکے۔ سرو جنی نائیڈو ہری چند اختر کے مداحوں میں تھیں۔ انھیں جب پتہ چلا کہ ہری چند اختر باہر رہ گئے ہیں تو انھوں نے خاص طور پر ان کا نام لے کر باآوازِ بلند پکارا لیکن وہاں تو یہ صلائے عام کی سنتا کون ہے، نقار خانے میں طوطی کی بات تھی۔ منتظمین نے پنڈت جی کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ واپس جا چکے تھے۔

حفیظ جالندھری ان دنوں حج کے لئے گئے ہوئے تھے۔ اہلِ لاہور نے اتنے بڑے مشاعرے میں ان کی کمی خاص طور سے محسوس کی۔ اس وقت ہم نے سنا یہ تھا کہ علامہ اقبال اپنی وضع کے خلاف اس مشاعرے میں شریک ہوں گے۔ کیونکہ یہ ایک لحاظ سے اپنے مرتبے کے شاعر کے اعزاز میں منعقد ہو رہا تھا۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ ایک ضروری کام سے لاہور سے باہر تشریف لے گئے ہیں۔ (بقیہ صفحہ ۔۔۔ پر)

کرنے کے بعد میں بی۔ اے میں آیا تو اسی گارڈن کالج میں داخلہ لیا۔ گارڈن کالج میں میں نے دوستوں کے ساتھ مل کر بزم ادب کی بنیاد ڈالی۔ اس کالج میں اگرچہ طلبا کی طرف سے ادبی اجلاس اکثر منعقد ہوا کرتے تھے۔ لیکن باقاعدہ طور پر اردو کی کسی بزم کی تشکیل ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ کالج کے وائس پرنسپل ریورینڈ جے، پی، کمنگز امریکی پادری تھے۔ اور اردو سے انھیں بہت دلچسپی تھی۔ انھوں نے بزم کی سرگرمیوں کو ہمیشہ سراہا اور اس کی ہمت افزائی کی۔ ہم لوگوں نے اس بزم کے زیر اہتمام اکثر مشاعرے اور اجلاس جن میں یوم پریم چند خاص اہمیت رکھتا ہے۔ منعقد کیے۔ کالج میگزین کا میں ایڈیٹر تھا۔ اس میں میرے اشعار شائع ہوا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ "ادبی دنیا" (لاہور) اور "زمانہ" (کانپور) میں میرا کلام شائع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ منشی دیا نرائن نگم اور مولانا صلاح الدین احمد کی حوصلہ افزائی کا اس موقع پر ذکر نہ کرنا ایک طرح کی احسان ناشناسی ہوگی۔[3]

(بقیہ صہ۔ کا) علامہ اقبال کی اس غیر متوقع غیر حاضری کا لاہور کے بعض ہندو اخبارات نے برا مانا اور انھوں نے نظم و نثر میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا کہ اقبال بربنائے حسد لاہور سے باہر چلے گئے ہیں۔ کاش ہندو صحیح معنوں میں اقبال کی عظمت اور مسلمان مفکر کے مقام سے واقف ہو سکتے۔!

[1] مجھے اس کا مطلع ابھی تک یاد ہے ؎

غلام قوم کا دل بھی غلام ہوتا ہے ۔۔۔ غلام قوم کا سجدہ حرام ہوتا ہے

[2] ساغر صاحب کے خلاف یہ سازش پنجاب اور یو۔ پی کے شعرا کی باہمی رقابت کا ایک شاخسانہ تھی۔ اردو مرکز کے زمانے میں مولانا تاجور نجیب آبادی نے یو۔ پی کے متعدد نامور شعرا اور ادبا مثلاً مولانا سیماب اکبرآبادی، حضرت ساغر نظامی، حضرت جگر مرادآبادی اور حضرت اصغر گونڈوی کو لاہور بلوا کر ان کا تقرر اردو مرکز میں کرا دیا تھا۔ پنجاب کے بعض شعرا کو جن میں حفیظ جالندھری، پنڈت ہری چند اختر، مولانا سالک مرحوم اور ڈاکٹر تاثیر مرحوم خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مولانا کا یہ رویہ بہت ناگوار گزرا تھا چنانچہ صوبوں کے شعرا میں باہمی چپقلش کا ایک دور چل نکلا جس کا مظاہرہ علمی ادبی دنیا میں بالعموم اور مشاعروں میں بالخصوص نظر آ جاتا تھا۔

[3] مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کے ساتھ اپنے دیرینہ تعلقات کے بارے میں میں نے ایک مقالہ ان کے انتقال پر لکھا تھا۔ یہ "ادبی دنیا" لاہور کے صلاح الدین نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔

مذکورہ مقالہ مولانا مرحوم کی شخصیت کے بارے میں ہے۔ اور زیر تحریر روداد کا تعلق بھی ادبی مباحث سے نہیں ہے۔ لیکن مولانا کے بارے میں ایک خاص بات کا ذکر جو شاید اس مقالے میں بھی میں نے نہیں کیا ضروری ہے اور وہ ہے افادی ادب کے بارے میں مولانا کا نظریہ۔ افادی یا مقصدی ادب سے متعلق ان کے ساتھ جب بھی بات ہوئی انھوں نے "مقصدیت" کو فن کا دشمن قرار دیا۔ اس نظریے کی تائید میں نہایت خوبصورت جملے ان کے قلم اور ان کی زبان سے نکلتے تھے۔ ایک بار کہنے لگے کہ "ایوان ادب کی محراب پر یہ بات جلی حروف میں لکھ دو کہ جب مقصد ایک دروازے سے داخل ہوتا ہے۔ تو فن دوسرے دروازے سے رخصت ہو جاتا ہے"
ایک اور موقع پر دوستوں کی محفل میں انھوں نے فرمایا۔

"فنی ادب اور افادی ادب میں بنیادی فرق ہے ـــــ ایک ایسا فرق جو ایک نادرہ کار مصور اور ایک ہوشیار کلرک میں ہوتا ہے۔ اور ہر ابھرنے والے ادیب کو اس فرق سے آشنا ہونا چاہیے۔"

ـــ ؕ ـــ

راولپنڈی کی ادبی شخصیتوں میں یوں تو کئی نام اس داستان میں شامل ہونے سے رہ گئے ہوں گے۔ لیکن ان میں ایک نام ایسا بھی ہے۔ جس کے بغیر اس زمانے کی راولپنڈی کا ادبی ذکر نامکمل رہے گا۔ اور یہ نام ہے فضل الرحمٰن اشک کا۔

مجھے یاد نہیں کہ فضل الرحمٰن اشک ہماری ادبی سرگرمیوں میں کبھی شریک ہوئے ہوں۔ لیکن ان کا تعاون ہمیں ہر لمحہ اور ہر قدم پر حاصل تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان کے نکھرے ہوئے ادبی ذوق کی وجہ سے ان کی دکان ایشیاٹیک اوپٹیکل ورکس ہم لوگوں کے لئے کعبہ مقصود تھی۔ ایشیاٹیک اوپٹیکل ورکس آج بھی راولپنڈی میں ایڈورڈز روڈ پر موجود ہے۔ اور پاکستان بننے کے بعد اس کی ایک شاخ اس وقت کراچی میں ہے۔ ہمارے دوست اشک صاحب کراچی کی شاخ کے مالک و منتظم ہیں۔

اشک صاحب مہینوں میں ایک ادھ غزل کہتے ہیں۔ لیکن انتہائی پاکیزہ و شستہ اور بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ۔ اپنا کلام یہ رسالوں کو نہیں بھیجتے۔ محض احباب ہی کو سناتے ہیں۔ اور بڑی خوبی ان کی غزل کی یہ ہے کہ اس کے اکثر اشعار ان کے احباب کو زبانی یاد رہ جاتے ہیں۔

بی۔ اے کے بعد میں راولپنڈی سے چلا تو لاہور کی کھلی فضائیں پرواز کے لئے موجود تھیں۔ یہاں کا ہر فرد ایک انجمن اور ہر گوشہ ایک بساطِ ادب تھا۔ یہاں کی قد آور شخصیتوں میں سب سے پہلے ملاقات مولینا تاجور نجیب آبادی سے ہوئی۔ ان کے مشورں اور فیض صحبت کے متعلق مجھے یہی کہنا ہے کہ ؎

"جو بیٹھو با ادب ہو کر تو اٹھو با خبر ہو کر"

مولنا کی خدمت میں مجھے کرپال سنگھ بیدار لے کر گئے تھے کرپال سنگھ بیدار سے تعارف، وقار انبالوی کے ذریعہ سے ہوا تھا اور وقار انبالوی سے میں لاہور آنے کے بعد خود ملنے جا کر ملا تھا۔ ان سے "چندن" (لاہور) کی ایڈیٹری کے زمانے میں وقار انبالوی نے والد محترم کی کتاب "گنج معانی" پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو مجھے بہت پسند آیا تھا۔ اور میں نے ان کے ساتھ ایک دلی قرب محسوس کیا تھا۔

مولنا اس زمانے میں مزنگ والے مکان میں رہتے تھے۔ جب میں اور بیدار وہاں پہنچے تو ایک صاحب وہاں پہلے سے بیٹھے تھے۔ یہ صاحب کمیونزم کے موضوع پر مولینا سے گفتگو کر رہے تھے۔ اور انہیں کمیونزم کی خوبیوں سے واقفیت بہم پہنچا رہے تھے۔ ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ آپ گوپال متل صاحب ہیں۔ مولینا کی سیاسیات پر زیادہ گہری نظر نہیں تھی۔ وہ جواب میں یہ کہہ رہے تھے کہ میاں! کمیونسٹ برسر اقتدار آئیں گے تو سب سے پہلے تمہیں ہی نشانہ بنائیں گے۔ کیونکہ تم سوٹ پہنتے ہو اور ٹائی لگاتے ہو۔ خدا معلوم مولینا کے دماغ میں کمیونسٹ کا کیا تصور تھا۔

مولینا کے ساتھ اس وقت کیا باتیں ہوئیں۔ مجھے تفصیل سے یاد نہیں۔ غالباً میرے ساتھ ان کی پہلی کم بات ہوئی زیادہ تر وقت وہ بیدار اور متل سے باتیں کرتے رہے۔ مجھ سے انہوں نے والد کی خیریت پوچھی اور یہ بھی پوچھا کہ تم بھی شعر کہتے ہو۔ میں ابھی جواب کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ بیدار صاحب نے کہا۔

مولینا! آپ نے "ادبی دنیا" میں ان کا کلام نہیں دیکھا؟ ان کا کلام "زمانہ" کانپور میں بھی چھپا ہے۔ "ہمایوں" میں ان کا ایک مقالہ اقبال کی شاعری پر شائع ہو چکا ہے۔ مولینا نے میری طرف کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے بیدار صاحب کی کسی بات کا انہیں یقین نہ آ رہا ہو۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم لوگ وہاں سے اٹھ آئے۔ واپسی پر گوپال متل بھی ہمارے ساتھ تھے۔ بیدار صاحب کا قیام ریلوے روڈ کے ایک ہوٹل میں تھا۔ وہ ہم دونوں کو اسی ہوٹل میں لے آئے۔ وہاں ہم نے کھانا کھایا اور کافی رات گئے ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔

نئے ابھرنے والے شعراء میں قتیل شفائی کا نام بڑی

سے سامنے آرہا تھا۔ قتیل کا کلام میں پڑھ چکا تھا۔ نام سن چکا تھا۔ ان سے ملنے کا مجھے اشتیاق بے اندازہ تھا۔

ایک بار میں دو ایک چھٹیوں میں لاہور سے واپس راولپنڈی گیا تو عبدالعزیز فطرت نے میری آمد کے سلسلے میں ایک نشست کا انتظام کیا۔ گارڈن کالج میں اس میں قتیل سے میری ملاقات ہوئی۔ پہلی ہی ملاقات میں مجھے محسوس ہوا جیسے قتیل سے میری مدتوں سے دوستی ہے۔ قتیل نے اپنا کلام سنایا۔ میں نے اپنا کلام بھی سنایا اور والد کا بھی۔ کیونکہ والد اس جلسے میں مدعو تھے۔ اور مجھ سے ان کا کلام بھی سنانے کی بھی فرمائش ہوئی تھی۔ مجھے یاد ہے میں نے ان کی نظم "نور جہاں کا مزار" پڑھ کر سنائی تھی۔

قتیل نے اس ملاقات میں اپنی ملازمت سے بیزاری کا اظہار کیا اور بتایا کہ میں ہزارے سے لاہور منتقل ہو جانے کے لئے کسی موقع کے انتظار میں ہوں۔ میرا مقصد فلم لائن میں جانے کا ہے۔ لیکن لاہور میں قدم جمانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے کسی رسالے کی ایڈیٹری مل جائے۔

باتوں باتوں میں یہ بھی معلوم ہوا کہ قتیل نے ابھی تک لاہور نہیں دیکھا۔ صرف اس کے تصور ہی سے آشنا ہے۔ میں دو چار برس سے لاہور میں تھا۔ اور اس وقت تحریکِ رفاقت میں ملازم تھا۔ تحریک رفاقت کا مفصل ذکر تو اس کتاب میں کسی اور جگہ آئے گا۔ لیکن مختصر روداد میری ملازمت کی یہ ہے کہ میں تحریک کے سکریٹری مولوی ابراہیم علی چشتی کا پرسنل اسسٹنٹ تھا۔ تحریک کے زیر اہتمام جو ادبی جلسے یا مشاعرے منعقد ہوتے تھے ان کے انعقاد کے بارے میں مولوی صاحب بالعموم مجھ سے مشورہ کر لیا کرتے تھے اور اکثر میرے مشوروں کو اہمیت دیتے تھے۔ بعض اوقات وہ میرے مشوروں کو قطعی قابلِ قبول نہیں سمجھتے تھے۔ اور اپنی رائے پر بضد رہتے تھے۔ یہ ان کی طبیعت کے استحکام کا ایک خاص پہلو تھا۔

مثلاً تحریک رفاقت کے مشاعروں کو کامیاب بنانے کے خیال سے ایک بار میں نے ان سے کہا کہ ہمیں ابوالاثر حفیظ جالندھری سے مشاعروں میں شرکت کی درخواست کرنا چاہیئے۔ اوّل تو انھیں مشاعروں میں شرکت کے لئے کسی شاعر سے "درخواست" کرنے کی بات ہی پسند نہیں تھی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ جب تحریک کی طرف سے مشاعرے میں شرکت کے لئے حق الخدمت دیا جاتا ہے تو پھر درخواست کر کے کیا معنی دوسرا حفیظ صاحب کا نام سنتے ہی فوراً انھوں نے جواب دیا کہ "حفیظ پڑھتا اچھا نہیں ہے۔" اب اس کے بعد اس ... بات کی گنجائش ہی کہاں رہ گئی تھی کہ میں دوبارہ ان سے حفیظ صاحب کی مشاعرے میں شرکت کی بات کرتا۔[1]

بہرطور مولوی صاحب کی اس اصابتِ رائے کے باوجود میں کبھی کبھی انھیں مشاعروں کے بارے میں اپنا مشورہ دیدیا کرتا تھا۔ چنانچہ راولپنڈی میں قتیل شفائی سے ملاقات کرنے اور ان کا کلام سننے کے بعد جب میں لاہور واپس آیا تو تحریک کی جانب سے ملتان میں ایک مشاعرہ منعقد کرنے کی تجویز زیر غور تھی۔ میں نے اس مشاعرے کے لئے قتیل کا نام تجویز کیا۔ مولوی صاحب نے پہلے تو خوب ٹھوک بجا کر قتیل کے بارے

---

[1] یہ تو میں اس داستان میں شاید کہیں بیان کر بھی چکا ہوں کہ "ادبی دنیا" کا دفتر قیام لاہور کے دوران میں میرا ملجا و ماوا تھا۔ تقریباً ہر شام مولینا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر عاشق بٹالوی اور میراجی کے ساتھ وہاں بسر ہوتی تھی۔ اس شام کو جو میں وہاں پہنچا تو ان تین حضرات کے علاوہ حرماں خیرآبادی، قیوم نظر اور یوسف ظفر بھی وہاں موجود تھے۔ اتفاق سے بات چیت میں تحریک کے مشاعروں کا ذکر آیا۔ اس سلسلے میں جب میں نے یہ بتایا کہ ابوالاثر حفیظ جالندھری کے بارے میں مولوی ابراہیم علی چشتی کی رائے یہ ہے کہ "حفیظ پڑھتا اچھا نہیں ہے۔" تو ایک لمحے کے لئے تو وہاں حیرت کا عالم طاری ہو گیا۔ لیکن دوسرے لمحے ہی جو قہقہوں کا دورہ پڑا تو الہٰی توبہ۔ سنتے سنتے

مجھ سے پوچھا۔ کلام کیسا ہے۔ پڑھتا کیسا ہے۔ وغیرہ۔ جب میں نے ...رح سے اُن کی تسلی کر دی تو انھوں نے اپنے سامنے رکھی ہوئی ...زہ فہرست میں ان کا نام انگریزی میں اس طرح (QATIL) ...ہ کے شامل کر لیا۔ اور دو چار دن بعد فہرست شعرا کو قطعی ...رت دی جانے لگی۔ تو انھوں نے مجھ سے پوچھا۔ یہ قاتل کون اور اس کا نام فہرست میں کیسے آگیا۔

میں نے پھر اوّل سے آخر تک چار دن پہلے والی بات ...ھرا دی اور کہا کہ یہ ... تو قتیلؔ ہے۔ ممکن ہے مشاعرے ...ا شرکت کے وقت قاتل ہی نظر آئے۔ مولوی صاحب کو ...لے دن والی بات یاد آگئی۔ اور قتیل شفائی کو ہم لوگوں ...ا طرف سے ملتان سے مشاعرے میں شرکت کا دعوت نامہ ...پلا گیا۔

قتیل لاہور سے پہنچے تو بہت خوش تھے۔ ایک تو لاہور ...نے کی خوشی دوسرا لاہور سے ملتان اور ملتان سے واپس ...ہور تک میرے ساتھ سفر کرنے کی خوشی۔ اس زمانے میں ...دسری جنگ عظیم ہو رہی تھی۔ اور ریل کے ہر درجے میں وہ ...ھیڑ بھاڑ ہوتی تھی کہ الہٰی توبہ۔

اصل میں ریل کے زیادہ تر ڈبے فوجیوں کے لئے ...قف ہوتے تھے۔ باقی ماندہ دو چار ڈبوں میں تمام غیر فوجی ...سافروں کو گھسڑ مسڑ کر کے سفر کرنا پڑتا تھا۔ جس ڈبے میں

میں نے سفر کیا اس میں مجھے تو برتھ کے ایک کونے میں پڑنے کو جگہ مل گئی۔ لیکن قتیل کو اپنے بکس ہی پر بیٹھ کر سفر کرنا پڑا ملتان کے قریب ہی جو ایک اسٹیشن پر ریل رکی تو ایک نیا شادی شدہ جوڑا اس ڈبے میں داخل ہوا۔ بیٹھنے کی تو کہیں جگہ تھی نہیں اس لئے دولہا میاں تو اوپر کی برتھ کی زنجیر پکڑ کے کھڑے ہو گئے اور دلہن قتیل والے بکس کی باقی ماندہ جگہ کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ خدا جانے دلہن دولہا میاں سے پہلے ہی بیزار تھی یا قتیل کے عاشقانہ مزاج نے اپنا اثر دکھایا کہ اس نے ملتانی زبان میں قتیل سے فرمائش کر دی "میکو نسا گھن ونج" یعنی مجھے بھگا لے چل۔ قتیل اپنے بکس پر میری نشست کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ میں نے یہ سن لیا۔ اب وہ عجیب کشمکش و پیچ کے عالم میں تھا۔ اگر دلہن کی فرمائش کو ٹھکراتا ہے تو کسی غیر متوقع صورتِ حال کے پیدا ہونے کا فوری اندیشہ ہے اور اس کی بات مانے بھی تو کیسے۔ اس مجمع سے نکلنے کے لئے مجھ سے کہنے لگا۔ آؤ۔ تم یہاں آجاؤ۔ میں تمہاری جگہ بیٹھوں گا۔ میں نے کہا جہاں تم ہو میں وہاں تک کیسے پہنچ سکتا ہوں۔ اب وہیں رہو۔ مصلحتاً ہاں کر دو۔ ملتان قریب ہے۔ اس وقت بہت پڑے تو یہ کار مردانِ کر گزرو ورنہ آرام سے اتر کے میرے ساتھ چلو اور اس وقت جو کچھ دل پر گزر رہی ہے۔ اسے اپنی غزل یا نظم میں سمو کر اپنا

بقیہ صفحہ ۶۲) سب کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ حتیٰ کہ آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ قیوم نظر تو کرسی سے اچھل کے دور جا پڑے۔ ہر ایک باری ...ری اس فقرے کو دہراتا تھا ــــ حفیظ پڑھتا اچھا نہیں ہے ــــ اور پھر محفل ایک طوفانی قہقہے میں ڈوب جاتی تھی۔ یہ سلسلہ ...صی دیر تک جاری رہا اور اس کے مدتوں بعد بھی جب ہم میں سے کوئی ایک دوسرے سے ملتا تو ملاقات کی ابتدا اس فقرے سے ...تی تھی۔ "حفیظ پڑھتا اچھا نہیں ہے۔" اور پھر دونوں طرف سے طوفانی قہقہے بلند ہوتے تھے ــ

ہائے ہائے ــــ! اب کہاں وہ دور اور کہاں وہ قہقہے۔ ان میں سے اکثر تو اس دنیا سے بے نیاز ہو کر جس میں قہقہے بلند ہوتے ہیں۔ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکے ہیں۔ ؎

جو قیامت اٹھائے پھرتے تھے
گور سے ہیں وہ ... [illegible] ... ہے!

شاعرہ کو مشاعرہ امرتسر سے داد پائی۔

"نتیجہ میں ملتان آ گیا۔ اور قتیل انتہائی ڈرپوکوں کی طرح ریل کے ڈبے سے اترا۔ اور جیسے اس نے کوئی بہت بڑا جرم کیا ہو۔ منتظمین مشاعرہ کی نظروں سے بچتا ہوا مجھ کہیں پہلے پلیٹ فارم سے باہر آ گیا۔"

وقت گزرنے کے ساتھ قتیل کے ساتھ میرا رشتۂ محبت استوار سے استوار تر ہوتا گیا۔ مجھے قتیل کی شاعری اور شخصیت دونوں پسند آئیں اور یہ قرب اور تعلق خاطر روز بروز بڑھتا ہی گیا۔

آج ہم دونوں کے درمیان حدِ فاصل قائم ہونے کے باوجود قتیل میرا محبوب دوست ہے۔ ایسا دوست جس کی دوستی کو میں اپنے لئے ایک گراں بہا دولت سمجھتا ہوں۔ خدا اس سرد و گرم زمانہ سے محفوظ رکھے۔ اور اسے اور اس کے فن کو دونوں ملکوں میں اور زیادہ مقبول کرے۔

کرپال سنگھ بیدار کی اٹھان اپنی جگہ قیامت خیز تھی۔ ان کی نظموں نے جن میں "فریادِ شکستہ" خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ سارے پنجاب کو چونکا دیا تھا۔ مولینا تاجور کے شاگردوں میں اس اٹھان کے ساتھ شاید ہی کوئی شاعر منظر عام پر آیا ہو۔ حتیٰ کہ خاور اور احسان دانش بھی نہیں۔ لیکن بیدار کا وہ اندازِ کلام جس نے ایک بار پنجاب بھر کے ادیبوں اور شاعروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا دیرپا ثابت نہ ہوا۔

"خوش درخشید و لے دولت مستعجل بود" کے مصداق بیدار کا کلام اور نام دونوں ذہنوں سے محو ہونے لگے۔[1]

بیدار آج بھی شعر کہتے ہیں۔ لیکن اب وہ محض ایک وضع نبھا رہے ہیں۔ جن لوگوں نے بیدار کی وہ نظمیں دیکھی ہیں جو مولینا کے زمانے میں "شاہکار" میں شائع ہوئی تھیں وہ بیدار کی حالیہ شاعری سے یقیناً مایوس ہوں گے۔ بیدار کے ابتدائی زمانے کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت سوز و گداز کی ایک مدھم لہر تھی جو قاری کے احساسات پر ایک دائمی تاثر چھوڑ جاتی تھی۔ آج اس گداز کی جگہ نعرہ بازی نے لے لی ہے۔ یہ نعرہ بازی دوسرے درجہ کے مشاعروں کی حد تک تو خوب کام دے جاتی ہے۔ کیونکہ اس سے مشاعرے میں اچھی خاصی ہوحق مچ جاتی ہے۔ لیکن اس نعرے بازی کا اس شاعری سے کیا تعلق جس کی وجہ سے ایک زمانے میں بیدار پنجاب کے علمی اور ادبی طبقے کا ایک محبوب شاعر تھا؟

---

[1] مجھے اس وقت بیدار کا زیادہ کلام تو یاد نہیں کیونکہ اسے پڑھے اور سنے زمانہ گزر چکا ہے۔ کم و بیش تیس برس۔ لیکن "فریادِ شکستہ" کے چند اشعار یاد ہیں جو میں قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے یہاں درج کرتا ہوں۔ "قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا":

اٹھی دل سے فغاں دردِ نہاں کی ترجماں ہو کر
زباں پر آ گیا حرفِ شکایت داستاں ہو کر

زمانے کے حوادث نے وہ دل پامال کر ڈالا
جو زیرِ آسمان رہتا حریفِ آسماں ہو کر

سمٹ کر رہ گیا وہ سیلِ نورانی تخیل کا
جسے بہنا تھا اک دن جوئے کہکشاں ہو کر

تپش ناآشنا حالِ دلِ بیتاب کیا جانے
لبِ ساحل حدیثِ شورشِ گرداب کیا جانے

جہاں میں زندہ جلنا کام ہے پروانہ کیشوں کا
یہ رسمِ جانگدازی کرمکِ شب تاب کیا جانے

طلب تھی التفاتِ حسن کو اہلِ امارت کی
بھی داماں سزاوارِ نگاہِ ناز کیا ہوتا

اگر گلچیں چمن میں لب کشائی کی اجازت دے
تو بلبل کی طرح کمسن کلی بھی بول سکتی ہے

نگاہِ حرص پیہم روندتی پھرتی ہے تاروں کو
اگر چاہے تو یہ انمول موتی رول سکتی ہے

بیدار غزل بھی بہت عمدہ کہتے تھے۔ لیکن اس وقت مجھے ان کی غزل کا کوئی شعر یاد نہیں آ رہا ہے۔

حسان دربھنگوی

غزل

بنا کے جذبۂ سفینہ کا ناخدا مجھ کو
کسی نے کر دیا طوفاں آشنا مجھ کو
میں زندگی سے بہت کچھ مطالبہ کرتا
تری نگاہ نے خاموش کر دیا مجھ کو

بت تراش، میں پتھر ہوں سوچ لیجیے
تری خوشی ہے، خدا یا صنم بنا مجھ کو
تمہارے شہر کی رونق کا معترف ہوں مگر
ملے ہیں خون کے دھبے بھی جابجا مجھ کو
دماغ میں جو خودی بن کے کسمساتی ہے
خدا بنائے گی میری یہی انا مجھ کو
گلہ کروں میں کسی سے تو کیوں کروں احسان
میں کون تھا جو کوئی آگے پوچھتا مجھ کو

ناؔمی انصاری

غزل

مفلسی چھوڑ گئی ہم کو خطاکاروں میں
نقدِ غم بھی نہ بکا شہر کے بازاروں میں
مصلحت ساز ہیں خوبانِ جہاں کیا کہیے
اہلِ دل کھو گئے حاشیہ برداروں میں
وقت مرہم نہ بنا اہلِ محبت کے لئے
زندگی بیت گئی درد کے انگاروں میں
دیدۂ تر سے کل رات لہو پھر ٹپکا
یہ خبر چھپ نہ سکی صبح کے اخباروں میں
اہلِ گلشن تو نئی صبح کے ہیں دیوانے
چند ہی لوگ ہیں ماضی کے طرفداروں میں
نقدِ خوں لیکے چلو، دولتِ جاں لیکے چلو
حسن ارزاں ہے بہت حسن کے بازاروں میں
کٹ گئے اہلِ جنوں چاک بداماں ناؔمی
عرصۂ غم بھول گئے حسن کی مہکاروں میں

ایم۔ اے حفیظ بنارسی

غزل

کس جگہ سے گزر رہے ہیں لوگ
اپنے سائے سے ڈر رہے ہیں لوگ
جی رہے ہیں نہ مر رہے ہیں لوگ
گزر اوقات کر رہے ہیں لوگ
کھا رہے ہیں فریبِ ساحلِ شوق
موت کے گھاٹ اتر رہے ہیں لوگ
کوئی گلشن کا خیرخواہ نہیں
پھول دامن میں بھر رہے ہیں لوگ
خودنمائی ہے اور خود بینی
بن رہے ہیں سنور رہے ہیں لوگ
میکدہ مقتلِ تمنا ہے
خون سے جام بھر رہے ہیں لوگ
خشک پتے ہوں جیسے پربت کے
ٹوٹ کر یوں بکھر رہے ہیں لوگ
منزلِ شوق ابھی ہے دور حفیظ
راستوں سے گزر رہے ہیں لوگ

احتشام اختر

غزل

جو زخم دل پہ لگا ہے وہ بھر نہ جائے کہیں
کتاب درد ہوا میں بکھر نہ جائے کہیں

بجھی کہاں ہے ابھی پیاس دل کے صحرا کی
چڑھی ہوئی ہے جو ندی اتر نہ جائے کہیں

ہوا نے اس کو بنایا ہے سرکش و مغرور
پتنگ ڈور سے خود کٹ کے مر نہ جائے کہیں

جھلس رہا ہوں میں خود اپنی آگ میں لیکن
مرے عذاب کی اس تک خبر نہ جائے کہیں

بگاڑ دی ہے مری شکل وقت نے اختر
مجھے وہ دیکھ کے اس طرح ڈر نہ جائے کہیں

●

عقیل شاداب

غزل

موت اور زندگی کی پریشانیوں میں ہوں
لمحہ ہوں بحر وقت کی طغیانیوں میں ہوں

کچھ اپنی زندگی کا بھروسہ نہیں مجھے
میں اپنے قاتلوں کی نگہبانیوں میں ہوں

چوراہوں کی صلیبیں مجھی سے جوان ہیں
بے گھر ہوں اور بے سروسامانیوں میں ہوں

ہوتے ہوئے نہ ہونے کا احساس ہے مجھے
قطرے کی طرح بہتے ہوئے پانیوں میں ہوں

مار کر زمین سے مجھ کو رہائی دی
روز ازل سے میں تری پیشانیوں میں ہوں

مجھ پر خدا کی مار کہ مصروف روز و شب
بوجہل و بولہب کی مدح خوانیوں میں ہوں

شاید مرا لباس بھی سالم نہ رہ سکے
ہر سمت سے گھرا ہوا عریانیوں میں ہوں

تسخیر کائنات کا سودا نہیں مجھے
میں تو اسی زمین کے زندانیوں میں ہوں

عشرت قادری

غزل

شفق کھلی ہے، سرِ شام رنگ چھلکے ہیں
اٹھاؤ! ساغرِ گل فام رنگ چھلکے ہیں
افق افق ہے صباحت کسی کے عارض کی
نظر نظر سے بہ ہر گام رنگ چھلکے ہیں
گلابِ تازہ کی مانند کھل رہی ہے فضا
نظر ہے وقفِ در و بام، رنگ چھلکے ہیں
سرشکِ خوں نے یہ دامن پہ کی ہے گل کاری
نہ دیجے زخموں کو الزام، رنگ چھلکے ہیں
نہ مطرب ہے نہ ساقی، نہ بادۂ سرجوش
بپا ہے رندوں میں کہرام، رنگ چھلکے ہیں
ادھر بھی ایک نگہ ساقیٔ سبو بردوش
رہے نہ کوئی تہی جام، رنگ چھلکے ہیں
ہرا ہوا ہے ہر اک زخم یاد آتے ہی!
لیا ہے جب بھی ترا نام، رنگ چھلکے ہیں۔

ڈاکٹر زرینہ ثانی

آزاد غزل

زندگی کا شبستاں منور ہوا، آپ کی چشم و ابرو کے بل ہی گئے
بجھ رہے تھے دیئے آج جل ہی گئے۔
شکریہ آپ کا، زندگی غم میں بھی مسکرانے لگی۔
ہم بہلتے بہلتے بہل ہی گئے
خوب کھاتے رہے غم پیالے ہر ہر قدم، لغزشیں ساتھ تھیں
راہ کے پیچ و خم سے گزرتے گزرتے سنبھل ہی گئے
تیرے رندِ بلانوش کی خیر ہو
زلف لہرائی ہے، چاندنی چھائی ہے، ساغرِ جم محفل میں چل ہی گئے
ظلمتیں شامِ غم کی سمٹنے لگیں زندگی کا نصیبہ چمک جائے گا
ثانیؔ زلفِ پریشاں کے بل ہی گئے۔

★

حسرت کاسگنجوی

(افسانہ)

تخیل کی موت

اٹھارہ سال بعد!

جمیلہ میرے سامنے ایسے کھڑی تھی جیسے یہ کل کی بات ہو۔ میں اسے بڑی حیرت سے دیکھ رہا ہوں۔ میرے من کے تمام گوشے جاگ اٹھے ہیں۔ جمیلہ — میرا ذہن صرف جمیلہ کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ دبلی پتلی لاغر شرمیلی لجیلی مسکراتی تو منہ سے پھول جھڑتے۔ لانبے لانبے سیاہ بال۔ ستواں ناک صبیح رخسار روشن آنکھیں چمپئی، رنگ بات بات پر گردن جھکا کر شرمانا دانتوں میں عجیب انداز سے کلمہ کی انگلی دبا، گھنی پلکوں کو اوپر اٹھا اور پھر نگاہیں جھکا کر پیر کے انگوٹھے سے زمین کو کریدنا یا انگلی کے گرد قمیص کو لپیٹنا اور پھر قطعی انجان بن جانا، پندرہ سال کی جمیلہ شاعروں کے روایتی انداز میں بجلی گرانے والی جمیلہ تھی

ٹھیک اٹھارہ سال پہلے جمیلہ میری تمناؤں کا مرکز تھی۔

میں آج جب سوچتا ہوں تو یاد آجاتا ہے کہ میں کس قدر بزدل جھینپو اور جذباتی تھا۔ خالہ اور خالو ہوتے تو میں خود کو محفوظ سمجھتا تھا۔ نگاہیں نیچی کئے اور تصور کی دنیا میں جاگ رہا ہوتا۔ ہر آہٹ پر جمیلہ کے تصور میں کھو جانے والا سامنے بیٹھی ہوتی۔ شرمائی ہوئی جمیلہ کو نہ دیکھ پاتا۔ اور جب سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے تو میں سب کی نگاہ بچا کر جمیلہ کو دیکھ لیتا۔ جمیلہ اسی بات کی منتظر ہوتی تھی۔ اور پھر مجھ پر شرم کا ایک انجانا دورہ پڑتا۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ خواہش بھی ہوتی۔

ایسا ہر دفعہ ہو میں ہر دفعہ چوری چوری دیکھوں اور وہ ہر ا مجھے اسی انداز سے دیکھے۔ خالو ہنس کر کہتے تھے صابر میا تو غلطی سے لڑکے ہیں ورنہ وہ لڑکی ہی ہوتے تو اچھا ہوتا میں شرم سے زمین میں گڑا جاتا۔ لیکن یہ بات اکثر اتنی دہرائی گئی کہ میں اب اس کے سننے کا عادی سا ہو ہو

جمیلہ ہمارے گھر اکثر خالہ کے ساتھ آتی لچکیلی ہو شاخ کی طرح اس کا جسم لچکتا تھا وہ اتنی پھرتی اور تیز کے ساتھ کبھی یہاں اور کبھی وہاں جاتی کہ حیرت ہوتی۔ جان بوجھ کر دوسرے کمرے میں چلا جاتا۔ جس میں ایک سو تھا۔ جہاں سے بیٹھ کر ہر چیز دیکھ لینے میں مزا آتا تھا۔ لیک جمیلہ مجھے ڈھونڈھ نکالتی۔ اچھا تو آپ یہاں ہیں۔ ہم ـ سارا گھر چھان ڈالا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی جھینپ جا صابر بھائی وہ ایک ادائے مستانہ سے کہتی۔ آپ تو لڑکیوں زیادہ شرمیلے ہیں اور میں بڑی ہمت کر کے گردن اونچی نگاہیں سامنے کر کے بڑے وقار سے کہنے کی کوشش کر نہیں نہیں ایسا نہیں ہے جی .... پھر مجھے معلوم نہیں میں کیا کہتا۔ میری زبان مسلسل چلتی آواز نکلتی تھی۔ یا نہیں اس مجھے علم نہیں۔

میں اتنا جانتا ہوں کہ جمیلہ میرے حواس پر چھا گئی سونے جاگتے ہر وقت میرے ذہن میں جمیلہ کا ہیولا واضح

صورت میں اپنی مکمل رعنائیوں اور اداؤں کے ساتھ موجود رہتا۔ میں جمیلہ سے اتنی تفصیل سے گفتگو کرتا کہ وہ بھی گھبرا جاتی پڑے با قوتی ہو، — ڈلے والے کے نعرے تو بڑی گھٹیا اور گری ہوئی حرکت ہے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنی محبوبہ کے سامنے ایسا کروں۔ میں بڑے وقار اور تمکنت کے ساتھ رہتا، سکون اور طمانیت سے ہر بات کا جواب دیتا، اختر شیرانی کے وہ اشعار جو انھوں نے سلمیٰ کے لئے کہے تھے انھیں بڑے مترنم انداز سے دہراتا۔ رومانی ناولوں کے مکالمے میری زبان پر ہوتے۔ مجھے یہ سارا جہاں، ہر چیز رومانی نظر آتی۔ خنک ہوا گنگناتی ہوئی محسوس ہوتی۔ بڑی [illegible] اور سجی سجائی حسین اور پُررونق دنیا تھی۔ اور جب یہ دنیا کسی مادی دنیا سے ٹکراتی تو جادو کی سی کیفیت ہوتی۔ میری تمام محبت کے تصورات یک لخت غائب ہو جاتے اور پھر میں اسی دنیا میں ہوتا جہاں کی ہر چیز مجھے اجنبی معلوم ہوتی۔ حتیٰ کہ اپنے جسم پر بھی مجھے اعتبار نہ آتا۔ اور پھر میرا جی یہی چاہتا کہ میں اس دنیا کو ختم کر دوں جو میری اصل دنیا کے وجود کو اس طرح ختم کر دیتی ہے۔

جمیلہ کے تبسم کی بجلیاں اس کی ادائیں اس کا شرمانا اس کا نازک سا چہرہ اس کے وہ لب و رخسار تصور میں میں نے اسے چھو کر تک محسوس کئے ہیں۔ اس کے لمس سے جو عجیب سی کیفیت چھا جاتی تھی۔ اس کے اظہار کے لئے میرے پاس الفاظ ہی نہیں میں انھیں محسوس ہی کرتا ہوں۔ اگر گھر والوں کا اعلان نہ ہوتا کہ جب تک میں میٹرک نہیں کر لوں گا جمیلہ سے شادی نہیں ہو سکے گی۔ تو یقین کیجئے میں زندگی بھر پڑھنے کے بعد بھی میٹرک نہ کر پاتا۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ ہماری شادی کے درمیان صرف میٹرک کی دیوار ہے تو پھر کیا تھا۔ جو پڑھنا شروع کیا تو اس دیوار کو گرا کر ہی دم لیا۔ لیکن بدنصیبی سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اور میں مجبور تھا — میری تقدیر میری تمنا، میری دنیا، میرا احساس میرے جذبے، خاک کے ایک جھٹکے سے منتشر ہو گئے۔ صابر نے میٹرک نہ جانے کیسے کر لیا ہے۔ لیکن وہ ہماری جمیلہ کے قابل نہیں۔ میرے حواس پہ بجلی سی گری۔ ایسی کی بجلی نہیں۔ حقیقی دنیا والی بجلی۔ وہی بجلی جو بادلوں کی گرج کے ساتھ ہی کہیں گرتی ہے۔ کسی کا نشیمن جلتا ہے۔ شعلے بلند ہوتے ہیں اور سب کچھ راکھ ہو جاتا ہے اور پھر یہ راکھ دیوانوں کی طرح رقص کرتی ہے۔ ایک دیوانہ وار رقص، فضا اس رقص کو حیرت سے دیکھتی ہے۔ سورج تھرتھرا کر نکلتا ہے۔ چاند کپکپا کر طلوع ہوتا ہے۔ تارے لرزتے ہیں ہوا سسکیاں لیتی ہے۔ دنیا کی ہر شے اداس اور غمگین ہو کر اداسی اور تنہائی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جاتی ہے۔ اور راکھ دیوانہ وار رقص کرتی ہے۔ رقص۔

یہ پر بجلی گری تھی میرا نشیمن جلا میری راکھ اڑی، اس نے رقص کیا۔ اس نے خاک کے ڈھیر سے کافی دنوں کے بعد عزائم کا ایک ہیولا بلند ہوا۔ عجیب و غریب عزائم — جو صرف مادی دنیا سے تعلق رکھتے تھے۔ جمیلہ کو کھو کر مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ میں نے اپنی زندگی میں اتنے گھاؤ کر لئے ہیں کہ وہ کبھی بھر نہیں سکتے۔ یہ رستے ہوئے گھاؤ اور ناسور درد اور ٹیسوں کے ذریعے مجھے جمیلہ کا احساس دلاتے رہیں گے۔ دنیا کی ہر چیز فانی اور بے وفا ہے۔ دنیا کی کوئی شے مکمل نہیں ہے۔ دنیا وہ ہے جہاں غم ہی غم ہیں۔ دھوکے ہی دھوکے ہیں۔ جہاں اعتبار سے پہلے دھوکہ جنم لیتا ہے۔ جہاں، وفا کا نام لے کر اس کا ہی مذاق اڑاتے ہیں۔ جہاں ناپائیداری خاص چیز ہے۔

مجھے نہیں معلوم جمیلہ پر کیا بیتی۔ اس نے کیا محسوس کیا۔ جمیلہ سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ خود جمیلہ آئی نہیں۔ یا آنے نہ دیا گیا۔ [illegible] اس کے گھر تک گیا اور دروازے پر بغیر دستک دیے [illegible] اور ایک دن تو میں [illegible] لوٹ گئے۔ اپنی بیوقوفی پر ہنستا رہا۔ چکر لگاتے [illegible] تھا۔ جب عقل نے اس بے عقلی کی بات کو پاگل [illegible] اور میں نے عقل کی بات مانی تو میں نے نہ جانے کیوں خود کو بیحد بیوقوف اور جاہل تصور کیا۔ یہ عقل تو شیطان ہے یہ دل اور آنکھ سے محروم ہے یہ اندھا کیا دل کے گھاؤ دیکھے گا۔ اس کے کان نہیں [illegible]

کسی کے دل سے نکلی ہوئی بے آواز آہوں کو کیا سن سکے گی لیکن کیا کریں مجبوری ہے۔ بعض اوقات سب کچھ جانتے ہوئے بھی اسے جاہل اندھی، بہری، گونگی عقل پر اعتبار کرنا پڑتا ہے۔ کہتے ہیں یہ انسان کی فطرت ہے۔ عجیب فطرت ہے۔ کسی سے اس کا غم جیسا ساتھی چھین لینا اس کی مایوسی اس کے جذبے چھین لینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ گلوں سے بہتر یہ خار ہوتے ہیں۔ جو دامن کو تھام لیتے ہیں۔ لیکن اسے فطرت انسانی قربان تیرے تو ان کانٹوں سے دامن چھڑا دیتی ہے۔ تاکہ پھولوں کے نیچے چھپے ہوئے سانپ ایک دفعہ پھر ڈس لیں۔

مجھے نہیں معلوم تھا کب تک دیوانہ پھرتا رہا کب میں نے دنیا سے منہ موڑ نشین پاسپورٹ بنوایا اور کب گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ مجھے ہوش اس وقت آیا جب میں نے لندن کے ہائیڈ پارک کے نزدیک ایک لڑکی کو کھڑے ہوئے دیکھا وہ جمیلہ تھی۔ وہی نازک سا چہرہ وہی سیاہ لانبے بال دبلی پتلی میں اس کے نزدیک ہوتا گیا۔ میرا جی چاہا کہ میں ایک دم جمیلہ کو گلے سے لگا لوں۔ جب وہ مسکرائی تو مجھ پر حسب دستور بجلی سی گری۔ اور جب میں نے اس لڑکی کو غور کر دیکھا تو اس کے نقش بدلنے لگے۔ وہ تو منی اسکرٹ پہنے ایک آئرش لڑکی تھی۔ جس نے بالکل برا نہیں مانا بلکہ ایک دلآویز تبسم کے ساتھ بولی آپ کو کس کی تلاش ہے۔ اور پھر میں خواب کی دنیا سے ایک دم چونک پڑا۔ میں نے بیحد شرمندگی سے معذرت چاہی اپنی غلطی کا اقرار کیا۔ وہ لڑکی اب تک مسکرا رہی تھی۔ اور اس نے مجھے معاف کر دیا تھا۔ وہ مجھے بڑی حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ میں بھاگ رہا تھا۔ سرپٹ —— اب اس لڑکی کی مسکراہٹ کسی قدر طنزیہ تھی۔

پھر ایک دن مجھے اپنی کلاس فیلو لڑکی جمیلہ لگی۔ جمیلہ تو مجھ پر طنز کستی تھی لیکن اپنی بیحد شفیق اور بیحد ہمدرد تھی۔ اس دیارِ غیر میں اس نے میرے اجنبیت کے جذبے کو ختم کر دیا تھا۔ لیکن جب میں نے غور سے دیکھا تو اس کی آنکھیں سیاہ نہیں تھیں۔ اس کے بال سیاہ اور لانبے تھے شرمائے اور لجاتے ہوئے وہ کبھی کبھی انگلی کو منھ میں نہ دباتی تھی۔ اس کے ہونٹ یاقوتی نہیں تھے۔ اس کی آنکھوں میں اتھاہ سمندر کی سی گہرائی نہیں تھی۔ وہ شرما کر نگاہ ایک دفعہ اٹھا کر نیچے نہیں کرتی تھی۔ نہیں نہیں وہ جمیلہ نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ جمیلہ کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے بال۔ نیلی آنکھیں خوفناک حد تک سفید رنگ۔ اس کا یہ اسکرٹ، نہیں نہیں۔

ایڈورسے رید اور سانتیج (سارتر) کے دیس میں ایک کیفے میں جہاں ادیب اپنی تخلیق بڑے فخر سے دوستوں کو دکھاتے اور سناتے ہیں۔ ایک بھوری آنکھوں والی لڑکی نے مجھے اپنی کہانی سنائی۔ اس نے جس مشرقی لڑکی کا خاکہ پیش کیا تھا وہ بالکل جمیلہ تھی۔ اس نے اپنے افسانہ میں وہی کچھ لکھا تھا جو کہ وہ تاریکیوں میں پڑھتی آئی تھی۔ اور اس خیال کے تحت وہ میری جمیلہ سے واقف ہے۔ میں نے ایک دفعہ پھر اس سے وہی کہانی سنی لیکن وہ اس سے زیادہ میری جمیلہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ اور مجھے یہ جان کر بے حد دکھ ہوا کہ وہ جمیلہ کو جانتی بھی نہیں۔ پھر میں نے چاہا کہ سارتر کے وجودیت کے فلسفے میں خود کو فراموش کر دوں۔ لیکن وہ تو میری فطرت کے خلاف تھا پھر سارتر کی باتیں میری سمجھ میں آتی بھی نہیں تھیں۔

میں جہاں بھی گیا جمیلہ میرے ساتھ گئی۔ مجھے جب بھی تنہائی میسر آئی جمیلہ اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ چھم سے میرے سامنے آجاتی۔ پھر وہی شرمانا وہی نقرئی قہقہے اور پھر میں اپنی مخصوص دنیا میں خیالوں کی پریوں کے جھمگٹ میں محو ہو جاتا —— جرمن، ڈنمارک، ہالینڈ، امریکہ، روس اور اسپین، اور نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرا۔ کہیں سکون نہ مل سکا۔

آج اٹھارہ سال کے بعد میں وطن آیا تھا۔

طویل اٹھارہ سال بعد!

میرے سامنے ایک عورت کھڑی تھی۔ بھرے بھرے گلے

آنکھوں پر نظر کی عینک، پھولا ہوا جسم، نائیلون کی ساری کھلی ہوئی باہیں۔ ہونٹ لپ اسٹک سے لتھڑے ہوئے، ایک برس اور وہیں کے پاس جو شخص کھڑا ہوا تھا۔ اس کا سن کوئی پچاس برس کے قریب تھا۔ جس کی توند نکلی ہوئی تھی۔ منھ میں سگار تھا۔ کوئلے والے انجن کی طرح اس کے منھ سے دھواں نکل رہا تھا۔ بہترین سرج کے سوٹ میں وہ خود کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

عورت نے چشمہ کو ایک بار پھر صاف کیا اس کی نگاہیں شاید اتنی کمزور نہیں تھیں۔ لیکن اسے اپنی نگاہ پر شاید اعتبار نہیں آ رہا تھا اس نے مجھ سے بڑے ملائم لہجے میں پوچھا کیا تم صابر ہو!

میں زمانے بھر میں جمیلہ کو ڈھونڈ آیا تھا۔ اور آج اصلی جمیلہ بھی جمیلہ نہیں رہی تھی۔ زندگی کا آخری سہارا بھی ختم ہو چکا تھا۔

نہیں میں صابر نہیں ہوں ۔۔ میری آواز رندھی ہوئی تھی ۔۔ میں تخیل پرست دیوانہ ہوں۔ لیکن میں شاید دوسرا جملہ ادا نہیں کر سکا تھا۔ اور جب جمیلہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں صوفے پر گر پڑا۔ اور خوب جی بھر کر رویا۔"

میرا امریکن دوست کہہ رہا تھا مسٹر صابر تمہاری جمیلہ ضرور ملے گی۔ جد و جہد کی ضرورت ہے۔

میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ اور میں زار و قطار رونے لگا۔ ابھی ابھی تو میں جمیلہ کے جنازے کو کندھا دے کر آیا ہوں۔ اور یہ پگلا امریکن جد و جہد کے لئے کہہ رہا ہے کیا کوئی قبر میں سے بھی واپس آیا ہے۔

اب جو میرے تصور میرے ذہن میں آیا تو وہ بہت دھندلا دھندلا تھا۔ اتنا دھندلا کہ میں کسی نقش کو بھی نہ پہچان سکا۔ اور پھر جو ہیولا میری نگاہوں کے سامنے اپنی اصلی صورت میں آیا وہ جمیلہ کا نہیں مسز اختر کا تھا۔ وہی پھولے ہوئے ننگے بازو، نائیلون کی ساری۔ پھولے پھولے گال نظر کی عینک اور لپ اسٹک میں لتھڑے ہوئے ہونٹ ۔۔"

میں بھی کتنا پاگل ہوں۔ ابھی ابھی جمیلہ کے جنازے کو کندھا دیا ہے۔

اور میں نجانے کس جذبے کے تحت ہنس دیا۔

کلب کے سازندے اپنی تمام دھنوں کے ساتھ زندگی کے نغمے الاپ رہے تھے ☆

علی عباس امید

فرسٹریشن

فضا میں خامشی ہے
پوری بستی سو چکی ہے
چراغِ یاد دھندلے ہو چکے ہیں
جو گزرا ہے اسے یکسر بھلا کر
ہم آنے والے دن کو رو چکے ہیں
(بہت کچھ کھو چکے ہیں)

یہی جی چاہتا ہے اب۔
کہ ایک گہرا سمندر نیند کا ہو
اور ہم اس کی تہوں میں اس طرح ڈوبیں
کہ چاہیں بھی تو پھر باہر نہ نکلیں
اگر ڈھونڈیں ہمیں سورج کی کرنیں
تو ان کے ہاتھ بھی ہرگز نہ آئیں
ہماری طرح وہ بھی تھک کے آخر
اسی گہرے سمندر میں اتر جائیں
...... کچھ دیر سو جائیں

خوشگوار حادثہ

لمحوں کا شیشہ ٹوٹ گیا
ٹیڑھی میڑھی، تیز، نکیلی کرچیں۔
بکھر گئیں اس دھرتی کے آنچل میں
آنے جانے والے راہی۔
انجانے پن میں جب ان پر پاؤں دھریں گے
گونج اٹھے گی بوجھل سسکی ——
لیکن۔

وہ جانباز مسافر
(جو) بیتے دنوں کی قید سے چھٹ کر
ماضی کی پرہول حدوں سے آگے نکل کر
جاگتے لمحوں ہی کے ساتھ رواں ہیں
لمحوں ہی میں زندہ ہیں۔
ٹوٹے لمحوں کی اس منزل میں

(جو تیرہ اور بھیانک سا ہے۔
بکھری کرچوں کے سائے سے لرز لرز کر
اپنی حسّی قوت کے سائے میں ٹھہر کے ٹیڑھی میڑھی تیز نکیلی کرچوں پر
اپنے ہاتھ دھریں گے۔
سرخ لہو کے بکھرے قطرے
دھرتی کے پھیلے آنچل کو کر دیں گے گلریز و گلنار
روشن، دھندلے، رنگین، گدلے۔
قصوں کی پھر فصل اُگے گی۔
دور دور تک پھول کھلیں گے۔
دور دور تک خوشبوئیں بھی پھیلیں گی۔
اور لہو کے پھولوں سے
آنے والے لمحوں کے ایوان سجیں گے۔

دو غزلیں

غلام مرتضیٰ راہی

(۱)

تو اپنی خلوتوں میں مجھے باریاب لکھ
تعبیر کے بجائے کبھی میرا خواب لکھ

سنبھلا ہوا ہوں میں تری پشین گوئی تک
آہٹ مری سنائی دے تو انقلاب لکھ

کم خرچ پر ہی مان لے بالانشیں ہمیں
کچھ تو بڑھا چڑھا کے ہمارا حساب لکھ

بے کار مجھ سے میں نہ پڑتا کہ جھانک سے
یک جنبش قلم، مری ہستی سراب لکھ

پہنچا دے ایک رات مجھے آسمان پر
نیندوں کے اک سفر کو مرے کامیاب لکھ

آنکھوں میں تیری کچھ تو سمندر کا خوف ہو
کشتی پہ رکھ نگاہ، مگر "نقش آب" لکھ

کیوں راستہ روکتا ہے مری گرد جھاڑ کر
اب آئینہ ہوں میں تو مری آب و تاب لکھ

پہنچا نہیں جو گرد کو میری تو کیسا ہوا
ساری حقیقتوں کو مری بے نقاب لکھ

جائے گا کون تیرے سیاہ و سفید پر
بس کا نہیں سوال تو ہٹ کر جواب لکھ

تیرے قلم کا زور کبھی ٹوٹتا نہیں
عالم میں ایک روز مجھے انتخاب لکھ

(۲)

میں اپنے رنگ میں تھا آن بان کے آگے
مگر نہ دیکھا کسی نے گمان کے آگے

مری تلاش کی صورت نہ جانے کیا ہوگی
نکل گیا ہوں میں اپنے نشان کے آگے

بلندیوں پہ ہوا بھی نہیں رہی، لیکن
چراغ بجھنے لگے آسمان کے آگے

لہو کی آہٹیں کانوں میں آ رہی ہیں مگر
دکھائی کچھ نہیں دیتا کمان کے آگے

نہ باز آئے مگر ہم بھی اپنی کوشش سے
اگرچہ سر نہ اٹھا سائبان کے آگے

نظر کسی کی در و بام سے نہیں اتری
کھڑا ہوا تھا میں اپنے مکان کے آگے

تمہارے جی میں جو آئے مجھے کہے جاؤ
مری بساط ہی کیا ہے زبان کے آگے

بلا رہا ہے وہ اپنی طرف مگر سرا بھی
سنائی کچھ نہیں دیتا اذان کے آگے

★

ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ

نئے ادب کی عظمت

ادب اگرچہ زبان کی نہایت ہی منزّہ، مصفّیٰ اور مزکّیٰ شکل ہے۔ پھر بھی ہم بنیادی طور پر اسے بولی، ٹھولی اور زبان کی کمزوری علامتوں سے پاک نہیں کہہ سکتے۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ کوئی ادب، زمین سے اوپر معلق نہیں رہ سکتا۔ مختلف فکر و نظر کے شعرا ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اور رومانٹ مین بھی اس بات پر متفق ہیں کہ اعلیٰ ترین شاعری اپنی قوتِ نمو روزمرّہ کی زبان اور عوامی گیتوں سے ہی اخذ کرتی ہے۔ ایلیٹ اپنی کتاب (THE USE OF POETRY) میں لکھتا ہے۔

"مقبول شاعری عوامی زبان سے زندگی
حاصل کرتی ہے۔ اور بطور بدل اسے تقویت
پہنچاتی ہے۔ اس کے شعور کی بلند ترین سطح
اس کے زوز اور اس کی بہت ہی خوشگوار،
حسیت کی نمائندگی کرتی ہے۔"

اٹھارہویں صدی عیسوی میں جرمن فلسفی و مورّخ جی۔ جے۔ ہرڈر نے یہ خیال پیش کیا تھا کہ ادب کی بنیاد کسی قوم کے عوامی گیت پر ہی ہونی چاہیے۔ اس کے بقول عوام کے روزمرّے اور محاورے ہی ادب و ثقافت کے خصائص پر روشنی ڈالتے ہیں اور اس سے ملک و قوم کا منفرد اسلوب پہچانا جاتا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ آج امریکی ادب میں (ROCK POETRY) ایک خاص مقام بناتی جا رہی ہے۔ روزمرّہ دراصل زبان کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اسی میں ادبی نشو و نما اور بیان کی نئی نئی طرزیں پوشیدہ ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اعلیٰ ادبی اور تہذیبی قدریں عامۃ الناس کی تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتوں میں ہی مضمر ہیں۔ لیکن اس نقطۂ نظر سے عقل و فہم کی جمہوری قباحتیں بھی سامنے آتی ہیں۔

مشہور امریکی مصنف ایمرسن کا بھی یہی خیال ہے کہ عظمت اور بلندی کی جڑیں عام زندگی میں پیوست ہونی چاہئیں۔ ایمرسن ادب میں علامتوں کا قائل ہے۔ علامتیں عام زندگی میں بڑا اہم رول ادا کرتی ہیں شاعری کا حسن عوام کے ستھرے ذوق میں پوشیدہ ہے۔ یہ شاعر کا فرض ہے کہ وہ پیش پا افتادہ چیزوں کو علامتی حسن دے کر جزوِ شاعری قرار دے۔

زبان دانشوروں اور محاورہ سازوں کی غیر فطری تعمیر نہیں بلکہ انسانی ضرورتوں، الجھنوں، مسرّتوں، لذّتوں اور پیار محبت کے بول سے وجود میں آتی ہے۔ اس کا رشتہ تصنّع کی نسبت زمین سے زیادہ قریبی اور پائیدار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان کی ترقی یافتہ صورت ادب ہے۔ اور ادب کو ہم کسی حال میں طبقۂ خواص سے قطعی طور پر مخصوص نہیں کر سکتے۔ میرا خیال ہے کہ علامتیں خواص سے زیادہ عوام کو متاثر کرتی ہیں۔ مخصوص تشبیہات، اصطلاحات اور کارٹون اسرار و رموز کے حامل ہوتے ہیں، ترسیل و ابلاغ کی

کی اس قدیم شکل کو موجودہ امریکی ہاں کے مصنفین زیادہ بہیں آسان اور دلچسپ تصور کرتے ہیں۔ یہ علامتی تکنیک جو کبھی بیہودہ اور غیر مانوس بھی تھی ہے۔ رفتہ رفتہ روایتی تصنع و تکلف پر غالب آ رہی ہے۔ غیر ملکی ادبیات کا عصری ارتقاء آج بھی علامتی تکنیک سے عبارت ہے۔

جان ویکیتی، باب ڈائی کن، پیٹ سیجر اور گورری کے نام اس سلسلے میں اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک تہذیب کی اجنبیت، بے معنویت اور اس کا کھوکھلا پن ادب میں عریاں نظر آنا چاہیئے۔ نیا آدمی اپنے وجود کی تکمیل چاہتا ہے۔ وہ اپنے جسم اور حواس کے ساتھ یکساں طور پر زندگی کا آرزومند ہے۔ میکانکی طور پر ترقی کرتی ہوئی اس خودکار دنیا میں انسان جسم و روح کے ساتھ اپنا تحفظ چاہتا ہے اور اس کی یہی خواہش اس کا عظیم کرب بن گئی ہے۔ آج جدید ٹکنالوجی انسانی پیدائش کی رفتار سے زیادہ تر تیز وہ میکانکی ماحول پیدا کر رہی ہے جس سے عالمی پیمانہ پر بیروزگاری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ غربت و افلاس کا دور دورہ ہے۔ حتیٰ کہ نوبت عام فاقہ کشی تک پہنچ گئی ہے۔ اور یہی فاقہ کشی قومی حدبندیوں اور نسلی امتیاز کی خالق ہے۔ عصر حاضر کا یہ مرکزی تضاد ہمیں دماغی اور جسمانی اتحاد کے متعلق سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ تاکہ ہماری زندگی پرسکون، مطمئن اور محفوظ ہو سکے۔

آج کا شاعر اور آج کا ادیب وقت کے اس اہم تقاضے سے دست کش نہیں ہو سکتا۔ ہم ٹھوس حقیقتوں سے اغماض نہیں کر سکتے۔ نئی شاعری دراصل ان مطالبات کی ذہنی گونج ہے۔ ماحول کی ابتری کا عکس ہے۔ داخلی کرب اور روح کی گستگی کی آواز ہے، پامال اقدار و عدم تحفظ کے تلخ احساسات کا اظہار ہے۔ اس میں ترقی پسند جیسی اعتدال اور جذباتی ترنم کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ جو عوام، اور شعراء کے درمیان بحیثیت ایک قدر مشترک کے ہے۔

اس روشنی میں اردو کی نئی شاعری کا جائزہ لینا ہو یا تو اس کے رشتے بھی انہیں ٹھوس حقائق سے استوار نظر آتے ہیں۔ اب یہ بات کہ اردو کا نیا شاعر اپنی ذمہ داریوں سے کس حد تک عہدہ برآ ہو سکا ہے۔ اس کے لئے نئی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ ضروری ہے اور ایسا کرنے پر ہم دیکھیں گے کہ یہ شعراء کس حد تک مغرب کی اس ادبی گرم بازاری سے متاثر ہیں، انھوں نے اپنا کوئی منفرد اسلوب و آہنگ قائم رکھا ہے۔ یا سارا طریقہ کار ہی مستعار لیا ہے۔ اس میں مشرقی ادبیات کی روح موجود ہے یا نہیں اس کا سحر خیز جمالیاتی رخ تو نہیں ہو گیا ہے۔

میں ادب کو عوام سے قریب لیکن بازاری پن سے دور رکھنے کا قائل ہوں اور یہی دراصل فنون لطیفہ کا معیار ہے۔ ہماری نئی شاعری عوام کے درمیان کی شاعری ہے۔ یہ تہذیب و معاشرت کے دھندلکوں کی عکاسی اور ذہنی ردعمل کی بھی ترجمان ہے۔ کلاسیکی ادب کو عوام سے اتنا دور کیا گیا تھا کہ نظیر اکبرآبادی کو ادب شیفتہ کے "گلشن بیخار" میں جگہ نہ پا سکے۔ حالانکہ شعری طرز اداؤں اور عام زندگی کی خواہش نظیر کے کلام میں جو سلیقہ، سچائی اور اسے جذبہ زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کیا گیا۔ نیا شاعر تخلیقات کا مادی تجزیہ اور ترسیل فن کے لئے صنائع و بدائع کا قائل نہ محسوس کر دری حقیقتوں کو بیجا لفظوں کا اسیر کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ جابجا لب و لہجہ کی درشتگی اور اضطراب سے اسلوب گنجلک نظر آتا ہے۔

لفظ چونکہ خود ایک علامت ہے، مختلف کیفیات ذہنی کی۔ لہٰذا کوئی شاعر اگر الفاظ کو مروجہ لغوی معنوں سے الگ معانی دینے کی کوشش کرتا ہے۔ تو شعر کی وہ زبان اپنی تبدیل شدہ حالت میں روزمرہ کی زبان سے مختلف ہو جاتی ایسی ہی حالت میں شاعر عوام کے درمیان وقتی طور پر نامانوس رہتا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس وقت کا معاصرین کا خاص اور عام دونوں طبقوں کی حیثیت سے شاعر کے متوازی

ہم سطح رہ کر اسکی تفہیم و تبلیغ میں معروف نظر آتا ہے۔ رفتہ رفتہ جب الفاظ و علامات کی معنوی نہیں کھلتی ہیں۔ اور عام ذہن ان سے آشنا ہو جاتا ہے تو وہی ناقابل فہم قرار دی ہوئی شعری زبان ابہام و اشکال سے پاک، سہل اور دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ ایسا ہر دور میں ہوا ہے اور آج کا نیا شاعر بھی اس سے پوری طرح محفوظ نہیں۔ اس عمل کو ہم ادبی اور عصری ارتقا سے تعبیر کریں گے۔ ذوق و شوق، پسند و ناپسند اور رجحان طبع کا معاملہ بھی چونکہ ہر شخص کے ساتھ یکساں نہیں ہے اسلئے قاری و شاعر کے درمیان بے اتفاقی و نافہمی کی خلیج حائل رہتی ہے۔

ان تمام باتوں کے باوصف چونکہ ادب و شعر کی بنیادی قدریں (جن سے بحث یہاں مقصود نہیں۔) بدلتی نہیں، شاعر، سامع سامع کے ایک ہی رشتۂ مشترک (COMMON THREAD) سے منسلک ہوتے ہیں؟ انھیں دو (۲) (WATER TIGHT COMPARTMENT) میں نہیں رکھا جا سکتا۔ شاعر ترسیل چاہتا ہے، قاری و سامع کی اکثریت عوام میں ہے وہ عام فہم۔ ادراک سے کیسے چشم پوشی کر سکتا ہے؟ اسی میں ابلاغ کی کامیابی پنہاں ہے۔

نئی اور معاصر اردو شاعری میں وزیر آغا، باقر مہدی قاضی سلیم، کرامت علی کرامت، عمیق حنفی، علیم اللہ حالی شہاب جعفری، لطف الرحمٰن، بلراج کومل، صبا اکرام عادل منصوری، اختر یوسف اور شہریار وغیرہ کی بلند آہنگی گہرے طور پر متاثر کرتی ہے۔ احمد ہمیش اور افتخار جالب، بھی نئے ناموں میں اہم سمجھے جاتے ہیں مگر مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی جھجھک نہیں محسوس کرتا کہ ان کی طول طویل نگارشات کبھی میرے پلے نہ پڑ سکیں۔ ممکن ہے یہ میرے ناقص فہم یا کسی غیر شعوری تعصب کا قصور ہو۔

بہر نوع ذیل میں چند نظموں کے اقتباسات سے میں اپنے معروضات کی وضاحت چاہوں گا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی ایک نظم "لمحہ" کی آخری سطریں ملاحظہ ہوں۔"

رس بھرے پلے کا محل
اونٹنی کی پشت پر مچلا
سنہری گھنٹیوں نے چیخ کر مجھ سے کہا ——— تو رہ گیا"

شب و روز وہی ہیں، کائنات وہی ہے مگر شیرینی لمحات سے لطف اندوزی کا م و ذہن ہر شخص کا مقدر نہیں۔ ہارے ہوئے انسان کی ناکامی و بے مرادی جن حسی کیفیات کے ساتھ یہاں ابھری ہیں وہ نئی علامت نگاری کی نہایت عمدہ مثال ہے۔

حیات امروز کی بے کیفی و کم لذتی نے دلوں کو سانحات کی تمنائیں دی ہیں۔ یعنی ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔ سو برس قبل مومن نے کہا تھا۔ ؎

اے حشر جلد کر تہ و بالا جہان کو
یوں کچھ نہ ہو امید تو ہے انقلاب میں

آج بھی دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہو، کوئی ہمدرد نہیں۔ کوئی نہیں غم کا شریک۔

باقر مہدی کی خوبصورت نظم "ریت اور درد" اس صداقت کی مظہر ہے۔

مدتیں گذریں مرے دل کو ہوئے ویرانہ
آندھیاں بھی نہیں آئیں
کہ اڑے ریت، مٹے نقش سراب
اور اک درد کا چشمہ
مندمل زخموں سے پھوٹے نئی خشکی لیکر
..... اور خوش ہو کے کہوں۔
زندگی ریت بھی درد کا چشمہ بھی تو ہے۔"

انسان گردش روز و شب میں اپنے داخلی اندوہ و کشاکش کے سبب وقت کا ایک لایعنی جزو بن کر رہ جاتا ہے۔ قاضی سلیم نے اس تلخ احساس کو شعری پیکر عطا کرتے ہوئے ایک اہم حقیقت کی نقاب کشائی کی ہے۔

"اپنا اظہار ہی اثبات ہے ہر شے کیلئے
.... عمر اک چیخ کی میعاد ہے
تم بھی چیخو ــــــ
اتنی شدت سے کہ اک مدّت تک
وقت کو یاد رہے۔
جنگلوں اور پہاڑوں میں آکر یاد رہو (وقت)

چیختے ہوئے ماحول کی یہ درد بھری زندگی یقیناً فانی ہے۔ عمر کی میعاد بھی آج نہیں تو کل ختم ہوگی ہی لیکن یہ عارضی زندگی کے "دادِ غیرِ ذی زرع" میں پیوست ہے تو کیوں؟ مقصودِ زندگی کو ایک زمزمی تقدس اور آرزوؤں کا طوافِ جاوداں نصیب ہو۔ افقِ حیات پر درد کے سورج کا طلوع و غروب انسانی زندگی کے نشاط آگیں دنوں اور کربناک راتوں کا ضامن ہے۔

"درد کا سورج" احساسات کی برف پگھلا کر عارضی وجود کے پیچھے عرفانِ ذات کا سمندر چھوڑ جاتا ہے۔

کرامت علی کرامتؔ کی ایک فکر انگیز نظم "درد کا سورج"۔ اس "احساسِ شدید، تخئیل پرکار" کا بہترین کارنامہ ہے۔ ملاحظہ ہو۔

" درد کے لطف سے جو نہیں بہرہ ور
زخمِ دل کی خلش سے جو ہیں بے خبر
ان سے جاکر کہو
درد ہی سے ملا ہے جہاں کو نمو
درد ہے اصل میں ذات کی جستجو
درد کی نبض میں ہر گھڑی ہے رواں زندگی کا لہو
....
درد سے کیوں ڈرو؟
درد مہان ہے ......
....

[illegible] جسم کی آہٹ میں درد و غم کا یہ کردار [illegible]۔

برف کی طرح احساس کا یہ ہمالہ پگھل جائے گا۔
چند لے روح الفاظ کی گود میں۔
معنویت کا قلزم مچل جائے گا۔

تخلیقِ فن کی علت، درد کی عظمت اور تلاشِ ذات کی اہمیت پر اتنا کامیاب، واضح اور کھلا ہوا بیان مزید تشریح کا محتاج نہیں۔

شہاب جعفری "سورج کا شہر" میں اس میکانکی طرزِ حیات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ روز بروز شدت اختیار کرتا ہوا یہ محرومیٔ تمنا اور شکستِ انا کا احساس زوالِ انسانیت کی بھرپور ترجمان ہے۔

"مشین کی طرح ذہن بھی کام کر رہے ہیں۔
رگوں میں جیسے لہو کے بدلے رقیق لوہا بھرا ہوا ہے۔
مشین کی طرح پاؤں چلتے ہیں
آدمی کا جلال گردش میں سرنگوں ہے۔
ارادہ و اختیار اک اضطرابِ سنگین ہے۔ جس سے بچ کر
کوئی نہیں دو گھڑی کسی سے جو بے غرض رک کے بات کر لے"

علیم اللہ حالیؔ کی نظم "قطرہ کا مقدر" اس بھاگتی ہوئی دنیا میں وجودِ آدم کی بے مائیگی کم فرصتی و بے ثباتی کی طرف ایک خوبصورت اشارہ ہے۔ انسان جبر کے غیر محسوس ہاتھوں کی گرفت میں ایک کھلونا ہے۔ بے اختیاری کا یہ شدید ترین احساس علامتوں کی زنجیر بن گیا ہے۔

" وہ ابھی
بس ابھی
عمر کی بے کراں ساعتوں
کے سمندر سے اچھلا تھا۔
اور ــــ چاہتا تھا کہ
لہروں سے اوپر تعلق کی زنجیر کو توڑ کر۔
اپنی ہستی کو اک شکل دے
....

پھر ابھی
بس ابھی
غیر محسوس ہاتھوں نے
قطرہ کر کے پھر
عمر کی بے کراں ساعتوں
کے سمندر میں گم کر دیا"

محمد علوی زمانے کی یکرنگی و بے کیفی اور دنیا کی فرسودگی سے اس قدر گھبرا اور اکتا چکے ہیں کہ انھیں "آخری دن کی تلاش" مضطرب رکھتی ہے۔

فرماتے ہیں۔ ؎

"خدا نے قرآن میں کہا ہے
کہ لوگو میں نے
تمھاری خاطر فلک بنایا
. . . زمیں بنائی
. . . یہ دن بنایا
. . . . یہ شب بنائی
. . . . . یہ سب بنایا
مگر نہ بھولو
کہ ایک دن میں
یہ ساری چیزیں سمیٹ لوں گا
. . .
مجھے اسی دن کی جستجو ہے
کہ اب یہ چیزیں
بہت پرانی
بہت ہی فرسودہ ہو چکی ہیں

خوف اور مایوسی کی یہ سرد لہر جس سے بنی نوع انسان [illegible] لگنے لگے انداز کو قنوطیت کی طرف لے جاتی ہے۔

براج کومل کی ایک نظم کے مصرعے ہیں۔

"بھلے یا برے ہم ابھی ہیں سلامت
ابھی ٹوٹنے کو ہے لیکن قیامت
اگر مرگ احساس کی آرزو آخری قدر ٹھہری
ابھی ایک بیجان ماضی کے صحرا میں کھو جائیں گے ہم
ابھی غیر دلچسپ ہو جائیں گے ہم"

عالمی حالات حاضرہ پر بغیر کسی تبصرہ کے شاعر اپنی سلامتی کو ہی غنیمت شمار کرتا ہے۔ کیونکہ اس سلامتی میں قلب ماہیت کا امکان تو ہے۔ خدشہ یہ ہے کہ ابھی اس سے زیادہ تاریکی پھیل جائے گی۔ قدروں کی دنیا میں ایک قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ مرگ احساس کو ہی اذیتوں کا مداوا سمجھ لیا گیا تو اور غضب ہوگا۔ ہمارا وجود بھی کالعدم ہوگا۔ ماضی ہیچ اور روایتیں ناقابل اعتنا سمجھی جائیں گی۔

انسان وقت کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ اور پھر وقت ہی اسے اپنے دامن میں ہمیشہ کے لئے چھپا لیتا ہے۔ ہم وقت کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ کہتے ہیں سمے بڑا بلوان ہے۔"

عمیق حنفی "کھیتی" میں نوحہ کناں ہیں۔

"وقت کی کھیتی ہیں ہم
وقت بوتا ہے، اگاتا پالتا ہے۔
اور بڑھنے کے مواقع بھی ہمیں دیتا ہے وقت۔
. . . . ہاں — مگر انجام کار
کاٹ لیتا ہے ہمیں۔
ہم، بالآخر اس کے نغمے
ہم بالآخر اس کی فصل۔"

یہ انسانی زندگی کی بے وقعتی و بے چارگی کا سیدھا سادہ فلسفیانہ بیان ہے۔ وقت کا بے رحم ہاتھ ہمیں بناتا اور توڑتا رہتا ہے، خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں۔ حیات و ممات کا یہ سلسلہ ایک عظیم حقیقت ہے۔ جبر و شر کی اس گرد [illegible] سے ہم کہاں تک [illegible] رہ سکتے ہیں۔"

پارہ سکتے ہیں۔ تاریخ سے عیاں ہے۔

صبا اکرام نے بڑے موثر پیرائے میں اپنی نظم "سیتہ" میں کہا ہے۔

" میں آئینہ در آئینہ
تاریخ کا اک سلسلہ
آنکھوں میں میری سب عیاں
شہناز کے ننگے بدن پر
داغ نیلے زہر کا۔
مرحوم کی گردن پہ
شہرت کی بیربلی کے کاٹے کا نشان
طوفان زدہ ساحل پہ ننگی لاش کی
تصویر ہے اخبار میں
بہو کی نظر میں ڈالروں کا عکس ہیں
ماں اور بیٹی کچھ نہیں
چہروں کا سارا کھیل ہے۔
چہرے کو تم بھی ڈھانک لو
چہرے کو ہم بھی ڈھانک لیں"۔

نیکی و بدی کی یہ ستیزہ کاری اصلی سے تا امروز چہروں کو داغدار کر رہی ہے۔

مجرمانہ خطا جتنی صدق احب بصیرتی ہیں تو ان کی تذہی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی تربیت و شائستگی اور ضبط و انضمام کو ہی تہذیب اور کلچر کہتے ہیں۔ عصر نو کی شکستہ حالی نے ہماری تہذیبوں کے پرخچے اڑا دئے ہیں کوئی چہرہ صاف نہیں، کوئی دل پاک نہیں۔

صبا کی یہ کامیاب نظم ایک انفعالی کیفیت پیدا کرنے کا سارا حسن رکھتی ہے۔

ان شعراء نے کھلے ہوئے ذہن کے ساتھ بڑی وسیع النظری سے مقامی اور عالمی تحریکات و سانحات کو دیکھا سمجھا اور اس کا اثر لیا ہے۔ شاعر عوام میں رہ کر عوام سے الگ ہوتا ہے مگر اس کی دروں بینی اور ترسیل کی خواہش اسے بے چین رکھتی ہے۔ وہ اپنی تخلیقات کے سہارے اپنا امن و سکون کا جویا ہے۔ نئی شاعری کے ان اقتباسات سے مبرہن ہے کہ شاعروں نے عصر حاضر کی پیدا کردہ ذہنی پیچیدگیاں، دماغی الجھنوں اور ان کربناکیوں کو جو سائنسی اور میکانکی ترقی نے عطا کی ہیں۔ کسی شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ یہ شاعری احساسات و خیالات کا مجرد اظہار اور عریاں حقیقتوں پر ایک بے لاگ ملامتی تبصرہ ہے۔ تشکیک اور متزلزل عقیدوں نے سکون و طمانیت قلب چھین لی ہے۔ درد و غم اور تردد اضطراب شاعر و قاری میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہاں فرق صرف یہ ہے کہ [illegible] (ATTITUDE) کا ہے۔ نیا شاعر خود کو کسی نظریے کے سنہرے [illegible] میں بند نہیں کرتا۔ وہ سیاہ و سفید صداقتوں کا [illegible] اور یہی آج ادب کا عالمی معیار ٹھہرا۔

ہر چند پریشانی خاطر و انتشارِ فکر نے شاعری کو [illegible] موسیقی سے محروم کر رکھا ہے۔ تاہم اردو کی نئی شاعری بھی اس کی شعوری کوشش ملتی ہیں۔ عموماً غزلوں میں کیونکہ غزل آج بھی کم از کم ہیئتی طور پر روایت کی پابند ہے۔

بلاشبہ اردو کا نیا شعری ادب اس لحاظ سے کامیاب و موقر ہے کہ اس میں حقیقتوں کی صلاحیت اور سچائیوں کی چمک موجود ہے۔ یہ ماحول کا کھردرا نغمہ ہے یا وقت کا پتھریلا گیت ہے

ایک شعر

اذن بیداری ملا تھا جذبۂ تخلیق کو
قافلہ ایام کا جب عالم غفلت میں تھا

(کرامت علی کرامت)

یوسف جمال

آرزوؤں کی شہریت

ایک دن ایسا ہوا! آرزوؤں کے سلگتے زخوے کو کاٹ کر
اپنے ہی ہاتھ کی مفلوج قوت سے دبا کے۔
اس کو اک اندھی گپھا میں پھینک آیا، جس جگہ مایوسیوں کا سرغنہ تھا
(تھی امانت جس کی اس کو سونپ دی۔)
لیکن آخر یہ ہے کیا؟
ٹھوکروں پر کون مجھ کو مارتا ہے پے بہ پے
دھندلی آنکھوں سے جو دیکھا غور سے
آگئی ہیں لوٹ کر وہ آرزوئیں جن کو میں —
— اندھی گپھا کی سلطنت میں
چھوڑ آیا تھا، انھیں شہری بنا لو آج سے
اور مجھ سے کہہ رہی ہیں!! —
— ایسی بھی کیا بے رُخی۔! کیا ہو گئے بیگانہ ہم
یاد کر ان ساعتوں کو، کرب کے ان چیختے لمحات کو
جبکہ تو مایوسیوں کے غار میں دھنستا ہی جاتا تھا مدام
تجھ کو دیتے تھے نیا اک حوصلہ
ہم اڑاتے تھے تجھے امیدوں کے اونچے فلک پر
سوچتا ہے کیا؟
سو گیا ہو تو جگا دے اپنے اس احساس کو
اور پھر دے راہ آنے کی ہمیں —
— ہم تجھے دیں گے سکونِ لازوال

★

تیرا ہے جب تک وجود
ہم نہ چھوڑیں گے تجھے،
ہم تعاقب میں ہیں تیرے بھاگتا ہے تو کہاں
ہم ترے پیچھے رہیں گے، تجھ کو دوڑاتے رہیں گے —
— جسم خاکی میں ترے جب تک ہے یہ روحِ رواں
اور میں سوچتا ہوں وحشتوں کے سائے میں بیٹھا ہوا
کیا انھیں پھر سے دوں کا شانۂ دل میں جگہ؟
کیا کروں؟ پھر کلہاڑی کا ماروں اپنے پاؤں پہ
اور پھر جب سوچتا ہوں
دھیان یہ آتا ہے مجھ کو
آرزوئیں میرے مردہ جسم کو بھی بخشنے والی نہیں۔
اس کا یہ مطلب ہوا: آرزو ہی زندگی کا نام ہے —
— آشفتہ جاں را آشفتہ حال ہو

★

نعیم پرواز

غزل

دیکھ سکتے ہیں نہ یہ آئینہ دکھلاتے ہیں
لوگ اندھوں کی طرح وقت سے ٹکراتے ہیں

ان خیالات کو اک جسم کی حدّت بخشو!
جو اندھیرے کی طرح روح پہ لہراتے ہیں

اپنے چہرے پہ متانت کا اجالا لے کر
لوگ دو گام بھی چلتے ہوئے گھبراتے ہیں

ختم ہوتا نہیں تکمیل کا تاریک سفر
کتنے ملتے ہیں یہاں سے کتنے بچھڑ جاتے ہیں

جلتے دن رات ہیں جلتے ہوئے صحرا کی طرح
وہ بھی بہتے ہوئے دریا کی قسم کھاتے ہیں

وار کرتی ہوئی پرچھائیاں ڈستے سائے
ذہن تنہا ہو تو احساس سے ٹکراتے ہیں

کرب کی راہ سے گزرو تو نہ آنکھیں کھولو
اس اندھیرے میں حسین خواب نظر آتے ہیں

فکر مجروح سے تخلیق کا لمحہ چپ ہے
سوچ پاتے ہیں نہ کچھ راز ہی کھل پاتے ہیں

میرے سینے میں اتار دو مرے الفاظ کی روح
ورنہ چہرے پہ لکھے حرف تو ڈھل جاتے ہیں

تو بھی صحراؤں سے آلودہ نگاہی لے آ
تشنگی ہم بھی سمندر سے اٹھا لاتے ہیں

وہ چلے آئیں کبھی اپنی طرف بھی پرواز
بارہا جن کی طرف ہم بھی چلے جاتے ہیں

★

مہدی پرتاپگڈھی

غزل

لبوں سے جام تک جو فاصلہ ہے
اسے کچھ میرا دل ہی جانتا ہے

خود اپنے گرد اپنی ہی انا سے
یہ کیسا جال میں نے بن لیا ہے

فراتِ وقت سے گزرے ہیں پیاسے
ہمارا زندگی بھی کربلا ہے

خرد کا جس کے شہرہ ہر طرف تھا
تمہارے شہر میں رسوا ہوا ہے

گزرتی ساعتو! آواز دینا
مری ہستی کا جنگل بے صدا ہے

تقدس نور کا لٹنے نہ پائے
سویرا دھند میں لپٹا ہوا ہے

نہ ڈھونڈو زندگی تنہائیوں میں
یہاں جو بھی ملا تنہا ملا ہے

اشارہ کیا ہے دیوانے نے تیرے
یقیناً یہ خرد کی انتہا ہے

یہ کیسا وقت ہے حدِ نظر تک
مجھے اک پیاس کا صحرا ملا ہے

تباہی بے کسی، محرومیٔ دل
یہی مہدیؔ مقدر کا لکھا ہے

★

شان بھارتی

غزل

مجھ کو خود اپنی ذات میں کیا کیا دکھائی دے
ایک ایک لمحہ عمر کا دھوکا دکھائی دے

کیا اس کی وسعتوں کا نظارہ دکھائی دے
جب کائنات وقت کا نقطہ دکھائی دے

آلودۂ فریب ہے جیسے ہر ایک سمت
آئینہ بھی تو عکس کا مارا دکھائی دے

ممکن ہے کہ خلا میں اپنے کو ڈھونڈھ لو
ہر شے مرے وجود کا سایا دکھائی دے

زیبِ صلیب ہونے کو کتنے ہوئے
ممکن نہیں کہ پھر کوئی عیسیٰ دکھائی دے

توصیف کے پہاڑ پہ بیٹھا ہوا وہ شخص
حیرت یہ ہے کہ شانؔ کو چھوٹا دکھائی دے

★

ڈاکٹر اقبال ماہر

غزل

پرچھائیوں کا ایک ہیولا تھا کوئی شخص
کچھ بھی نہیں فریب تماشا تھا کوئی شخص

چہرہ بہ پردہ پردہ بہ چہرہ تھا کوئی شخص
موسم کی طرح رنگ بدلتا تھا کوئی شخص

وہ مفلسی تھی فاقہ کشی تھی کہ ضعفِ عمر
گر گر کے بار بار سنبھلتا تھا کوئی شخص

صورت الگ، خیال جدا، رنگ مختلف
ہمزاد بن کے دل میں جو بیٹھا تھا کوئی شخص

موجِ نشاط، جشنِ طرب، رونقِ جلوس
اتنے بڑے ہجوم میں تنہا تھا کوئی شخص

آغوش میں تھا ایک سمندر لئے ہوئے
ساحل کی طرح دھوپ میں پیاسا تھا کوئی شخص

اپنے گناہ و عیب چھپانے کے واسطے
اوروں پہ فردِ جرم لگاتا تھا کوئی شخص

ہر صبح و شام اک نئے شاطر کے ہاتھ میں
شطرنج کی بساط کا مہرا تھا کوئی شخص

ماہرؔ وہ نقش پا ہے فروزاں اسی طرح
مدت ہوئی مکان میں آیا تھا کوئی شخص

عزیز الرحمٰن

غزل

آلامِ روزگار کا یکجا جواب تھا
وہ شخص زندگی کی نرالی کتاب تھا

گھر میں رہا تو مجھ سے اداسی چمٹ گئی
باہر گیا تو دھوپ کا سر پہ عتاب تھا

یہ زندگی تھی جیسے گناہوں کی تیرگی
سانسیں رکیں تو جیسے کوئی آفتاب تھا

باہوں میں میری خواب کی باہیں نہ آسکیں
صحرائے بے کنار میں وہ اک سراب تھا

ہر آنکھ شعلہ بار تھی ہر دست تیشہ زن
جینا تمہارے شہر میں جیسے عذاب تھا

ہونٹوں پہ اس کے زہر تھا نیلے سکوت کا
آنکھوں میں اسکی میری ہوس کا جواب تھا

اک اور بوجھ ٹوٹ کے سینے پہ گر پڑا
بارِ گناہ دل میں مرے بے حساب تھا

چکنی زمین دیکھ کے سویا تھا میں عزیزؔ
سو کر اٹھا تو قیمتی کپڑا خراب تھا۔

حسن جعفری

غزل

دامنِ فکر پہ بکھرائیے اسلوبِ عبق
کھینچئے ذہن کے آکاش پہ ندرت کی شفق

ڈھونڈھئے خوفِ الم سے نہ کبھی راہِ فرار
لیجئے درد کے مکتب میں مسرت کا سبق

آج پڑھئے نہ مہکتے ہوئے زخموں کی کتاب
پھاڑ کر پھینکئے لمحات کا فرسودہ ورق

زندہ لاشوں کی طرف ذہن بھی کچھ ہو مرکوز
فکر میں لائیے پھر آپ مضامینِ ادق

کب اٹھے گا مری دنیا سے غریبی کا سوال
رہ گئی ہے دلِ عشاق میں تھوڑی سی رمق

جعفریؔ بحر و قوافی کا ہوں پابند... مگر
رہ گیا ہاتھ میں اشعار کا بس چہرۂ فق

★

ڈاکٹر سلام سندیلوی

اُردو شاعری کا نرگس

ریاض خیرآبادی ـــــ ایک خود بیں شاعر

نوٹ :۔ ۲۸ر جولائی ۱۹۸۱ء کو میرے غریب خانے پر یوم ریاض خیرآبادی، جن کا انتقال ۲۸ر جولائی ۱۹۳۴ء کو ہوا تھا، منایا گیا۔ اس جلسہ میں میں نے یہ مضمون پیش کیا تھا۔

سلام سندیلوی

خود بینی نرگسیت (NARCISSISM) کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت ہے۔ اسی بنا پر کرن ہارنی نے خود بینی کا ذکر نرگسیت کے سلسلے میں سب سے پہلے کیا ہے[1]۔ نرگسیت کے دیگر پہلو اس قدر اہم نہیں ہیں کہ جتنی اہم خود بینی ہے، کیونکہ خود بینی کا براہ راست تعلق خود پرستی سے ہے۔ خود بینی کی اہمیت اس بات سے واضح ہو جاتی ہے کہ یونانی جوان رعنا نرگس نے جب اپنی شکل چشمہ کے پانی میں دیکھی تو خود پر عاشق ہو گیا۔ اس لئے جب انسان اپنی ہی ذات میں محو رہتا ہے تو اس میں خود بینی کا جذبہ ابھرتا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم خود بینی پر غور کریں یہ ضروری ہے کہ "خود" کو سمجھ لیں۔ خود کو انگریزی میں (SELF) کہتے ہیں۔ ہم خود کو "انا" اور "ایغو" کے مفہوم میں بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ جب انسان اپنی ذات کی پرستش میں مصروف رہتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی ساری توجہ خود پر مرکوز ہے۔ گارڈنر مرفی کا قول ہے کہ جب انسان چند مہینوں کا بچہ ہوتا ہے اسی وقت سے وہ اپنی ذات سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ جب وہ مچلتا ہے اور لڑھکتا ہے یا جب وہ اپنے انگوٹھوں سے کھیلتا ہے تو اس وقت وہ اپنی ذات سے واقف ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنی حرکات جسمانی سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے۔ بچہ جیسے جیسے عمر کی منزلیں طے کرتا ہے اسی اعتبار سے وہ اپنی ذات سے واقفیت حاصل کرتا ہے اور خود سے بحث کرنے لگتا ہے[2]۔

ڈیوڈ سی میکلی لینڈ نے بھی انسانی ذات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کا قول ہے کہ چونکہ انسان ساری کائنات کا علم رکھتا ہے اور انسان کائنات کے اندر شامل ہے اسلئے انسان کو اپنی ذات کا بھی علم ہوتا ہے[3]۔

برزمین نے بھی انا (EGO) کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا قول ہے کہ انا عمل کے اصول کے تحت انسان

(1) NEW WAYSIN PSY CHAANALYSIS BY KARENHORNEY. P, 88

(2) AN INTRADUCTION TO PSYCHOLOGY BY GARDNER.MURPHY P. 448

(3) PERSONALITY BY DAVID C. MECLETLAND, P. 529,

کی اپنی ذات کے بارے میں واقفیت کا نام ہے۔ [1]
غرض کہ ہر انسان کو اپنی ذات کا علم ہوتا ہے۔ اور وہ خود کو پہچانتا ہے۔ اسی خود کے علم سے خود بینی نمودار ہوتی ہے۔ جس کو انگریزی میں VANITY کہتے ہیں۔

الفریڈ ایڈلر کا قول ہے کہ جب خود شناسی کی خواہش انسان پر غالب آجاتی ہے تو اس کے دماغ میں کشاکش پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان اپنی برتری کا اظہار کرنا چاہتا ہے اور وہ فتوحات کی طرف قدم بڑھاتا ہے ایسا انسان حقیقت کے مفہوم کو بھلا دیتا ہے کیونکہ وہ اپنی ذات میں غرق رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ دیگر افراد کی رائے اس کے بارے میں کیا ہے۔ جب انسان کے دماغ میں یہ خیالات گردش کرتے ہیں تو اس میں غرور و ناز پیدا ہو جاتا ہے۔

خود بینی بعض اوقات اپنے اصل لباس میں جلوہ گر نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ اس پر ایک لبادہ پڑا رہتا ہے ایسا انسان دوسروں کی رائے پر غور نہیں کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ عوام کی ستائش کا خواہاں رہتا ہے۔ جب خود بینی حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ایسا انسان فضول باتوں میں وقت ضائع کرتا ہے اور بے سود کوشش کرتا ہے۔ اس کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہ ہے کہ کہ وہ حقیقت (REALTY) کو فراموش کر دیتا ہے۔

کچھ لوگ خود بینی کو چھپانے کے لئے اس کا کچھ اور نام رکھ لیتے ہیں۔ مثلاً خود بینی (VANITY) کو اعلیٰ حوصلگی (AMBITIORN) تصور کرتے ہیں۔ دراصل اعلیٰ حوصلگی اگر جماعت کے لئے مفید ہے تو یہ قابل ستائش جذبہ ہے۔ مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کا قول ہے کہ بغیر اعلیٰ حوصلگی کے عظیم انسانی کارنامے ظہور پذیر نہیں ہو سکتے ہیں۔ درست ہے مگر اعلیٰ حوصلگی کے پردے میں خود بینی پوشیدہ رہتی ہے۔ جو مضر ہے۔ کیونکہ بعض اوقات خود بین شخص جماعت کے افراد کو نقصان پہنچا کر ترقی کرنا چاہتا ہے۔ خود بینی شخص کی ذاتی تمنا اور سماج کے فلاح میں تصادم ہوتا ہے۔ کیونکہ خود بین شخص چاہتا ہے کہ کامیابی کا سہرا صرف اس کے سر رہے۔ [2]

خود بینی کو سمجھ لینے کے بعد اب ہم اصل موضوع طرف آتے ہیں۔

ریاض خیرآبادی کی شخصیت اور شاعری کے [illegible] سے پتا چلتا ہے کہ یہاں خود بینی کا جذبہ موجود تھا۔ [illegible] خود بینی کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں جن پر غور کرنے ضرورت ہے۔

ریاض خیرآبادی کا تعلق ایک اعلیٰ خاندان تھا۔ مولوی سبحان اللہ صاحب نے ریاض کے خاندان پر مندرجہ ذیل سطور میں روشنی ڈالی ہے۔

" سید ریاض احمد صاحب نسباً سید حسینی ہیں۔ ان کے آباء و اجداد ہندوستان میں آنے سے پہلے ایران کے قصبہ کرمان میں رہتے تھے۔ وہاں سے ان کے مورث علاؤ الدین کے زمانے میں ہندوستان آئے۔ یہاں اس بادشاہ کی فوج میں کوئی عہدہ بھی رکھتے تھے ان کی فوج ایک مہم سر کرنے کے لئے بھیجی گئی وہاں فتح حاصل کرنے کے بعد یہ لوگ چند ٹکڑوں میں بٹ گئے اور ضلع بارہ بنکی و سیتا پور کے مختلف مقامات پر آباد

---

1) GENERAL PSYCHALOGY BY ROBERT EDWARD BRENNAN, P. 350

2) UNDERSTANDING HUMAN NETURE BY ALFRED ADBER P. 142-143.

ہو گئے۔[1]

مولوی سبحان اللہ صاحب کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ ریاض خیرآبادی کے آباد اجداد ایران کے باشندے تھے۔ جب وہ لوگ ہندوستان آئے تو بادشاہ علاؤالدین خلجی کی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ اس لحاظ سے بھی خیرآبادی کو خاندانی برتری حاصل تھی۔ ریاض کی خود بینی کا یہ ایک سبب ہو سکتا ہے۔

رئیس احمد جعفری نے بھی ریاض خیرآبادی کی عظمت پر روشنی ڈالی ہے۔ ریاض، رئیس احمد جعفری کے نانا سید نیاز احمد انسپکٹر حلقہ میرٹھ کے بڑے بھائی تھے۔ اس لئے ۔۔ رئیس احمد جعفری کو ریاض کے بارے میں مستند معلومات حاصل ہیں۔

چنانچہ وہ ریاض کے خاندان کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

> ریاض صاحب کے آبائے کرام میں اکثر حضرات سلاطین روزگار کی جانب سے معزز عہدوں پر مامور ہوئے۔ چنانچہ خیرآباد کا عہدۂ قضا آپ ہی کے خاندان سے مختص تھا۔ جس کے صلہ میں شاہانِ وقت کی طرف سے جاگیریں بھی عطا ہوئی تھیں، جو کم و بیش غدر کے زمانے تک باقی رہیں۔ خیرآباد کا محلہ قضیارہ اسی عہد کی یادگار ہے۔ ریاض کے والد ماجد سید طفیل احمد صاحب بڑے پایہ کے عالم تھے۔ آپ کا نسب حضرت مخدوم شیخ سید رحمۃ اللہ کے خلیفہ حضرت قاضی سید بخش رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ سے سید شجاع کرمانی تک پہنچتا ہے۔ حضرت قاضی سید بخش کا مزار مکانِ ریاض سے متصل ہے۔ انہیں کے زیرِ سایہ بزرگانِ ریاض محو خواب ہیں۔[2]

انسان جب اپنی خاندانی برتری کو محسوس کرتا ہے تو اس میں خود بینی کے جذبات ابھرتے ہیں۔ ایسا انسان خود کو دوسروں سے افضل و برتر تصور کرتا ہے۔ مثلاً غالب کو ہمیشہ اپنی خاندانی برتری پر ناز رہا ہے۔ جس کا اظہار انہوں نے مختلف اشعار میں کیا ہے۔ اسی طرح ریاض کو بھی اپنی خاندانی برتری پر فخر ہو سکتا ہے۔

دراصل ریاض کی خود بینی کا سب سے بڑا سبب ان کا حسن و جمال ہے۔ ریاض نہایت خوبصورت اور حسین و جمیل انسان تھے۔ جس طرح یونان کے نرگس کو اپنے حسن و جمال پر ناز تھا۔ اسی طرح ریاض بھی اپنے حسن و جمال پر خود فریفتہ تھے۔ رئیس احمد جعفری ان کی شکل و شباہت کے بارے میں "رندِ پارسا" میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ " (ریاض) بے حد حسین تھے۔ آگے چل کر انہوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ ریاض کے حسن پر روشنی ڈالی ہے۔

> "کچھ جھومتے ہوئے چلنا ریاض کی وہ ادا تھی جو جوانی اور بڑھاپے ہر دور میں قائم رہی ان کی ہر چیز میں ندرت تھی۔ ان کی وضع قطع لباس ۔۔۔ معاشرت، چال ڈھال کوئی چیز بھی عام لوگوں کی سی نہ تھی۔ سب میں انکی انفرادیت جھلکتی تھی۔ رنگ گورا، قامت کشیدہ آنکھیں بڑی بڑی، آواز نہ بلند نہ پست۔[3]

انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ جوانی میں ریاض بڑی بڑی مونچھیں رکھتے تھے اور داڑھی منڈواتے تھے۔ اس لئے

---

[1] رندِ پارسا۔ رئیس احمد جعفری صفحہ ۵۸۔ [2] رندِ پارسا۔ رئیس احمد جعفری صفحہ ۵۹۔۶۰۔
[3] رندِ پارسا۔ رئیس احمد جعفری۔ صفحہ ۲۴۴۔

وہ ایک بانکے جوان نظر آتے تھے۔ ریاض کے بڑھاپے کی بھی انھوں نے تصویر کشی کی ہے۔ جب رئیس احمد جعفری کے والد صاحب کا انتقال ہوا تو ریاض ان کے گھر ماتم پرسی کے طور پر گئے۔ ریاض کی اس وقت کی تصویر رئیس احمد جعفری مندرجہ ذیل سطور میں کھینچتے ہیں۔

"اچھا خاصا لمبا تڑنگا قد، گورا رنگ، سفید ڈاڑھی ایک انگرکھا پہنے ہوئے بڑے پائنچے کا پاجامہ، سر پہ بید کی جالی دار ٹوپی۔" [1]

ان بیانات سے یہ بات قطعی واضح ہو جاتی ہے کہ ریاض خیرآبادی کو خدا نے حسن و جمال عطا کیا تھا۔ اسی بنا پر ان کے مزاج میں خود بینی غالب آگئی تھی۔ ان کی خود بینی کا یہ دوسرا سبب بہت اہم اور قابل غور ہے۔

ریاض کی خود بینی کا تیسرا سبب یہ ہے کہ ان کو ہمیشہ عشق و محبت میں کامیابی ہوئی۔ فرائڈ کا قول ہے کہ جب عاشق ناکامی کا سامنا کرتا ہے تو اس کی خودداری کے شعلے مدھم پڑ جاتے ہیں۔ مگر جب اس کا محبوب بھی اس کی محبت کا جواب فریفتگی سے دیتا ہے تو عاشق کی خودداری کی لو تیز ہو جاتی ہے اور اس کے دل میں خود بینی کی چنگاریاں بھڑکنے لگتی ہیں۔ [2]

ریاض کے سلسلے میں رئیس احمد جعفری نے اس کی تصدیق کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ریاض بہت حسین تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا عشق کبھی یک طرفہ نہیں رہا۔ اس لئے وہ اپنی محبت میں ناکام بھی کبھی نہیں ہوئے۔ [3]

دراصل ریاض کے عشق نے سرزمین گورکھپور میں آکر لاگ کھلائے۔ یہاں کی زمین عشق کے لئے ان کو بہت راس آئی۔ یہاں کی خاک "زمین شور" نہیں تھی جس سے "سنبل نہ اگے" ریاض کے والد صاحب گورکھپور میں سب انسپکٹر پولیس ہو کر آئے۔ اس وقت ریاض کا عنفوان شباب تھا۔ اس دور کی ریاض کی ایک تصویر رئیس احمد جعفری مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

"گورکھپور ریاض کے لئے صرف شہر نہیں تھا جہاں دبدبے اور طنطنے کے ساتھ انکے والد داد حکومت دے رہے تھے۔ جہاں وہ مشق امروز میں مصروف اور غم فردا سے بے گانہ تھے۔ جہاں دوستوں کی بزم آرائیوں اور محفل طرازیوں کے رونق بنے ہوئے تھے بلکہ وہی ریاض کا گہوارۂ شباب تھا۔ یہیں ان کی جوانی نے انگڑائیاں لیں۔ یہیں اس نے چشمک زنی سیکھی۔ یہیں عروج وارتقاء کے منازل تک پہنچی۔ گورکھپور سے ریاض کو وہی نسبت تھی جو مجنوں کو نجد سے تھی۔ یہ ان کا نجد تھا۔ وہ اگر کرشن تھے تو گورکھپور ان کا متھرا تھا۔ یہاں کی گوپیوں میں وہ واقعی کرشن کنھیا نظر آتے تھے۔" [4]

ریاض کی گورکھپور کی زندگی کے بارے میں مجنوں گورکھپوری نے بھی اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

"یوں تو ریاض عمر بھر جوان بنے رہے اور حسن کے ساتھ دم بھر کو بیٹھے اس کو جوان بنا دیا۔ لیکن ریاض کی وہ جوانی جس کو عرف

---

[1] رند پارسا۔ رئیس احمد جعفری صـ ۹

[2] GENERAL POYCHALSGYELTHERY BY FREUD EDITED BY PHILIPREEFF P.78

[3] رند پارسا۔ رئیس احمد جعفری۔ ص ۴۳۔ [4] رند پارسا۔ رئیس احمد جعفری۔ صـ ۴۲

عام میں بھی جوانی کہتے ہیں، واقعی دیوانی تھی۔
ان کی شاعری کا ایک ایک حرف اس کا غماز ہے۔ گورکھپور کی سرزمین ان کے ولولۂ شباب کی شاہد ہے۔ گورکھپور نے ان کی جوانی کے لئے جولاں گاہ مہیا کی اور انھوں نے اپنی شاعری سے گورکھپور کو غیر فانی بنا دیا۔"

فراق گورکھپوری نے بھی ریاض کی مستانہ زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔

"ریاض غیر معمولی ذہانت کے آدمی تھے۔ ان پر جوانی اور زندگی پھٹی پڑتی تھی۔ لکھنؤ کے دورِ انحطاط میں لکھنؤ کی سو برس کی بزم آرائیاں سمٹ کر ان کی شخصیت میں سما گئی تھیں۔ اور وہ تمام بانکے عاشق اور ماہ پارہ عورتیں جنھوں نے کبھی لکھنؤ بنا دیا تھا، سب کے سب ریاض کی زندگی کا جز ہو گئے تھے۔ سو برس کے لکھنؤ نے اپنے آخری لمحوں میں ریاض کے اوپر اپنے آپ کو صدقے کر دیا تھا۔ لٹا دیا۔ پورا لکھنؤ سمٹ کر ریاض بن گیا تھا۔" [1]

اس کے بعد فراق نے ریاض کے بارے میں ایک اور عبارت لکھی ہے۔

"بجائے اس کے حسن اور عشق کی کیفیتیں ریاض پر طاری ہوں خود ریاض ان کیفیتوں پر چھائے نظر آتے ہیں۔ ؎

ہم آ گئے، ہم پا گئے، ہم لے گئے ان کو
وہ کھو گئے کوچۂ دشمن سے نکل کر

یہ شخص شاعر ہے یا کرشن کنہیا۔

درحقیقت ریاض کی زندگی بڑی رومان پرور تھی۔ عشق ان کی رگ و پے میں خون بن کر رواں دواں تھا۔ انھوں نے اپنے عشق کے قصے بذاتِ خود بیان کئے ہیں۔ وہ اپنے پہلے رومان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ بچپن میں کسی رئیس کے یہاں رہتے تھے۔ چونکہ خاندانی روابط تھے۔ اس لئے ان کے یہاں کی عورتیں ان سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ لیکن دو ناکتخدا لڑکیاں پردۂ حجاب میں مستور رہتی تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکی پر ریاض عاشق تھے۔ ایک روز گھر کے مرد علاقے میں چلے گئے تھے۔ اور بیبیاں کسی تقریب میں شرکت کے لئے چلی گئیں تھیں۔ ریاض نے سوچا کہ ملاقات کا سنہرا موقع ہے چنانچہ وہ رات کی تاریکی میں کمرے میں داخل ہو گئے۔ جہاں لڑکی محوِ خواب تھی۔ انھوں نے اس کے رخِ گل گوں سے آنچل سرکایا۔ لڑکی بیدار ہوئی۔ وہ چیخنے والی تھی کہ ریاض نے اپنا نام بتا دیا۔ وہ لڑکی خود ریاض پر بری طرح فریفتہ تھی۔ ریاض خود بھی شرعی حدود میں رہنا چاہتے تھے۔ اور اس لڑکی نے بھی اس بات پر زور دیا کہ عقد ہو جائے اس لئے ریاض نے اس لڑکی سے عقد کرنے کی کوشش کی مگر والدین راضی نہ ہوئے۔ اور ریاض کی شادی دوسری جگہ کر دی گئی۔

بہرحال اس واقعہ سے یہ امر تو واضح ہو ہی جاتا ہے کہ محبوبہ خود ریاض کی محبت میں گرفتار تھی۔ ایک تو ریاض خود خوش رو تھے۔ پھر محبوبہ ان پر جان صدقے کرنے کے لئے تیار تھی۔ ایسی صورت میں ریاض کی خود بینی کے جذبہ کی نمود بالکل فطری ہے۔

ریاض نے شادی کے بعد ایک عشق اور کیا۔ اس عشق کا نقشہ رئیس احمد جعفری نے جن حسین الفاظ میں پیش کیا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہی عبارت یہاں درج کر دی جائے۔!

"ایک شریف غیر مسلم گھرانا ہے۔ ریاض وہاں آتے جاتے تھے اور ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے۔ مگر کیا ہے۔ چمنستان ہے۔ سبد گل ہے۔ باغ رضوان ہے۔ ایک گل رعنا سے آنکھ لڑتی ہے۔ محبت کے پینگ بڑھتے ہیں۔ ملاقات بے تکلفی

میں بے تکلفی انس میں ـــ انس محبت میں۔ اور محبت عشق میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ایک طرف عشق ہے جو چاک گریبانی اور بادیہ پیمائی پر آمادہ ہے۔ دوسری جانب حسن ہے۔ جو ایک گل نو دمیدہ کی طرح کھل رہا ہے باغ ہستی کی ہوائیں اس میں تازگی پیدا کر رہی ہیں حسن نہ احساس خودی سے محروم ہے نہ شوق جلوہ آرائی سے۔ وہ اپنی بے پناہیوں کی پرستش چاہتا ہے۔ یہ اپنی گہرائیوں کا اعتراف چاہتا ہے۔ اپنی انفرادیت پر نازاں بھی ہے اور مغرور بھی ہے[1]

مگر تفریق مذہب سدّ سکندری کی طرح حائل ہے۔ ریاض یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ ان کی محبوبہ کا خاندان ان کی دیوانگی کی بنا پر رسوا ہو جائے۔ اس لئے ریاض نے موقع کی نزاکت پر غور کرتے ہوئے ایک نئی راہ نکالی۔ وہ ایک طویل سفر پر نکل گئے۔ تاکہ محبوبہ کا خیال ان کے دل سے نکل جائے اور ان کی یاد محبوبہ کے دل سے مٹ جائے۔

ریاض اپنے طویل سفر سے کئی ماہ کے بعد واپس آئے اس کے آگے کی داستان رئیس احمد جعفری کی زبان سے سنئے۔

"ریاض اکئی مہینے کے بعد واپس آئے دریار تک پہنچے۔ معلوم ہوا کہ دق کی شکایت ہے۔ معالج جواب دے چکے ہیں۔ آگے بڑھے اور حریم ناز میں پہنچ گئے۔ دیکھا چہرہ جو اپنی تازگی میں پھولوں کو، جو اپنی تابانی میں ماہ تمام کو بجا اپنی شادابی میں گل تر شرماتا تھا، ہو کر ایک بے رونق ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ ریاض کہتے ہیں کہ اس مختصر ملاقات نے حسن کی حالت دگرگوں کر دی۔ چند لمحوں کی ملاقات ختم ہوئی اور ریاض واپس آگئے۔ دوسرے روز معلوم ہوا کہ حیا اور عصمت کی پتلی اس جہان آرزو سے ناکام و نامراد اٹھ گئی۔"[2]

یہ واقعہ بھی اس امر کو منکشف کرتا ہے کہ ریاض کی محبوبہ ان پر بھی بری طرح فریفتہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے پائے ریاض پر جان دیدی۔ انھیں حالات میں انسان خود بینی کا اسیر ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو ریاض کے ہاتھ میں خود بینی کا آئینہ نظر آتا ہے۔

اس کے بعد ریاض نے تیسرے عشق کی منزل میں قدم رکھا۔ اس بار انھوں نے ایک غیر مسلم طوائف سے محبت کی۔ جو "کوٹھے والی" کے نام سے مشہور تھی۔ چونکہ ریاض شرعی احکام کے پابند تھے اس لئے انھوں نے نکاح کی شرط رکھی۔ وہ طوائف ریاض کے عشق میں اس قدر دیوانی تھی کہ اس نے تبدیل مذہب کر کے ان سے عقد کر لیا۔ اور خانہ نشین ہو گئی۔ نکاح کے بعد ریاض اس کے ساتھ محبت کی زندگی گزارنے لگے۔ اور اس کے دست ناز سے جام عشق پینے لگے۔

غرض کہ ریاض بذات خود نہایت حسین اور خوش رو تھے۔ حسین اور خوش رو ہونے کے ساتھ ساتھ ریاض خوش پوش بھی تھے۔ اس پر قیامت یہ کہ طبیعتاً شوخ و شریر تھے۔ ریاض کی شوخی اور شرارت پر مجنوں گورکھپوری اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

"ریاض کی شوخ اور الھڑ طبیعت نے کبھی اس کو گوارا نہیں کیا کہ وہ معشوق کے سامنے ہار مان لیں۔ وہ معشوق سے بڑھ چڑھ کر رہتے تھے۔ اور بقول ہمارے دوست پروفیسر رگھوپت سہائے فراق گورکھپوری کہ حسن کی

---

[1] "رندِ پارسا" رئیس احمد جعفری صفحہ ۸۰ ـ ۸۱
[2] ،، ،، صفحہ ۵۱

شوخی اور شرارت اس کے عشق میں بیباکی کے سامنے حسرت و بیچارگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے کو عشق میں کبھی مجبور و مظلوم نہیں پایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معشوقوں نے جتنے ظلم اب تک عاشقوں کی جان پر توڑے ہیں وہ ان کا انتقام لینے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ وہ کبھی معشوقوں کے رحم و کرم کے محتاج نہیں رہے۔ جب جی میں آیا کہہ بیٹھے اور کر بیٹھے۔ چاہے معشوق راضی رہے یا ناخوش۔ [1]

سطور بالا میں ریاض کی خود بینی کے اسباب سے بحث کی گئی ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ ان کی شاعری میں خود بینی کی علامتیں کس حد تک پائی جاتی ہیں۔ ریاض نے بذات خود اپنے اشعار میں اپنے حسن و شباب کی تعریف کی ہے۔ مثلاً وہ ایک شعر میں کہتے ہیں۔ سہ

لاکھوں ہی جوانوں میں ریاض ایک جواں ہے
کمبخت حسینو!! اسے چاہو۔ اسے چاہو

اردو شاعری میں عام طور سے عاشق محبوب کے جمال پر فریفتہ ہوتا ہے۔ اور محبوب ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ اس کا عاشق اس پر اپنی جان قربان کر دے۔ مگر ریاض کے یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ریاض ایسے عاشق ہیں جو خود اپنے منھ سے اپنی جوانی کی تعریف کرتے ہیں اور پھر معشوق کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ ان سے محبت کریں۔ ریاض کا یہ شعر ان کی خود بینی کی ایک واضح مثال ہے۔

دنیا کی پڑ رہی ہیں نگاہیں ریاض پر
کس رنگ کا جوان ہے کس آن بان کا

ریاض کو اس بات کا زبردست احساس ہے کہ وہ حسن و شباب میں کامل ہیں۔ اس لئے جب بھی محبوب رقیب کی طرف مائل ہوتا ہے تو ان کو حیرت ہوتی ہے۔ سہ

کیا جانے کیوں رقیب بنا تھا گلے کا ہار
صورت میں وہ ریاض سے اچھا تو کچھ نہ تھا

ریاض نے ایک شعر میں اپنے شباب کو چھلکتے ہوئے مے سے تشبیہہ دی ہے۔ یہ تشبیہہ نہایت حسین اور مکمل ہے۔

یہ چھلکتا ہوا کیا جام شراب آتا ہے
اے میں قربان مرا عہد شباب آتا ہے

ریاض نے مندرجہ ذیل شعر میں بھی اپنی جوانی کی تعریف کی ہے۔ سہ

ہے ریاض اک جوان مست خرام
نہ پئے اور جھومتا جائے

ریاض کو پیری میں بھی جوان بننے کی خواہش ہے۔ ان کا قول ہے کہ سہ

پی لے اگر بڑھاپے میں تھوڑی سی یہ ریاض
دنیا پکار اٹھے کوئی رعنا جوان ہے

غرض کہ ریاض اپنے حسن و شباب پر یونانی کی طرح خود ہی فریفتہ ہیں اور حسینان عالم کو خود پر فریفتہ ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ محبوبوں سے اسی طرح ناز و غمزہ کرتے ہیں جس طرح عام طور سے محبوب عشاق کو انداز دکھاتے ہیں۔ ریاض کا مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ

چھیڑ کیسی، بات کہتے روٹھ جاتے ہیں ریاض
اک حسین ہر وقت ہو ان کو منانے کے لئے

روٹھنا معشوق کا کام ہے اور منانا عاشق کا کام چونکہ ریاض خود بین واقع ہوئے ہیں اس بنا پر روٹھتے ہیں اور ان کو معشوق منانے کی کوشش کرے۔ ریاض کا ذرا سی بات پر معشوق سے روٹھ جانا ملاحظہ

ان حسینوں نے کہا کیا کہ خفا ہو بیٹھے
بات کیا تھی کہ ریاض آپ برا مان گئے

ریاض کے روٹھنے کا انداز مندرجہ ذیل شعر میں ملاحظہ ہو۔ سہ

سب حسین تم کو منا لیں گے ریاض
بات کہتے روٹھ جانا کچھ نہیں

---

[1] "تذکرۂ پارسا" رئیس احمد جعفری، صفحہ ۹۴-۹۵

محبوب ریاضؔ کو کس طرح مناتا ہے یہ انداز بھی ملاحظہ فرمایئے۔ ؎

یہ کہہ کے کس نے گلے سے لگا لیا مجھ کو
ارے ریاضؔ مرا مجھ سے سرگراں کیوں ہے

اردو شاعری میں محبوب کا فرد ادا ہوتا ہے۔ مگر ریاضؔ کی کی دنیا دیگر عشاق کی دنیا سے جدا ہے۔ یہاں ریاضؔ خود کا فر ادا ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

ریاضؔ اچھی نہیں صورت تو کچھ پروا نہیں اسکی
ہماری وضع میں کیا ان سے کم کافر ادائی ہے

ریاضؔ نے ایک اور شعر میں اپنی کافر ادائی کا ذکر کیا ہے۔ ؎

چاہتے ہیں تجھے معشوق طرحدار ریاضؔ
تجھ میں کم بخت کہاں سے یہ ادائیں آئیں

دغا دینا زیادہ تر معشوق کا کام ہوتا ہے مگر ریاضؔ اپنے معشوق کو بڑے موقع سے دغا دے رہا ہے۔ ؎

نزع میں یار سے پیمان وفا کرتے ہیں
اس دغا باز سے ہم آج دغا کرتے ہیں

ریاضؔ بڑے نرالے عاشق ہیں۔ وہ معشوق کو جلا دیتے ہیں۔ ؎

جلا دیا کرتے ہیں دن رات حسینوں کو ریاضؔ
بڑی نٹ کھٹ بڑی چنچل ہے طبیعت میری

ایک شعر میں انھوں نے اپنے دل کی شوخیوں کا ذکر کیا ہے ؎

ہیں مزے کی اے دل بیتاب تیری شوخیاں
چل حسینوں پر تجھے صدقے کریں قرباں کریں

اردو شاعری میں محبوب کی جانب سے بے نیازی کا اظہار ہوتا ہے مگر ریاضؔ اپنے محبوب سے بے نیازی کا اظہار کرتے ہیں۔ ؎

فتنہ کا گزر اس بھری محفل میں نہیں ہے
چل اے نگہ ناز جگہ دل میں نہیں ہے

ریاضؔ معشوق کی کچھ بھی پروا نہیں کرتے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

کافر حسین ہو بلا سے خفا ہیں ہوا کریں
ہم سے خفا ریاضؔ ہمارا خدا نہ ہو

ریاضؔ معشوقوں پر ترس کھانے کے قائل نہیں ہیں ؎

پائیں تو اے حسینو تم کو رلا کے چھوڑیں
ہم کیا یہ ریاضؔ ایسے ان کو ترس نہ آئے

ریاضؔ حسینوں سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے ہیں ؎

دیوانہ ریاضؔ اوروں سے کیا بات کرے گا
معشوقوں سے وہ بات تو کرتا ہی نہیں ہے

ریاضؔ کے مندرجہ بالا اشعار ان کی خود بینی پر واضح طور پر دلالت کرتے ہیں۔ ان کی خود بینی کا ایک یہ بھی پہلو ہے۔ کہ وہ اپنی صورت کے علاوہ سیرت کی بھی تعریف کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان میں کوئی عیب ہی نہیں ہے۔ اس لئے لوگ ان سے ناخوش کیسے ہو سکتے ہیں ؎

کوئی ناخوش ریاضؔ سے کیوں ہو
اس روش کا وہ آدمی ہی نہیں

وہ اپنی خوش مزاجی کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ ؎

خوش ہو گئے ریاضؔ سے بھی مل کر
کیا باغ و بہار آدمی ہے

انھیں اپنی پاک دامنی کا بھی احساس ہے۔ ؎

بڑے نیک طینت بڑے پاک باطن
ریاضؔ آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

ان کو اپنی گفتگو میں بھی جادو نظر آتا ہے۔ ؎

ریاضؔ باتوں میں اپنی اگر نہیں جادو
پری کو شیشے میں یوں بھی اتار لیتے ہیں

ریاضؔ اپنی زبان کی تاثیر سے بھی آگاہ ہیں۔ ؎

سنیں تو بت بھی تیرا چوم لیں منہ
ریاضؔ اتنا اثر تیری زبان میں

اپنی چال کی بھی ریاضؔ تعریف کرتے ہیں۔ ؎

چلتے ہیں جب ریاضؔ تو کچھ جھومتے ہوئے
جیسے پئے ہوئے کوئی مست شراب ہو

ریاضؔ اپنے کو ایک پختہ کار انسان تصور کرتے ہیں ؎

نادان ہو ریاضؔ کو تم جانتے نہیں
وہ پختہ کارِ عشق، بڑا پختہ کار ہے

غرض یہ کہ ریاضؔ نے اپنے اشعار میں اپنی سیرت، اپنی خوش مزاجی، اپنی چال، اپنی پختہ کاری وغیرہ کی تعریف کی ہے جو ان کی خود بینی کی ایک علامت ہے۔

ریاضؔ کے دیوان میں بہت سے ایسے اشعار موجود ہیں جن میں انھوں نے اپنی زبان دانی کا دعویٰ اور اشعار پر ناز کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے مندرجہ ذیل اشعار قابل غور ہیں۔ ؎

ہم کو ریاضؔ جانتے ہیں مانتے ہیں سب
ہندوستان میں دھوم ہماری زباں کی ہے

ہندوستان میں دھوم ہے کس کی زبان کی
وہ کون ہے ریاضؔ کو جو جانتا نہیں

وہ میں ہوں آج زمانے کو ناز ہے جس پر
ریاضؔ دھوم ہے جس کی وہ ہے زبان مری

ریاضؔ اشعار سن کر فرشتے وجد کرتے ہیں
ملی کوثر سے دھو کر ایسی پاکیزہ زبان مجھ کو

حصے میں آگئی ہے جناب ریاضؔ کے!
پاکیزگی زبان کی ادائے بیاں کے ساتھ

ہم نے بھی ریاضؔ آپ کے اشعار سنے ہیں
یہ لطف بیان، لطف زبان ہو نہیں سکتا

مندرجہ ذیل شعر میں انھوں نے انکار یہ لہجہ اختیار کیا ہے مگر حقیقت میں ان کا مقصد اقرار یہ ہے۔ دراصل انھوں نے چلن کی آڑ سے اپنی زبان کی تعریف کی ہے۔

زباں پہ ہے عبث مجھ کو ناز یکتائی
ریاضؔ مجھ سے ہزاروں میں ایک تو کیا ہو

کہیں بہت کم کہ انھوں نے اپنی طبیعت اور اپنے رنگ کلام کی مدح سرائی ہے۔ مثلاً ؎

واہ کیا رنگ ہے کیا خوب طبیعت ہے ریاضؔ
ہو زمیں کوئی، تمھیں پھولتے پھلتے دیکھا

سچ ہے اب حضرت ریاضؔ یہ بات
کہ جدا سب سے ہے جناب کا رنگ

یہ خاص ڈھنگ ہمیشہ سے تیرا حصہ ہے
ریاضؔ جانتے ہیں سب تجھے تغزل میں

سن کے اشعار میرے سب یہی کہتے ہیں ریاضؔ
اس کی قسمت ہے بڑی اور طبیعت اچھی

شاعری ہے ریاضؔ کے دم تک
پھر کہاں لوگ اس طبیعت کے

ایک شعر میں ریاضؔ نے یہ بھی بتایا ہے کہ چونکہ اب وہ جہاں سے اٹھ رہے ہیں اس لئے طرز میر بھی اب دنیا سے ختم ہو رہی ہے۔ ؎

اٹھتی ہے اب جہاں سے میرؔ کی طرز
کہ ریاضؔ اب جہاں سے اٹھتا ہے

دراصل ریاضؔ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ میرؔ اور ریاضؔ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ میرؔ سوز و گداز کے شاعر ہیں اور ریاضؔ کی طبیعت باغ و بہار ہے۔ میرؔ کے یہاں یاس ملتی ہے اور ریاضؔ کے یہاں قدم قدم پر شگفتگی کے غنچے چٹکتے نظر آتے ہیں۔ ریاضؔ کے ایک اور شعر میں اپنے رنگ کلام کو ظاہر کیا ہے۔ ؎

کچھ کچھ ہے ریاضؔ میرؔ کا رنگ
کچھ شان ہے ہم میں مصحفیؔ کی

ممکن ہے کہ ریاضؔ میں مصحفی کی جھلک ہو مگر ان کی شاعری میں میرؔ کا رنگ قطعی نہیں ہے۔

ریاضؔ نے چند اشعار میں اپنے انداز غزل گوئی کی مدح کی ہے ؎

پڑھنا مشاعرے میں زیبا ریاضؔ کو ہے
بلبل چہک رہا ہے گویا کسی چمن میں

ریاضؔ میں بھی خوش آواز خوش گلو ہوں مگر
یہ لطف قلقل مینا میری اذان میں نہیں

اپنی شاعری کی تعریف اور تعلی میں ریاضؔ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

بنتے ہیں کچھ ریاضؔ بھی اس فن کے مدعی
اشعار ان کے خوب ہیں دعویٰ مگر غلط

ایک میں بلبل گویا ہوں گلستاں میں ریاضؔ
اب کہاں باغ میں ہیں بولنے والے بلبل

میرے سوا زمانے میں کوئی نہیں ریاضؔ
اہل کمال، شاعر یکتا کہیں جسے

شعرا آپ کو بھی خوب بناتے ہیں ریاضؔ
سبھی کہتے ہیں کوئی آپ سا استاد نہیں

یادگار اس وقت ہم بھی ہیں زمانے میں ریاضؔ
مانتے ہیں سب ہمیں، ہم مانتے ہیں میرؔ کو

ریاضؔ کا قول ہے کہ ان پر آسمان سے مضامین اترتے ہیں ؎

اترتے ہیں نئے مضمون آسمان سے ریاضؔ
تلاش رہتی ہے ہم کو نئی زمینوں کی

ریاضؔ کا قول ہے کہ راجہ محمود آباد المتخلص بہ ساحرؔ، ان کو خسروؔ کہتے تھے۔ ؎

کہتے ہیں خسرو تمھیں ساحرؔ ریاضؔ
تم کہیں خسرو، کہیں تم میرؔ ہو

مندرجہ ذیل اشعار میں بھی ریاضؔ نے تعلی سے کام لیا ہے۔

ہر شعر مئے ناب سے بڑھ کر ہے مزے میں
ملتی ہے ریاضؔ آپ کو دن رات مزے کی

ہیں یوں تو ریاضؔ اور بھی دنیا میں سخنور
مشکل ہے تمھاری سی طبیعت ہو کسی کی

چوم لیں کیوں نہ حسینان جہاں منہ میرا
اے ریاضؔ اور یہ انداز سخن کس کا ہے

سن کر وہ ریاضؔ آپ کے اشعار یہ بولے
سچ ہے کہ طبیعت ہے خداداد کسی کی

کہتا تھا گل رخوں سے ریاضؔ شکستہ حال
مجھ کو نہ دیکھئے میرے اشعار دیکھئے

نام جو کچھ ہو، انھیں کہتے ہیں سب لوگ ریاضؔ
آج ہم کو وہ بڑے شاعر مشہور ملے

بے قید شاعری سے یہ امید اب کہاں
ملک سخن ریاضؔ کے زیر نگیں رہے۔

مانے زمانے کوئی مگر یہ کہیں گے ہم
جان سخن ریاضؔ جہان سخن میں ہے

ان تمام باتوں کے باوجود ریاضؔ نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ شاعری میں انھوں نے جو فن کاری حاصل کی ہے وہ ان کے استاد امیر مینائی کی دین ہے۔

ریاضؔ استاد نے یہ رتبہ بخشا   ہماری دھوم ہے ہندوستاں میں

غرض کہ اس بحث و مباحثہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ریاضؔ میں خود بینی موجود تھی بلکہ ان کی خود بینی حدود کے اندر ہے ریاضؔ نے جن اشعار میں اپنے حسن و شباب کا ذکر کیا ہے، وہ حقیقت پر مبنی ہیں کیونکہ ریاضؔ واقعی ایک حسین و جمیل انسان تھے۔ ریاضؔ نے کچھ اشعار میں اپنی زبان دانی کا دعویٰ ہے یہ دعویٰ بھی غلط نہیں ہے۔ وہ چاہے نثر لکھیں یا نظم، ہر داری میں ان کا قلم گہر باری کرتا ہی نظر آتا ہے۔ ریاضؔ نے اپنی شاعری کی بھی بیجا تعریف نہیں کی ہے۔ وہ اپنے عہد کے ایک مستند استاد کی حیثیت سے تسلیم کئے جا چکے تھے اور آج بھی ہم ان کے اشعار پر سر دھنتے ہیں اور ان کی شاعری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے ریاضؔ کی خود بینی میں حقیقت ہے۔ جوانی کی خود بینی اور شاعری میں بانکپن پیدا کرتی ہے۔ خصوصاً ریاضؔ نے جن اشعار میں اپنے حسن و جمال کی تعریف کی ہے۔ وہ اصلیت میں ڈوبے ہوئے ہیں کیونکہ وہ نہایت حسین و جمیل انسان تھے۔ در حقیقت وہ دنیا کے نرگس کی طرح جوان اور حسین تھے اس لئے ہم ریاضؔ کو "اردو شاعری کا نرگس" کہہ کر پکار سکتے ہیں۔

★

رشید قریشی

غزل

وہ شخص جس نے سردارِ حق کا نام لیا
خدا گواہ بڑے حوصلے سے کام لیا

کبھی جو ذکرِ مسرت زباں تک آ بھی گیا
وہیں پہ گردشِ دوراں نے انتقام لیا

اس آدمی کو تو جینے کا کوئی حق ہی نہیں
قدم قدم پہ سہاروں سے جس نے کام لیا

نہ کی قبول کبھی میں نے مرگِ خودداری
میں تشنہ لب ہی رہا سب نے بڑھ کے جام لیا

ہر ایک پھول سے رنگِ خزاں ٹپکتا ہے
یہ کس کے ہاتھوں نے گلشن کا انتظام لیا

بھلا اب اس سے تغافل کا کیا گلا اے رشید
یہی بہت ہے کہ اس نے مرا سلام لیا

★ ★

ضیاء الانجم

غزل

رنگ مانگے ہے نہ شوخی نہ ادا مانگے ہے
زخم خوشبو ترے گیسو کی ہوا مانگے ہے

حوصلہ مانگے ہے احساس کی صبحوں کا جمال
زندگی گردشِ دوراں سے قضا مانگے ہے

شدتِ غم سے پگھلتا ہوا دن کا سورج
صبح سے شام کی تاریک قبا مانگے ہے

میرے نغموں کی روانی سے اب الفاظ کی روح
دستِ امکان سے اصوات و صدا مانگے ہے

زندگی مصلحتِ وقت کی تصویروں سے
مسکراتی ہوئی صبحوں کی ردا مانگے ہے

خواب آنکھوں کے پگھلنے لگے محسوس ہوا
روحِ تعبیر کوئی رنگ نیا مانگے ہے

جتنی تعبیریں تھیں سب ذہن میں محفوظ ہوئیں
خواب جلتے ہوئے لمحوں سے ضیا مانگے ہے

الیاس صبا

غزل

اب رہا شہر کوئی اور نہ صحرا اپنا
کتنا تنہا نظر آتا ہے یہ خاکہ اپنا

وقت کی بات ہے میں آج ہوں تنہا تنہا
وقت کے ساتھ کسی روز تھا رشتہ اپنا

کس کو فرصت ہے کرے اونچے سایہ پہ نظر
آج تو خود ہی پریشان ہے لمحہ اپنا

دیکھ کے سر سے پہاڑوں کے گزرتا دریا
رات نے ڈھانپ لیا خوف سے چہرا اپنا

کرب کا سیل بڑھا، آنکھ کی دیوار گری
درد نے ڈھونڈھ لیا آپ ہی رستہ اپنا

جیتے جی کوئی مرے اور کوئی مر مر کے جئے
اس کا کیا کیجئے، یہ ظرف ہے اپنا اپنا

ملالئے اپنی بصیرت کا بدل ڈالو صبا
رنگ ہر پھول نے اس دور میں بدلا اپنا

★

حبیب احمر

غزل

وقت کے شیشے پر، اک عکس یوں ابھرا اپنا
دھوپ میں جیسے ہو جلتا ہوا چہرہ اپنا

کثرتِ فکر نے چھوڑا نہ اگر ساتھ مرا
نوچ ڈالوں گا کبھی کرب سے چہرہ اپنا

سنگ انداز ہوں اڑ جائیں گے یادوں کے پرند
اب ہٹا لیجئے ماضی کا یہ پہرا اپنا

شام کے دیپ جلے شہر کا رستہ ہو خموش
قلب میں ڈوب گیا آس کا سایہ اپنا

کیوں شکایت رہے، ہر تو تلی احمر کی زبان
ہم بدل لیتے ہیں اب لہجہ ابھی اپنا

★

ظہیر ناشاد رسنگوی

غزل

بیتے ہوئے زمانے حبب مجھ کو
آنکھوں سے خون ٹپکا لب گرچہ
کشتی کو کھیتے کھیتے شل ہو گئے
ہاتھوں سے میری چھوٹ کر پتوا
آنسو انہیں نہ سمجھو وہ خون دل
جذبات کے سمندر آنکھوں نے جو
شاید انہیں فضائے گلشن نہ
دیوانے خاک اڑاتے صحرا کو ٹ
ناشاد میری دنیا تاریک ہو
اک آفتاب ڈوبا، سو آفتاب

★

ظفر حبیب

"تخلیق فن اور تنقید فن"

(اولیت و افضلیت کی جنگ)

"تخلیق فن اور تنقید فن" ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی، ہیئت و مواد کا رشتہ، ترسیل و ابلاغ کا مسئلہ — یہ موضوعات ادب کے مستقل موضوعات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر زمانہ میں یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور پھر افہام و تفہیم کی منزل سے گزرنے کے بعد خود بخود دب جاتا ہے کچھ دنوں تک خموشی اور سکون کی سی کیفیت رہتی ہے اور پھر یکایک کوئی نہ کوئی مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس طرح ادب کا کارواں منزل بہ منزل، زینہ بہ زینہ، قدم بہ قدم آگے کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ یہ کیوں اپنے پیچھے بہت سے سوالات رکھتا ہے۔ لیکن ایک بات کہنا چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مسئلے در اصل چند (ISSUES) ہیں۔ یہ سب کے سب در اصل بنیادی باتیں ہیں۔ جب تک کوئی بنیادی باتوں کو سمجھ نہیں لیتا ہے اس وقت تک وہ اس چیز کی تفصیلات سے روشناس نہیں ہو سکتا۔ ایک ادب کا قاری جب بھی نیا نیا میدان میں آتا ہے تو وہ ان بنیادی باتوں کو سمجھنا چاہتا ہے۔ اور اسی کے لئے کوئی قلمکار آگے بڑھ کر اس مسئلہ کو دوبارہ پیدا کرتا ہے اور پھر اسے سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں میرا مدعا بھی اس قسم کی ایک بنیادی بات کی افہام و تفہیم کی کوشش ہے۔

تخلیق فن اور تنقید فن کے رشتہ سے انکار ناممکن ہے۔ یہ دونوں بہرحال لازم و ملزوم ہیں۔ بات صرف افضلیت اور اولیت کی ہے۔ ایک خالق کبھی یہ باور کرنے کو تیار نہیں کہ وہ ناقد سے کمتر ہوتا ہے۔ اور ٹھیک اسی طرح ایک ناقد بھی خود کو ایک خالق سے برتر تصور کرتا ہے اور یہیں پر جدال و نزاع کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ایسے وقت میں ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ مسئلہ اور موضوع کے تمام پہلوؤں پر بیک وقت نگاہ رکھ کر ایک قلمکار اسے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرے۔

مفکروں اور ناقدوں کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ اعلیٰ تخلیق بغیر تنقیدی شعور کے ممکن نہیں اس لئے یہ قبول کرنا ہی ہوگا کہ ہر تخلیق میں تنقیدی شعور کارفرما ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تنقید و تخلیق توام یا لازم و ملزوم ہے۔ تخلیق ادب کسی دور میں ناقدانہ بصیرت سے محروم نہیں رہا ہے۔ ڈاکٹر اختر اورینوی کا خیال ہے کہ "دراصل عمل تخلیق کے وقت تنقیدی شعور بھی کام کرتا رہتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو تخلیق فن کے وقت فنکار کے ذہن میں فن کی قدریں موجود ہوتی ہیں۔ اس کے ذوق میں اور اس کی ذہنی تربیت میں اتنی پختگی اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے کہ قدروں کے مطابق تخلیق بے خطا اور بسہولت ہوتی چلی جاتی ہے۔ کاوش کا پتہ تک نہیں چلتا" لیکن تخلیق کی اس سہل روی اور آسانی کا مفہوم یہ بھی نہیں ہے کہ خالق کو جانکاہی نہیں کرنی پڑتی ہے۔ بلکہ اسے تخلیق کی اس منزل تک

پہنچنے میں مختلف دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔
جن میں اس کے ذوقِ تخلیق کو مجروح بھی ہونا پڑتا ہے
اور اسے بڑی جاں سوزی و جگر کاوی بھی کرنی پڑتی ہے۔
اس اجمال کی تفصیل ہم یوں بھی کر سکتے ہیں کہ
جب بھی انسانی ذہن میں کوئی تخلیقی خاکہ ابھرتا ہے تو وہ
صفحۂ قرطاس پر آنے سے قبل ہی ردّ و قبول کی منازل سے
گزرتا ہے۔

فنکار اپنے ذہن میں اس کے حسن و قبح پر روشنی
ڈالتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حتی الوسع اس تخلیق کے
قبح کو دور کر کے حسین گوشے کو قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔
اس کا یہی ردّ و قبول کا عمل اور حسن و قبح پر نگاہ رکھنے کے
کشش عمل تنقید ہے جو تخلیق سے قبل ہی معرضِ وجود میں
آجاتی ہے۔ یا پھر تخلیق کے بعد رونما ہوتی ہے۔

مجنوں گورکھپوری کا خیال ہے کہ اب سے دو نسل
پہلے تخلیق و تنقید کا سوال کبھی اٹھایا ہی نہیں گیا تھا سلسلے
کہ "اب تک فنکار اور نقاد کے درمیان کوئی محسوس فرق
نہیں تھا۔ دونوں کا تصور ایک ساتھ ذہن میں آتا تھا تخلیق
اور تنقید دونوں کو ایک ہی قوت کے مظاہر سمجھا جاتا تھا۔"
یہ بات اپنی جگہ ایک بڑی حقیقت رکھتی ہے یہ صحیح
ہے کہ تخلیق و تنقید میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے اس لئے
آج سے دو نسل قبل والے اس میں کوئی فرق محسوس ہی
نہیں کرتے تھے۔

ایبرکرامبک (ABER CROMHIC) کا خیال
ہے کہ "جس وقت بھی انسان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں
بات کو فلاں انداز میں نہیں بلکہ فلاں انداز میں کہنا زیادہ
بہتر ہے۔ جب بھی اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کو فلاں
چیز سے فلاں چیز زیادہ پسند ہے۔ اسی وقت سے تنقید
شروع ہو جاتی ہے۔
دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ "جس وقت
ادب کی تخلیق کا آغاز ہوتا ہے۔ تنقید وجود میں آجاتی ہے۔"
اور یہ خیال صحیح بھی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ہم روزانہ کی
زندگی میں ان چیزوں کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں تو پھر ایک
فنکار کیوں انہیں اسے محسوس کرے گا۔

فن اور زندگی کا تعلق بہت گہرا ہے جو بات زندگی
میں پیش آئے گی اسے فن میں مترشح ہونا ضروری ہے۔ ہماری
عملی زندگی کا یہ خاصہ ہے کہ ہم ہر کام کی ابتدا سے قبل
ہر تصور کو ذہن میں لاتے ہیں اور خیال کو عملی جامہ پہنانے
سے پہلے اس کے روشن و تاریک پہلو پر نگاہ دوڑالیتے ہیں
ہمارا یہ عمل تنقید ہے جو ہمیشہ اور ہر جگہ کارفرما رہتا ہے۔
ڈاکٹر اختر اورینوی نے تخلیق و تنقید کے موضوع پر
بحث کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ

"میرا خیال ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ ذوقِ
تخلیق کو ذوقِ تنقید سے الگ نہیں کیا جا سکتا
دونوں علیحدہ علیحدہ قوتیں ہیں۔ لیکن یہ
دونوں قوتیں توام ہیں۔ یہ قوتیں صرف
متوازی رنگ میں کام نہیں کرتی ہیں بلکہ
تخلیقِ حسن کے وقت ان کا عمل ایک
دوسرے کے ساتھ اتنا وابستہ و پیوستہ
اتنا مربوط و مرکب ہوتا ہے کہ ان کو علیحدہ کرنا
ناممکن ہے۔ تخلیقی عمل نہایت ہی پیچیدہ و
پیچیدہ عمل ہے اور اس کی قماش میں تنقیدی
عمل کے نازک تار لگے ہوتے ہیں۔ بخیہ بہ
بخیہ، رگ بہ رگ، تار بہ تار، پو بہ پو۔"

اختر اورینوی کے اس خیال سے ایک سوال یہ بھی پیدا
ہو سکتا ہے کہ جب تخلیق و تنقید میں اس قدر قربت
ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا ہی نہیں کیا جا سکتا
تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تخلیقی فن اور تنقید کا
فن میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن ایسی

بات قطعی نہیں۔ ان دونوں میں نمایاں فرق بھی ہے۔ البتہ فرق کی نوعیت ایسی ہے کہ دونوں کے درمیان خط فاصل کھینچنا ذرا مشکل ہے۔ بات یہ ہے کہ تخلیق فن کے وقت قوت تخلیق غالب و رہنما ہوتی ہے اور قوت تنقید ماتحت ہو کر کام کرتی ہے۔ اس کے برخلاف تنقید فن کے وقت تنقیدی قوت فائق اور حاوی ہوتی ہے۔ اور تخلیقی قوت اس کے تحت برسرکار رہتی ہے۔

اسکاٹ جیمس نے اپنی کتاب "ادب کی تشکیل" (THE MAKING AG LITTERATURY) میں اس فرق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"یہ ٹھیک ہے کہ آپ اس وقت تک تنقید نہیں کر سکتے جب تک کہ فن اور آرٹ کا وجود نہ ہو۔ لیکن یہ خیال اس حقیقت پر پردہ نہیں ڈال سکتا کہ ہر آرٹ کی عمارت تنقید ہی پر کھڑی کی جاتی ہے۔"

اس طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ عمل تخلیق کے وقت، عمل تنقید کار فرما رہتا ہے۔ اس کی مزید وضاحت و صراحت کے لئے ہم دنیائے شاعری کی مثال پیش کر سکتے ہیں۔ رشتۂ تخلیق و تنقید پر مہر توثیق ثبت کرنے والی سب سے پہلی وہ شخصیتیں ہیں جنہیں ہم بیک وقت شاعر اور نقاد دونوں روپ میں دیکھتے ہیں۔ مثلاً جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے ہی کو لیجئے جو ایک عظیم شاعر کے ساتھ ساتھ مشہور زمانہ مفکر اور ناقد بھی ہے۔ اسی طرح انگریزی زبان سر فلپ سڈنی، ڈرائیڈن، کولرج، ورڈس ورتھ، شیلی، میتھو آرنلڈ، ہاورٹ برتچر اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ وغیرہ کی دو بڑی شخصیتیں اس امر کی ضمانت ہیں کہ ایک شاعر بیک وقت نقاد بھی ہو سکتا ہے یا ایک ناقد شاعر بھی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اردو میں میر، سودا، قائم، صاحب شفیق، مصحفی، شیفتہ، میر حسن، اور بہت سے دوسرے تذکرہ نگاروں کا نام لیا جاتا ہے۔ جو صف اول کے شاعروں سے تھے۔ ان حضرات کا بیک وقت شاعر اور نقاد ہونا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ تخلیق فن اور تنقید فن توام یا لازم و ملزوم ہے۔ اسی اجمال کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اسکاٹ جیمس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "نقاد کو اس قابل ہونا چاہیئے کہ وہ شاعر یا ادیب کے کسی کارنامے پر تبصرہ کرتے ہوئے الٹے پاؤں واپس جا سکے تاکہ وہ خود اپنے تخلیقی تخیل سے کام لے کر آغاز سے نقطۂ تکمیل تک اس کارنامہ کا تجزیہ کر کے اس کو سمجھ اور سمجھا سکے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ناقد کو ایک خالق کی ذہنیت رکھنی چاہیئے۔ اگر وہ ایک خالق کی ذہنیت رکھتا ہے تو وہ ایک نقاد بھی ہو سکتا ہے۔

یعنی تخلیق کار تنقیدی صلاحیت کا مالک ہوتا ہے اور ناقد تخلیقی درک رکھتا ہے۔ اس طرح تخلیق فن، اور تنقید فن ہم آہنگ اور ہم آمیز جذبے اور صلاحیتیں ہیں۔ جس کے درمیان خط فاصل کھینچنا یا کوئی حد مقرر کرنا کار لاحاصل ہے۔

جمال شاہد

غزل

خانۂ دل میں مرے طور سا نقشا ہوتا
شیشۂ دل میں ترا عکس جو اترا ہوتا

پُر فضا ہوتا، چمن زار یہ صحرا ہوتا
خون سے اس کو اگر تو نے بھی سینچا ہوتا

رُخ پہ خورشید کے، پردہ جو نہ ڈالا ہوتا
ماہِ تاباں سا درخشاں تیرا سایا ہوتا

سازِ دل اپنا اگر تو نے بھی چھیڑا ہوتا
ان کے ہونٹوں پہ تمھارا ہی ترانہ ہوتا

ہر زباں پر ترا چرچہ ترا قصہ ہوتا
طرزِ تحریر اگر تو نے نہ بدلا ہوتا

داستاں ان کی اگر تیری زباں پر ہوتی
عہد و پیمانِ وفا کیلئے دھوکہ ہوتا

دل میں حسرت ہے یہی شام و سحر اے شاہدؔ
محفلِ زیست میں کوئی بھی تو اپنا ہوتا

★ ★

شکیل مظہری

غزل

کیسے ترا وجود اک آواز بن گیا
اے زندگی کہاں وہ ترا بانکپن گیا

اب صرف ذہن و دل میں ہے گرد و غبارِ وقت
مدت ہوئی وہ حوصلۂ فکر و فن گیا

وہ جس کو تھا نصیب ترے وصل کا وقار
وہ شخص تیری بزم سے کیوں دلشکن گیا

زنجیر آنسوؤں کی مرے ساتھ ساتھ تھی
بزم نشاط سے جو میں دارا لمحن گیا

لوگوں نے خوب سنگ ستم آزمائے جب
میں آگہی کے نام پہ دیوانہ بن گیا

ڈھونڈو تم اس شکیلؔ شکستہ وجود کو
دیکھو کدھر وہ راہرو بے وطن گیا

★ ★

بدیع الزمان خاور

کنوئیں کا کرب

چاروں اور خاموشی
چاروں اور سناٹا
ڈول اداس
رسی چپ
بولتی نہیں کوئی
اونگھتی فضاؤں میں قہقہہ نہیں کوئی
چوڑیوں کی جھنکاریں، سوگئی ہیں جنگل میں
گاگروں کی آوازیں، کھوگئی ہیں جنگل میں
جاگتا ہوا
تنہا اک کنواں اندھیرے میں
خامشی کے گھیرے میں
انتظار میں
جیسے ہے کہ رات ڈھل جائے
اور
بے بس سناٹا
صبح کے اس میٹھے شور میں بدل جائے۔

عین تابش

دو آتشہ

ایک جانب
لمحہ لمحہ بڑھنے والی تیرگی کا زور
رات
ویرانی کے میلے میں رہی
رو رہی ہے
دوسری جانب
اندھیرا مٹ رہا ہے
آس کے آنگن میں
سورج اگ رہا ہے......؟

ظہورالدین

آن دی سبلائم

ایک جائزہ

اس تنقید پارے کے مصنف کا نام لنجائی نس (LONGINOS) بتلایا جاتا ہے، گو یہ بہت حد تک مشکوک ہے۔ فرانسس رابرٹیلو (FRANCIS ROBERTELLO) جس نے ۱۵۵۴ء میں یورپ کو سب سے پہلے اس فن پارے سے روشناس کرایا بھی اس کے مصنف کا نام ڈائی ناسس لنجائی نس (DIONYSIUS LONGINUS) ہی بتلاتا ہے، جو پہلی صدی عیسوی میں پامیرا (PALMYRA) کی ملکہ زینوبیا (ZENOBIA) کا مشیر تھا۔ جارج سینٹس بری (GEORGE SAINTSBURY) داخلی شہادتوں کے تجزیہ کے اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ "مقالہ میں پیش کئے گئے حالات وواقعات سے جو سماجی تصویر ذہن میں ابھرتی ہے وہ سلطنت روما کے ابتدائی ادوار سے بالکل مشابہ ہے"[۱] اس طرح سینٹس بری بھی اس مقالہ کو سنہ عیسوی کی ابتدائی تین صدیوں کا ہی کارنامہ قرار دیتا ہے۔ اسی طرح کے شکوک وشبہات کا اظہار دوسرے محققین نے بھی کیا ہے، تاہم جہاں تک مصنف کے نام کا تعلق ہے سبھی متفق نظر آتے ہیں۔ سردست ہمیں اس فن پارے کا محض تنقیدی جائزہ لینا ہے مصنف کا تعین کرنا مقصود نہیں۔

اس فن پارے کی وجہ تصنیف سے متعلق اس کے ابتدائی باب سے صرف اس قدر معلومات فراہم ہوتی ہیں کہ یہ کتاب پہلی صدی عیسوی کے CAECILIUS نامی کسی شخص کی لکھی کتاب "آن دی سبلائم" کے جواب کے طور پر لکھی گئی ہے۔ لن جائی نس کے خیال میں "CAECILIUS" اپنے موضوع سے انصاف نہیں کر سکا تھا، یہاں تک کہ لنجائی نس اس کے ماخوذہ نتائج کو بھی بہت حد تک گمراہ کن تصور کرتا ہے۔ بدقسمتی سے اس فن پارے کا اصل مسودہ کھو گیا ہے اور اس کی جو نقل ہم تک پہنچی ہے وہ اس قدر افراط وتفریط کا شکار ہے کہ قدم قدم پر شکوک وشبہات کے عفریت ذہن کے جھروکوں سے جھانکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ مصنف کے اسلوب سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ "TEREUTIANUS" نامی اپنے کسی قریبی دوست کی طرف سے اٹھائے گئے چند سوالات کا جواب دے رہا ہے۔

یورپی ادیبوں نے ارسطو کے بعد جس شخصیت سے سب سے زیادہ استفادہ کیا ہے وہ یہی لنجائی نس ہے۔

---

۱ A HISTORY OF ENG CRITICISM BY GEORGE SAINTS BURY P. 10 - 13

اس کے فن پارے نے یورپ میں بائیلو (BOILEAU) سے لے کر ۱۹ویں صدی تک کے اکثر ادیبوں کو متاثر کیا ہے۔ اس فن پارے کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب ہم اٹھارہویں صدی عیسوی کے مشہور انگریز نقاد ایڈمنڈ برک (EDMUND BURKE) کی معرکہ خیز تصنیف "ENQUIRY" کا مطالعہ کرتے ہیں۔ برک کے شاہکار سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس نے "آن۔دی سبلائم" سے متاثر ہو کر "ENQUIRY" کو لکھا ہے گو کہ وہ اس بات کا اعتراف[1] کہیں نہیں کرتا۔

آن دی سبلائم چوالیس ابواب پر مشتمل ہے۔ ابواب کی ترتیب کے دوران مصنف نے موضوع کے تسلسل کو برقرار رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے، جس سے یہ فن پارہ افراط و تفریط کا شکار ہو گیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مصنف نے اسے قلم برداشتہ لکھا ہو۔ تحریر کے دوران اسے جو خیال جہاں کہیں بھی، کسی مرحلہ پر سوجھ گیا، اس نے اسے وہیں (بلا سوچے کہ یہ اس کے ذکر کا مقام ہے کہ نہیں) نئے عنوان کے تحت لکھ ڈالا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی موضوع سے متعلق اس کے مختلف خیالات مختلف ابواب میں جہاں تہاں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ اس طرح مقالہ کا منطقی ربط مجروح ہو گیا ہے۔ بعض ابواب کے متعدد صفحے امتداد زمانہ کے کرموں کی نذر ہو گئے جس سے اس کے بہت سے خیالات (اور ہو سکتا ہے کہ وہی سب سے بہتر ہوں) ہم تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ فن پارہ صرف ادب سے ہی بحث نہیں کرتا بلکہ فن خطابت کو بھی بعض ابواب میں اپنا موضوع بناتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ لنجائنس بذات خود نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مشہور خطیب بھی تھا۔ اس طرح یہ پورا مقالہ دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک حصہ وہ ہے جس میں وہ صرف ادبی اسلوب سے بحث کرتا ہے اور دوسرا حصہ وہ جس میں وہ فن خطابت پر اظہار خیال کرتا ہے[2]۔

اس مقالہ میں مصنف ہمیں صرف ان وسائل سے روشناس کرتا ہے جن سے کسی فن پارہ کے اسلوب یا خارجی ہیئت کو رفعت کی اعلےٰ منازل سے ہم کنار کیا جا سکتا ہے۔ اس نے فن پارہ کے داخلی پہلوؤں کا صرف اجمالاً ذکر کیا ہے تفصیل سے بحث نہیں کی۔ تاہم تصنیف میں موجودہ شہادتوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ موضوع کی عظمت سے انحراف نہیں کرتا۔ عظیم اسلوب کی تعریف پیش کرتے ہوئے جب وہ کہتا ہے کہ یہ اظہار

۱ـ EDMUND BURKE.: A PHILOSOPHICAL ENQUIRY INTO THE ORIGIN OF OUR IDEAS OF THE SUBLIME AND BEAUTIFUL : EDITED BY J.T. BOULTON. P: 18

۲ـ ابواب کا مختصر تجزیہ کرنے کے لئے مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

LONGINUS ON THE SUBLIME, TR. BY A.D. PRICHARD (i)

PRINCIPLES AND HISTORY OF CRITICISM BY (ii) C.L. SAHNI: P: 107—127

ایک ایسی انفرادیت اور فضیلت ہے جو کسی فن کار کو صرف اس وقت نصیب ہوتی ہے جب اس کے پاس کسی عظیم خیال کو پیدا کرنے کی طاقت، شدید جذبہ کی فراوانی، استعارہ کے درست استعمال پر قدرت، زبان پر ماہرانہ قدرت اور باوقار و پرشکوہ ہیئت کو تشکیل دینے کی صلاحیت ہو، (۸+۱) یہ کہ مواد کے درست انتخاب اور اس کی درست ترتیب اور موضوع سے متعلق تمام تفصیلات کا بیان کیا گیا ہو (۱۰+۱۱)، تو ظاہر ہے کہ وہ موضوع کی عظمت کو فراموش نہیں کرتا۔ کیونکہ عظیم تصور اور شدید جذبہ ہی کسی عظیم موضوع کو پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہی نہیں آگے چل کر جب وہ یہ کہتا ہے کہ عظیم خیال کسی عظیم روح کی کوکھ سے ہی جنم لیتا ہے (۹) تو در حقیقت وہ موضوع کی عظمت کے حضور میں سربسجود ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مندرجہ بالا دونوں ابواب میں پیش کئے گئے خیالات کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دراصل وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ عظیم اسلوب کسی عظیم خیال کی کوکھ سے ہی جنم لیتا ہے۔ گو اس کی اس دلیل کے الفاظ جتنے خوبصورت ہیں اُن کا مفہوم اتنا ہی ناکافی ہے، کیونکہ یہ ہمیں کسی واضح نتیجہ تک پہنچنے میں مدد نہیں دیتی۔

میرا خیال ہے لنجائنس سے اگر یہ سوال کیا جاتا کہ کسی عظیم روح کی پہچان کیا ہے تو شاید وہ اپنے مندرجہ بالا الفاظ میں تھوڑی رد و بدل کر کے جھٹ سے کہہ اُٹھتا "جو عظیم خیال کو جنم دے"۔ اب ہمیں یہ تو معلوم ہو گیا کہ عظیم خیال کو کوئی عظیم روح ہی جنم دیتی ہے اور عظیم روح وہ ہوتی ہے جو کسی عظیم خیال کو جنم دے لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کون سی شرطیں ہیں جن کو پورا کرنے کے بعد کوئی روح عظمت کے بام پر چڑھ سکتی ہے اور وہ کون سے عناصر ہیں جن کی موجودگی کسی فن پارہ کو رفیع بنا دیتی ہے۔ چنانچہ جب تک اس قول کی مندرجہ بالا تشنگی دور نہیں ہوتی ہم اسے بطور معیار قابل اعتماد نہیں مان سکتے۔ ہم یہ ماننے کے لئے تیار ہیں کہ کوئی سست مزاج انسان کبھی عظیم خیال کو جنم نہیں دے سکتا، لیکن جب تک یہ معلوم نہیں ہوتا کہ عظیم روح کی پہچان کیا ہے ہماری معلومات ادھوری ہی رہتی ہیں۔ لنجائنس اس سلسلہ میں ہماری کوئی رہنمائی نہیں کرتا۔ ہو سکتا ہے ایسا اس نے جان بوجھ کر کیا ہو کیونکہ اس شاہکار میں اس کا مقصد صرف اسلوب سے بحث کرنا ہے موضوع سے بحث کرنا نہیں۔ اسی لئے شاید وہ شدت جذبہ کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے کیونکہ اس کا تعلق بھی بہت حد تک موضوع سے ہی ہے۔ بقیہ تین وسائل کا تعلق چونکہ اسلوب اور فن سے ہے اس لئے وہ انھیں خاصی وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

استعاروں کے استعمال سے متعلق بحث کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ اگر انھیں مناسب طریقے سے صحت کے ساتھ استعمال کیا جائے تو اسلوب نہ صرف دل کش بلکہ رفیع ہو جاتا ہے۔ استعاروں کو وہ دو گروہوں میں تقسیم کرتے ہوئے انھیں لفظی استعارے، اور خیالی استعارے ایسی دو اصطلاحوں سے منسوب کرتا ہے۔ لفظی استعاروں سے اس کی مراد شاید "IMAGES" یعنی پیکروں سے ہے اور خیالی استعاروں سے "SYMBOLS" یعنی اشارے مراد ہیں۔ اس کے خیال میں وہ استعارہ بہترین ہوتا ہے جسے پڑھ کر قاری کو یہ محسوس ہی نہ ہو کہ وہ استعارہ ہے (۱۶ + ۱۷)۔ یہ دلیل پیش کرتے ہوئے وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتا ہے کہ استعارہ ایک صنعت ہے اور صناعی چاہے وہ کسی بھی قسم کی کیوں نہ ہو اپنے اندر ایسی خصوصیات ضرور رکھتی ہے جو قاری کے احساس کو بیدار کر دیں ورنہ پھر وہ صناعی نہ رہے گی۔ استعارہ استعمال کیا جائے اور پڑھنے والے کو محسوس نہ ہو یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب فن کار غلط توجیہ میں بھی دخل رکھتا ہو۔

یونان کے جن عظیم فن کاروں کے ادب کے حوالے اس نے اس شاہکار میں جا بجا پیش کئے ہیں اگر لنجائی نس نے انھیں کا بغور مطالعہ کیا ہوتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ وہ جو بات کہہ رہا ہے اس میں کتنا وزن ہے۔ کیونکہ ان کے ہاں استعارے نہ صرف واضح بلکہ بڑے طویل بھی ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہومر کے استعارے تو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ استعارے کا یہ وصف زیادہ اہم نہیں کہ وہ پوشیدہ یا غیر محسوس قسم کا ہو بلکہ یہ زیادہ اہم ہے کہ ان کا درست استعمال کیا گیا ہو۔ جس مفہوم کی صراحت کے لئے اس کو استعمال کیا گیا ہو، وہ نہ صرف اس کی درست ترسیل کا ضامن ہو بلکہ اس کی دل کشی میں بھی اضافہ کرے۔

پندرھویں باب میں جب وہ یہ کہتا ہے کہ واضح اور سادہ پیکر کاری سے بھی بیان عظیم ہو جاتا ہے اور اس سے جذبہ کو محرک کرنے میں مدد ملتی ہے، نیز یہ کہ تعقید کو ہوشیاری سے برتنے سے بھی فن پارے کی عظمت دوبالا ہو جاتی ہے (۲۸ + ۲۹) تو اس کی گذشتہ دلیل خشک ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کی دلیلیں کہ سادہ اور واضح پیکر کاری سے بھی عظیم اسلوب پیدا ہو سکتا ہے اور مخفی استعاروں سے بھی، آپس میں متضاد ہیں اور ذہن کو تذبذب میں ڈال دیتی ہیں کہ کس کو تسلیم کرے اور کس کو جھٹلائے۔ صرف اتنی سی بات سمجھ میں آتی ہے کہ فن کار کو اگر فن پر عبور حاصل ہو تو پھر چاہے وہ مشکل پیرایہ اختیار کرے یا سادہ و آسان، اس کا اسلوب عظیم اور رفیع ہوگا۔

لنجائی نس کے یہ خیالات بے شک حقیقت پر مبنی ہیں کہ جذبات کی فراوانی کی صورت میں استعاروں کا استعمال زبان میں بلا کی قدرت اور تاثر پیدا کر دیتا ہے (۳۲)، عظیم تاثر پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ خیالات کے انتقال کے لئے خوب صورت اور مناسب الفاظ کا استعمال کیا جائے اور معمولی مضامین کو عظیم رنگ میں پیش کرنے کی کوشش نہ کی جائے (۴۰ + ۴۱) اور اس کا یہ خیال ملاحظہ ہو: تشبیہات اور مبالغہ بھی اسلوب کو بہتر بنا دیتے ہیں (۳۷ + ۳۸) لیکن شرط یہ ہے کہ ان کا استعمال اس طرح کیا جائے کہ قاری کو ان کی موجودگی کا احساس تک نہ ہو۔ جہاں تک مبالغہ کا تعلق ہے۔ یہ صحیح ہے البتہ تشبیہات پر اس کا اطلاق کوئی صحت مند نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔ الفاظ کی ہم آہنگی کا التزام کرنے سے بیان میں جذبہ کی شدت اور جذبوی اتحاد پیدا ہو جاتا ہے (۳۹ سے ۴۲)۔

مندرجہ بالا فنی ضرورتوں کا التزام کرنے کے علاوہ چند دوسری باتوں کا التزام کرنے سے بھی عظمت کی بلندی تک پہنچا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر فن کار ماضی کے چند بڑے شاعروں اور ادیبوں کی نقل کرے تو وہ مطلوبہ مقصد حاصل کر سکتا ہے (۱۳ + ۱۴)۔ ایک ادیب کو ہمیشہ مندرجہ ذیل تین سوال ملحوظ رکھنے چاہئیں۔ پہلا یہ کہ وہ جو خیال پیش کرنے والا ہے ہومر اور افلاطون نے اسے کس طرح پیش کیا ہوتا۔ دوسرا یہ کہ اگر اس کے فن پارہ کو ہومر دیکھتا تو کس قسم کے خیالات کا اظہار کرتا۔ اور تیسرا یہ کہ آنے والی نسلیں اس کے اظہار کو کس طرح قبول کریں گی۔ ان سوالات کو ملحوظ رکھنے سے فن کار میں احساس ذمہ داری پیدا ہوتا ہے جو ایک عظیم فن پارہ کی تشکیل کے لئے ضروری ہے۔

لنجائی نس چند ایسی خامیوں کا بھی ذکر کرتا ہے جو کسی فن پارہ کے اسلوب کی عظمت کو مجروح کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر وہ کہتا ہے کہ بھاری اور ثقیل الفاظ کا استعمال، بچکانہ پن، تاثر کی سرد مہری اور قوسین کے استعمال سے اسلوب کی عظمت مجروح ہو جاتی ہے (۳ سے ۷ تک)۔ زبان کی شکستگی بھی فن پارہ کی عظمت کو مجروح کر دیتی ہے۔ اگر فن کار [illegible]

کے ذخیرہ میں مبتذل الفاظ کی تعداد زیادہ ہے تو یہ اسلوب کو مجروح کر دے گی۔ اس لیے بدنما آوازوں والے الفاظ اور بازاری محاوروں سے احتراز کرنا چاہیئے (۳۹ سے ۴۲ تک)۔ یہ سب خامیاں اسلوب میں اس وقت رونما ہوتی ہیں جب مصنف جدت کے خبط کا شکار ہو جاتا ہے۔

فن خطابت سے متعلق بھی لنجائی نس اپنے خیالات کا اظہار چند ابواب میں کرتا ہے۔ اس کی صراحت میں تقریر کرتے وقت سوال و جواب کا اسلوب اختیار کرنے سے تقریر کو زیادہ دلچسپ اور متاثر کن بنایا جا سکتا ہے (۱۸+۱۹) ان سے نہ صرف زبان بلند اور معیاری ہو جاتی ہے بلکہ اس میں معقولیت کا عنصر بھی پیدا ہوتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ یہ سوال شدت جذبہ کی پیداوار ہوں۔ اگر ان میں جذبہ کی شدت شامل نہیں ہے تو وہ اپنے مقاصد تک رسائی حاصل نہ کر سکیں گے۔

تقریر میں شکستہ جملے، لفظوں کی تکرار اور الجھے باوجود وضاحت بیان، ان سب کو آمیخت کرنے سے تقریر کا تاثر، حسن اور قوت بڑھ جاتی ہے اور اسلوب میں بھی قوت، دلنشینی اور حسن پیدا ہو جاتا ہے (۲۰ + ۲۱)۔ خیال اور الفاظ کی ترتیب کو الٹ کر یعنی الفاظ کی معکوسی ترتیب سے وجود میں آنے والے استعارے کے استعمال سے جذبہ کی شدت کا پتہ چلتا ہے۔ جب کوئی انسان کسی قوی اور شدید جذبہ کے تحت بولنا شروع کرتا ہے تو اس کے جملوں کا منطقی ربط ٹوٹ جاتا ہے اور اس کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ اپنے ساتھ لفظ سے ٹکراتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ایسے استعارے تقریر میں فطری انداز پیدا کرتے ہیں۔ فن اس وقت مکمل ہوتا ہے جب وہ فطرت سے قریب تر ہو اور فطرت اپنے مقاصد میں اس وقت پوری اترتی ہے جب وہ فن کو اپنے سینے میں چھپا لے (۲۲ ...)

واحد کی جگہ جمع اور جمع کی جگہ واحد، ماضی کی جگہ حال اور ایک جنس کی جگہ دوسری جنس استعمال کرنے سے بھی تقریر میں حسن پیدا ہو جاتا ہے (۲۳ سے ۲۸ تک)۔

لنجائی نس کی مندرجہ بالا دلیل کسی حد تک مبہم ہے۔ واحد کی جگہ جمع اور جمع کی جگہ واحد، ماضی کی جگہ حال اور اسی طرح جنس وغیرہ کی ترتیب الٹ کر بولنے سے تقریر میں کس طرح عظمت پیدا ہوتی ہے سمجھ میں نہیں آتا۔ جہاں تک میرا ذاتی تجربہ ہے، مواد کے انتخاب کے ساتھ ساتھ سادہ، معیاری، مختصر، قوی اور برمحل زبان کا استعمال اور آواز کا مناسب زیر و بم تقریر میں انفرادیت پیدا کر دیتا ہے۔

لنجائی نس اس مقالہ کے آخر میں فن کے انحطاط سے متعلق (جو کہ اس کے دور میں ہوا ہوگا) اپنے خیالات پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ موجودہ دور میں فنی زوال کی وجہ جمہوریت میں محرکات کی کمی نہیں بلکہ لوگوں کا اخلاقی بحران ہے۔ چونکہ لوگوں نے مادی منفعت کی طرف زیادہ توجہ دینا شروع کر دی ہے اور وہ اب محض تعریف کی خاطر فن کی صبر آزما منزلوں سے گزرنے کی زحمت اٹھانا پسند نہیں کرتے، اس لئے آرٹ انحطاط کا شکار ہو گیا ہے۔

لنجائی نس کی مندرجہ بالا دلیل آج کے ہندوستان پر سو فی صدی پوری اترتی ہے۔ مالی منفعت کی خاطر ادب بازاری اور مبتذل قدروں کا آلۂ کار بنا کر ایک عام انسان کے ذوق کو جس حد تک گرایا گیا ہے اس کو مد نظر رکھتے ہوئے بہت کم ادیب سنجیدہ ادب پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں سستے پن کو پسند کرنے والی جدید ہندوستانی نسل (اکثریت) کا انجام کیا ہوتا ہے یہ تو مستقبل ہی بتا سکتا ہے۔

پونم پیلی بھیتی

(ایک تخلیق)

"چھ آنے کے لئے....."

پیٹ کی آگ کو صرف پانی سے بجھاتے بجھاتے اور پیشاب کو جاتے جاتے رات کے دو بج گئے تھے، مگر نیند اب تک اُس کی آنکھوں سے لاپتہ تھی، اُس نے بارہا آنکھیں موند موند کر اور تفکرات سے مُنہ موڑ موڑ کر نیند کو پکارا مگر نیند اُس کے روم کے دروازے پر بھی نہ آئی، رہ رہ کر بھوک کی آگ اُس کے پیٹ میں جب بھوک اُٹھتی اور آنتوں میں جیسے نکیلے خار چبھنے لگتے تو وہ اُٹھ کر گلاس بھر پانی گلے سے نیچے اتار لیتا۔ اور پھر فرش پہ بچھی ہوئی چٹائی پر دراز ہو جاتا۔

مسلسل اُس کے فاقے کا یہ چوتھا وقت تھا۔ اُس نے گزشتہ شب کو تین روٹیاں نمک سے کھائیں تھیں۔ اور آج سارا دن وہ بھٹکتا رہا مگر کہیں سے چھ آنے نہ مل سکے بس سے تین روٹیاں جوڑ لیتا۔ سارا دن گزر گیا اُسے پیٹ کی آگ پانی سے بجھاتے ہوئے اور اب رات کے دو بج گئے تھے،

وہ چٹائی پر بچھا ہوا نیند کا انتظار کر رہا تھا، مگر اُس کی نگاہیں روم کی چھت پر مرکوز تھیں، اور کمرے میں روشنی زیرو پاور کے بلب کی۔ مدھم روشنی میں اُس کے روبرو کبھی وہ چہرے نمایاں ہو رہے تھے جو ایک وقت میں کلکتہ قوام ایک سو بیس نمبر زردہ کا تیس پیسے کا پان کھاتے ہیں، وہ لب بھی دکھائی دیئے جن میں بلیک سے خریدی ہوئی تین روپیے والی 555 سگرٹ کی ڈبیہ کی سگرٹ دبی ہوئی ہے، اُن حسین نوجوان جوڑوں کو بھی وہ دیکھ رہا تھا جو ایک ایک روپیے کی ایک ایک آئسکریم محض ایک میٹھی مسکراہٹ مسکرانے کے لئے لبوں سے مس کرتے ہیں۔ ۔ ایک وہ ہے جو تین روٹیوں پر پورا دن گزار سکتا ہے، مگر جن کے لئے صرف چھ آنے اُسے دستیاب نہیں ہیں۔

کہتے ہیں یہ ترقی کا دور ہے اور ہمارا ملک خوب ترقی کر رہا ہے، ملک کا ہر انسان ترقی پسند مزاج ہو گیا ہے۔ ہاں سڑکیں کتنی کشادہ ہو گئی ہیں۔ بلڈنگیں کتنی کتنی اونچی تعمیر ہونے لگی ہیں۔ موٹریں کتنی قیمتی قیمتی ہیں انسان کے پاس، بنک بیلنس کس قدر بڑھنے لگے ہیں، دفاتر کتنی کثیر تعداد میں کھل گئے ہیں، مجلسیں کتنی آسان اور کامیاب ہونے لگی ہیں دولت مند کے لئے، جن سنگھیا کتنی تیز رفتار سے بڑھ رہی ہے، تعلیمی اداروں کی بستی کتنی گنجان ہو گئی ہے،

"لیکن ادب ـــــ؟" اُس نے اپنے دل سے سوال کیا۔

"ادب بھی خوب پھول پھل اور پھیل رہا ہے، ہر نوجوان لڑکی اور لڑکے ہاتھ میں انگلش ناول دکھائی دیتا ہے، ہندی کا پرچار زوروں سے ہو رہا ہے، لوگوں نے خوب پڑھنا شروع کر دیا ہے،" اُس کے دل نے جواب دیا۔

"اور ادیب؟"

"ادیب کمبخت غریب ہے تو کیا کیا جائے؟"

"واہ یہ کیا بات ہوئی، ترقی کا دور ہے، انسان کے ترقی پسند رجحانات ہیں تو ادیب کے ساتھ یہ ناانصافی کیوں کی جارہی ہے، ؟"

"تم ادیب بزنس کا مطلب کبھی نہیں سمجھو گے ارے بھئی دولت لگا کر دولت کمائی جاتی ہے، تم کو کون سی ہیرا پھیری لگانی پڑتی ہے کمائی کے لئے ۔"

اپنے دل کے اس جواب پر وہ مسکرا دیا، مگر اس کی مسکراہٹ بے حد پھیکی اور اداس تھی، اسے اب اپنے دل سے بھی بحث کرتے میں بیزاری سی ہونے لگی تھی، اس نے پھر آگے کچھ نہ کہا۔ اور جب اس کا دل بہت دیر تک اس کے بولنے کا انتظار کر کے تھک گیا تو وہ بھی اس کی طرف سے منہ پھیر کر خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے دل نے پھر اس کے دماغ میں آہٹ لی مگر اس وقت اسے مایوسی ہوئی، وہ سو چکا تھا۔

صبح کو اس کے دل نے پھر اس کے ذہن میں آہٹ لی اس بار وہ نیم خوابیدہ انداز میں اسے محسوس ہوا، دل نے فوراً اس سے کہا۔

"اٹھئے ادیب صاحب، صبح ہو گئی رات کو جو فیصلہ کیا تھا اس پر فوراً عمل کیجئے ۔"

"کس فیصلے پر، ؟" ادیب نے ایک جماہی لے کر پوچھا، اسے اپنا فیصلہ یاد نہ تھا،

"ارے بھول گئے آپ، ارے بھئی اپنے ادب کے بستے کھولئے اور ان میں سے کم سے کم ایک کلو ردی چھانٹئے، کم از کم آج تو روٹیوں کا انتظام کرنا ہوگا نہیں۔"

"ہاں آج تو انتظام کرنا ہی پڑیگا، کمزوری کی وجہ سے آنکھیں تک نہیں کھل رہی ہیں، چلنے پھرنے کی طاقت بھی بے حد ماند پڑ گئی ہے ۔"

"تو پھر اٹھئے دیر کیوں کر رہے ہیں آپ؟"

اور پھر ادیب نے ایک انگڑائی لی۔ انگڑائی کے ساتھ ہی اسے ایک جھٹکا سا محسوس ہوا، جیسے بجلی کے ننگے تاروں نے اسے چھو لیا تھا، پورا جسم بے جان سا ہو گیا، ایک لمحہ کے لئے نگاہوں کے روبرو اندھیرا چھا گیا . . . یہ چار وقت کے فاقوں کے زیر اثر کمزوری کا جھٹکا تھا۔

ادیب اٹھا اس نے کاغذات کے بندھے ہوئے چار بستے ایک دیوار پر لگے تختے سے اتار کر فرش پر رکھے پھر وہ چٹائی پر بیٹھ گیا اس نے ایک بستہ کھولا۔

اس بستے میں فائنل ورشن کی ہوئی ساری فلم کی کہانیاں تھیں، چند لمحہ وہ فائلوں کے اس ڈھیر کو دیکھتا رہا، اس کا دل نہ چاہ رہا تھا کہ وہ ان فائیلوں کو اس وقت اور فاقہ کشی کے ان حالات میں بھی ردی کے خیال سے دیکھے بھی۔

"ان فائیلوں میں ردی کاغذ کہاں ہیں، یہ تو سب مکمل فلمی اسکرپٹ ہیں۔" اس نے اپنے دل کو آگاہ کیا۔

"مگر تین روٹیاں بیحد ضروری ہیں۔" اس کے دل نے جیسے یاد دلائی۔

"نہیں، بھوک میرے جسم کی بوٹیاں کھا سکتی ہے مگر میں ان فلمی کہانیوں کو چھ آنے کلو میں تولنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

اس نے اپنے دل کو اپنا فیصلہ سنایا اور پھر اس بستے کو جوں کا توں باندھ کر اپنے سامنے رکھتے ہوئے دوسرے بستوں سے دور سرکا دیا۔

پھر اس نے دوسرا بستہ کھولا، ابھی بستہ کھول کر وہ کاغذوں کو ہاتھ لگانے ہی جا رہا تھا کہ اس کی نگاہیں جلی الفاظ پر مرکوز ہو گئیں، یہ ایک ناول کا مسودہ تھا جس کے بالائی صفحہ پر موٹے موٹے الفاظ میں ناول کا عنوان تحریر تھا "غریبی دور ہو گئی"۔

ناول نگار یہ عنوان پڑھتے ہی اُس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، جس میں طنز کی تعداد کثیر تھی، ناول کا عنوان جیسے اُس کی نگاہوں میں چبھنے لگا۔ دل کی وادیوں میں عنوان کی تپش سے جھلس کر جیسے دراڑیں پڑ گئیں تھیں، اُس کے ذہن میں ناول کی کہانی تازہ ہو گئی۔

آزاد ہندوستان ترقی کی اُن بلندیوں پر پہنچ گیا تھا کہ سارے ملک میں خوشحالی سپیدہ سحر کی طرح بکھری ہوئی تھی، کسان کنگال نہ تھا، مزدور مجبور نہ تھا۔ ہر محنت کش انسان کو اُس کی محنت کا حق پورا پورا مل رہا تھا۔

یکایک ادیب کی آنکھیں جل اُٹھیں، اُس کے قلب میں ناول کے عنوان پر حقارت کا طوفان بپھر اٹھا تھا، پورے جسم میں حرارت شدت اختیار کرنے لگی۔

"غریبی دور ہو گئی، پورے ملک میں خوشحالی سپیدہ سحر کی طرح بکھری ہوئی ہے، سب خواب ہے، سب جھوٹ ہے، سب فریب ہے، یہ محض تصوراتی تخلیق ہے، اس میں حقیقت کے نام کا نشان بھی نہیں ہے، جس ملک کا ادیب غریب و نادار ہے وہ دیش کتنا بھی خوشحال ہو جائے کتنی بھی ترقی کر لے تہذیب و تمدن کے پہلو سے ہمیشہ ویران رہے گا۔ جس ملک کا ادب عروج پر ہوتا ہے وہ ملک ترقی کر رہا ہے کہا جا سکتا ہے۔

ادیب نے جیسے ناول کے عنوان کی تردید کی اُسے عنوان جیسے بے معنی سا محسوس ہوا، پھر اُس نے بستے پر نگاہ ڈالی، مسودے کے اوپر مسودے چنے ہوئے اُسے ایسے محسوس ہوئے جیسے فریب کی بنیاد پر ناول کا ہر مسودہ ایک ردا ہو۔

اس کے ساتھ ہی ایک بار اُس کے جی میں آیا کہ اس پورے بستے کو وہ ہاتھ بھی نہ لگائے بلکہ اسی طرح اُٹھا کر ردی والے کی دوکان پر لیجائے اور چھ آنے کلو میں تول دے، یہ محض جھوٹ فریب کی اور خالص تصوراتی کہانیاں ہیں، جن کی حقیقت صرف ادیب کے قلب و ذہن کی تشفی ہے۔

سنتے ہیں ادیب ملک و قوم کا راہبر ہوتا ہے، تہذیب و تمدن کا بوجھ اُس کے شانوں پر ہوتا ہے، ملک میں اتحاد قائم کرنے اور رکھنے کا فرض اُس پر عائد ہوتا ہے، ملک کے ہر انسان میں وطن پرستی کے جذبات پیدا کرنا اُس کا کام ہے۔

مگر ادیب فاقہ کرتا ہے یاس و حرماں کا مجسمہ ہے یہ کسی کی نگاہیں نہیں دیکھتیں، اُس کی زندگی کی بھوک سے نڈھال اور کمزور آواز کسی کے کانوں کو سنائی نہیں دیتی۔

اچانک ادیب کا چہرہ غصّے سے تمتما اُٹھا، سامنے کھلے رکھے ناولوں کے مسودوں کے بستے کو اُس نے حقارت کی نظر سے دیکھا، لگ بھگ بیس ناولوں کے مسودوں کا وہ ڈھیر اُسے ایسا محسوس ہوا کہ پانچ کلو آٹے کی روٹیوں کا ڈھیر اُس کے سامنے لگا ہو، وہ کم از کم دس دن آرام سے پیٹ بھر سکتا اور جی سکتا ہے۔

"ہاں بیچ دے ردّی میں اِس ادب کو تہذیب و تمدن کو، دیش کی فلاح و بہبودی کو، انسان کی نیک کرداری کو، انسانیت کی تصویروں کو، سماج کی اچھائی اور دیش کی یکتا کو، یہ سب جھوٹی کہانیاں ہیں، فریب کی کہانیاں محض تشفی کی کہانیاں ..... تہذیب و تمدن کے صفحات میں پرچون والا مسالحہ باندھ کر انسانیت نبھائیگا ۔۔۔ دیش کی فلاح و بہبودی کے صفحات غریب مائیں اپنے بچوں کو پاخانہ کرنے کے بعد انکے کولہے صاف کر کے اپنا فرض انجام دینگی، انسانیت اور انسان کی نیک کرداری کے صفحات امیر و کبیر گھرانوں کے ملازموں کے بچوں کے جوتے ... کے پاس ...

کے کام آ بیٹھ گئے۔

"نہیں، نہیں" ادیب کے ذہن کی نسیں کرب سے تڑپ کر چیخ اٹھیں ــــ اور ادیب کو وہ ناولوں کے مسودے اتنے عزیز لگنے لگے کہ وہ انھیں اپنے سینے سے لگا لینے کے لئے بیقرار ہونے لگا۔

"یہ مسودے کبھی ذبیح نہیں ہو سکتے، یہ مسودے ایک ادیب کے قلب و جگر کے ٹکڑے ہیں یہ کبھی تصوراتی نہیں ہو سکتے، یہ ادیب کی زندگی کی تصویریں ہیں یہ کبھی بے معنی نہیں ہو سکتیں، ایک دن ضرور آئے گا جب یہ کہانیاں حقیقت کا پیش خیمہ ہوں گی۔"

اس کے ساتھ ہی ادیب نے ناولوں کے تمام مسودوں کو بے حد اپنائیت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے بستہ باندھ دیا اور اسے بھی فلمی کہانیوں والے بستے کے قریب ٹھیل دیا۔

تیسرے بستے کو اپنے قریب کھینچتے ہوئے اُس کا سر بھنّانے سا لگا، اُس نے ایش ٹرے سے رات کی بجھی ہوئی بیڑیوں سے ایک بیڑی نکالی اور اُسے دیا سلائی سے سُلگایا، ایک کش لیا ہی تھا کہ بیڑی کا پتہ جلنے لگا اُس میں تمباکو ختم ہو گئی تھی، اُس نے دھوئیں کو نگل لیا اور بیڑی کو واپس ایش ٹرے میں ڈال کر بستہ کھولنے لگا۔

یہ بستہ شارٹ کہانیوں، اسٹیج اور ریڈیو ڈراموں، آرٹیکل اور مضمونوں کا تھا، اُس نے بستے پر نیچے سے اوپر تک ایک سرسری نگاہ ڈالی پھر اُس نے کلپ میں لگے ہوئے ایک افسانے کے کاغذات اُٹھائے، افسانے کا عنوان تھا "محبت کا مزار"۔

عنوان پڑھتے ہی اُس کے چہرے کا رنگ سوکھ گیا، غم کا ایک سایہ اُس کے چہرے پر نمایاں ہونے لگا، ایک سال پہلے کے شب و روز اُسے یاد آنے لگے وہ اپنی محبت میں ناکام ہو کر آج ایک مزار ہی تو بن گیا تھا اپنی زندگی کا کتنے ارمان دفن ہیں اُس کے سینے میں کتنے خوابوں کا مدفن ہیں اُس کی آنکھیں، کتنے ظلمات کے زخم ہیں اُس کے دل پر۔ محض سکوں کی بنا پر وہ بمل کو نہ پا سکا، محض تنگ دستی کی بنا پر اُس کی بمل کسی اور کی ہو گئی، وہ بمل جو اُس کی بہار حیات تھی، وہ بمل جو اُس کی عمر بھر کی جستجو تھی، وہ بمل جو اُس کے لئے دنیا کی نعمت تھی، اُس کی نہ ہو سکی محض پانچ ہزار سکوں کی محرومی نے اُس کو مزار بن جانے پر مجبور کر دیا تھا، کاش کہ بمل کا باپ زر پرست و قوم پرست نہ ہوتا، کاش کہ اِس دنیا میں انسان کے وجود کی اہمیت ہوتی کاش کہ انسان کے دل میں انسانیت کا درد ہوتا۔

ادیب کی نگاہیں افسانے پر مرکوز تھیں۔ افسانے کی تحریر میں اُسے بمل کا چہرہ دکھائی دینے لگا، اُس کی آنکھیں نم تھیں، ہونٹ لرز رہے تھے، جدائی کا غم اُس کے چہرے پر موٹی پرت بن کر جما ہوا تھا۔ یکلخت اُس کے دل سے ایک آہ پھوٹی جو ہونٹوں پر آ کر پھیل گئی اُس کے مُنہ سے آہستہ سے بمل کا نام نکلا۔

اچانک اُس کی آنتوں میں جیسے پتھر پسنے لگے، بھوک کی چبھن اُس کے ذہنی گنبد میں چکریاں کھانے لگی اُس کی نگاہوں کے روبرو دھبے سے پڑنے لگے، اُس نے افسانے پر سے نگاہیں ہٹا لیں، اور پھر جیسے ہوش و حواس میں لوٹ آیا، اُسے بھوک کا احساس شدت سے ہونے لگا، جس کے مقابلے میں بمل کی محبت اور یادیں دھندلی پڑنے لگیں، اُس نے اس بستے پر بھی ایک لمحہ نگاہیں مرکوز کر کے جائزہ لیا۔

"اس میں بھی ردی کاغذ کہاں ہیں ــــ" اُس نے اداس نگاہوں سے بستے کو دیکھتے ہوئے لبوں میں بڑبڑایا پھر اس بستے کو بھی باندھ کر فلمی اسکرپٹ اور ناولوں کے مسودوں والے بستے کے قریب سرکا دیا اور

ہاتھوں کو واپس لاتے ہوئے جو تھے بستے کو اپنے قریب
گھسیٹ لایا۔

یہ بستہ اُن تینوں بستوں سے بڑا تھا، اس میں
فلمی اسکرپٹوں کے ون سین اور کہانیوں، ڈراموں
آرٹیکل اور مضمونوں کے رن دو شن لکھے ہوئے تھے
ان کے علاوہ بہت سے ایسے بھی کاغذات تھے، جن پر وہ
اپنی نئی کھوج، نئے آئیڈیئے، نئے نئے الفاظ اور تراشیدہ
جملے، فلسفی آمیز مکالمے نوٹ کرتا تھا، جہاں کوئی ناول
کا خوبصورت پلاٹ ذہن میں آیا اُس نے کورے کاغذ
پر قلم بند کر دیا، بہت سے پلاٹ نامکمل تھے، بہت سی
کہانیاں ادھوری تھیں، بہت سے فلسفی آمیز مکالمے
اور بہت سی عجیب عجیب تحریریں تھیں اس بستے میں۔

اُس نے بستہ کھولا، اور ابھی چند ہی کاغذات
ردی کے طور پر اُس نے چھانٹے تھے کہ ایک کاغذ پر
اُس کی نگاہیں پڑھنے لگیں۔

"زندگی اور موت کے درمیان لمحات کا پُل
ہوتا ہے، جس پر سانسوں کے قدموں سے چلتا ہوا
انسان اپنی منزل مقصود کے کناروں سے ہمکنار
ہوتا ہے۔

اس منزل مقصود کا کنارا موت کی وادی کا
دہانہ ہی نہیں ہوتا، بلکہ اُس کی زندگی کے ہر عمل و
اعمال کا انعام و کفارہ بھی ہوتا ہے۔

"موت کی وادی کا دہانہ خالق کے دامن کا کنارہ
بھی ہوتا ہے، لیکن بہت سے انسان اپنے خالق کے
دامن کے اِس کنارے کو محض موت کے نام سے جانتے
ہیں، اس کی وجہ یا تو غربت و افلاس ہوتی ہے،
یا پھر وہ زندہ رہتے ہوئے زندگی سے دور رہتے ہیں
یا محض ایک جانور کی زندگی کو زندگی سمجھ کر روٹیوں یا
سکوں کے ہاتھوں بک کر موت کو محض زندگی کا انجام
سمجھ کر جیتے ہیں۔۔۔۔ موت کی اہمیت یا موت کی
ہستی سے ناواقف ہونا انسان کے لئے اُس کی کم عقلی
نادانی کہا جائے گا۔"

ادیب نے تحریر پڑھ کر ختم کی، زندگی کے معنی،
موت کی اہمیت لکھی ہوئی تھی اِس کاغذ پر، کیا اس تحریر
میں کہی گئی خام خیالی ہے؟ کیا اِس کاغذ کو ردی کی
بساط دے کر جھونکے کے ڈھیر میں شریک
کر دوں؟"

وہ نہیں نہیں۔ یہ فلسفی فریب نہیں ہے، محض پرواز
تخیل نہیں ہے، یہ تو انسان کی زندگی کی حقیقت
ہے، نہیں یہ ردی کاغذ نہیں ہے۔"

ادیب نے اُس کاغذ کو ایک طرف سنبھال کر رکھ
دیا، پھر وہ دوسرے کاغذوں پر نظر ڈالنے لگا، وہ ہر کاغذ
میں کوئی نہ کوئی تحریر شدہ ایسی بات پاتا کہ وہ کاغذ
اُسے اپنی جان کی طرح عزیز لگنے لگتا۔ اور وہ چند لمحات
اُس کاغذ کو ردی کے کاغذوں میں رکھنے کے لئے
فیصلہ کرتا رہتا۔ اور جب اُس کا دل اُسے وہ کاغذ
ردی کرنے پر مجبور کر دیتا تو وہ اُس کاغذ کو ردی کے
کاغذوں میں رکھتا۔۔۔

اب اُس کے ہاتھ میں جلیاں والا باغ کا نامکمل
افسانہ تھا، اُس نے اس نامکمل افسانے کو ایک سنجیدہ
نگاہ سے دیکھا، اُسے محسوس ہوا جیسے اب وہ افسانہ
بے معنی و بے مقصد ہو؟ اِس افسانے کو مکمل کرنے
سے اب کوئی فائدہ نہیں" وہ لبوں میں بڑبڑایا اور
پھر بڑی لاپروائی سے اُس نامکمل افسانے کے اوراق
اُس نے ردی کے کاغذوں میں پھینک دئیے۔

اور اب اُس کے ہاتھ میں فیشن پرستی اور آج کی
ماڈرن سوسائٹی کے مفہوم پر ایک اسٹیج ڈرامہ تھا۔
جس میں فیشن پرستی پر گلہ چیتا کرتے ہو۔۔۔ فیشن پہنتا

کو بے حیائی کہا گیا تھا۔

"فیشن کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ جسم کی نمائش کی جائے جس ماڈرن سوسائٹی میں لڑکیاں یا عورتیں اپنی پنڈلیاں، رانیں، ناف، پیٹ اور پیٹھ ننگا رکھ کر گھومتی ہیں، بوائے فرینڈ کہلا کر کئی کئی لڑکوں کے ہاتھ اپنے شانوں اور اپنی کمر پر پھیلنے دیتی ہیں، کیا یہ سوسائٹی ہندوستان جیسے مہان سانسکرتی والے دیش پر کلنک نہیں ہے۔"

ادیب ڈرامے کے اس مفہوم کو یاد کر کے کئی لمحات کشمکش میں الجھا رہا۔ "کیا وہ اس ڈرامے کو ردّی کے ڈھیر میں ڈال دے۔"

"نہیں نہیں، اس ڈرامے کو تحریر کر کے تو میں نے تہذیب و تمدن اور عظیم کردار کی تصویر پیش کی ہے ـــــ ہندوستان کی عظمت کی پہچان کرائی ہے، میں اسے ردّی میں کیسے تول دوں!"

اُس نے ڈرامے کے مسودے کو ردّی کے ڈھیر میں ڈالنے سے اعتراض کیا، اُسے ڈرامے کے مسودے کے کاغذات بڑے دلکش و عزیز لگنے لگے، اُس میں ذرا بھی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اس مسودے کو ردّی کے ڈھیر میں چھ آنے کلو میں تول دے۔

ابھی وہ کشمکش میں مبتلا ہی تھا کہ اُس کے پیٹ میں زوردار مروڑ سی ہوئی، اُس کی آنتیں جیسے اینٹھنے لگیں، وہ مروڑ کے درد سے بیتاب ہو گیا، بھوک کی یہ مروڑ درد کی لہر پورے جسم پر اُتر گئی اُس نے کراہ کر دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبا لیا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب اُس نے اپنے اوپر ... مروڑ کا درد ختم ہو گیا تو اُس کی نگاہیں پھر ڈرامے کے مسودے پر مرکوز ہو گئیں وہ پھر فیصلے کی سوچ میں غلطاں ہو گیا۔

پھر اُس کی نگاہیں ردّی کے کاغذوں کے ڈھیر پر جا گریں، اُس نے تمام ردّی کاغذوں کو ٹھیک کیا، اور دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کر ترازو کے پلڑے کی طرح وزن کا اندازہ کرنے لگا۔ "ابھی تو آدھا کلو بھی وزن نہیں ہے۔" اُس نے اندازہ لگایا، اور اس کے ساتھ ہی بیزاری اور حقارت سے اُس نے ردّی کاغذوں کو فرش پر پٹخ دیا۔

"کمبخت گھاسلیٹ ستر پیسے لیٹر ہو گیا، صابن کی ٹکیہ اسّی پیسے کی ہو گئی، نمک جو کبھی تول کر نہیں بکا وہ اب چار آنے کلو بکنے لگا۔ پٹالو سوا روپیہ کلو ہو گئے پیاز بہتر پیسے کلو ہو گیا، اول دال اور ڈھائی روپیے کلو، جھاڑو جیسی معمولی سی چیز بھی آٹھ آنے کی ہو گئی ہر چیز کی قیمت بڑھ کر آسمان کو چھونے لگی ہے مگر سالی ردّی اب بھی چھ آنے کلو ہی بکتی ہے۔"

ادیب ڈرامے کے مسودے کو بے صدا اپنائیت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ اب بھی اُس کا جی اُس ڈرامے کے مسودے کو ردّی کے ڈھیر میں ڈالنے کے لئے تیار نہ ہو رہا تھا ـــــ

یکایک اُس کے پیٹ میں پھر مروڑ اُٹھی۔ اب کی بار تکلیف پہلے سے بھی زیادہ محسوس ہوئی، وہ تکلیف پر قابو پانے کے لئے پیٹ کو پھر دونوں ہاتھوں سے دبا کر بیٹھا رہا، کراہ اُس کے ہونٹوں پر آ آ کر پھیلنے لگی تھی، اُس کی نگاہوں کے روبرو دھندلکے نمایاں ہونے لگے، اُس کا پورا جسم جیسے بے جان ہو گیا تھا اُس میں بیٹھے رہنے کی طاقت نہ رہ گئی تھی۔ اُس نے پیچھے سرک کر روم کی دیوار سے ٹیک لگالی اور آنکھیں موند کر بھوک کی اُس مروڑ پر قابو پانے کے لئے جیسے ہمت اکٹھی کرنے لگا۔

کچھ دیر وہ اُسی طرح آنکھیں موندے مروڑ کو

برداشت کرنے کی کوشش کرتا ہوا بیٹھا رہا، جب مردٹر مند ہوئی تو اُس کے چہرے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمکنے لگی تھیں۔ اور جسم میں حرارت بڑھنے لگی تھی، کمزوری سے اُس کا جسم بے جان ہو جانے کی صورت اختیار کرنے لگا تھا۔

بڑی مشکل اور بڑی کوشش کے بعد اُس نے اپنے آپ کو اِس قابل رکھ پایا کہ وہ کھلے بستے میں کاغذوں کے ڈھیر کو دیکھ کر کوئی فیصلہ کر لے۔

ہاں صرف فیصلہ۔

کاغذوں کو الٹنے پلٹنے اور غور و خوض کرنے کے لئے اُس میں طاقت نہیں تھی، بس فیصلہ کر سکتا ہے اور وہ بھی بہت جلد۔

صبح کے دس بج گئے تھے، وہ مسلسل چار گھنٹے سے ردّی کاغذات چھانٹ رہا تھا۔ مگر آدھا کلو ردّی بھی وہ نہیں چن سکا، ہر اسکرپٹ، ہر ڈرامہ، ہر افسانہ ہر مسودہ یہاں تک کہ ہر فلسفہ آمیز جملہ اور ہر کاغذ اُسے بڑا ہی قیمتی اور بڑا ہی پُر معنی، عظیم اور بڑا ہی پیارا لگ رہا تھا۔

مگر بھوک کا احساس اب اُسے اِس مقام پر لے پہنچا تھا کہ ہر لمحہ اُسے بڑا بھاری لگنے لگا تھا، اُس کی آنتوں میں کچھ وزن کی ضرورت تھی، مگر وہ وزن کسی دیگر سرنگ و دہانے سے نہیں پہنچایا جا سکتا تھا، صرف منہ کے ذریعے اور وہ بھی گلے سے نگل کر پہنچایا جا سکتا تھا۔

مٹی یا پتھر نگل لینا نا ممکن تھا، ڈیڑھ پاؤ کلو آٹا چاہیئے اُسے، محض تین روٹیاں صرف چھ آنے کا آٹا ــــ،،

ابھی سوچتے ہوئے اُسے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ بھوک کا احساس پھر شدت کے ساتھ جاگ اُٹھا اب کہ اِس احساس نے اُس کے قلب و ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اُس کا سر درد سے پھٹنے لگا، اور اب اُس میں قوتِ برداشت نہ رہی تھی، اُس کے چاروں طرف سناٹا طاری ہوتے لگا تھا، اور جیسے برف باری کی لہر اُس کے پورے جسم پر اُتر گئی تھی، اب وہ کچھ بھی سوچنے سمجھنے کی حالت میں نہ تھا۔

اور۔۔۔ اُس کے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی جس کی تپش نے اُس کے پورے جسم پر اُتری ہوئی برف باری کی لہر کو دبوچ لیا، اب حرارت سے اُس کا پورا جسم تپنے لگا اور غصے سے اُس کا چہرہ تمتما اٹھا، اور پھر اگلے ہی لمحہ سامنے رکھا ہوا ردّ تحریروں کے کاغذات کا بستہ اُسے بے حد حقیر دکھائی دینے لگا، کاغذوں کا ڈھیر محض ردّی کا ڈھیر لگنے لگا اُسے، وہ غصے سے بھبھک کر اٹھا اُس نے ردّی کاغذوں کے ڈھیر کو بستے کے کاغذوں میں رکھا اور پھر بڑی لاپرواہی سے اُس نے بستے کو باندھا اور پھر اُس بستے کو اُٹھا کر بڑے غصے سے بڑبڑاتا ہوا کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

ادیب تہذیب و تمدن کا ٹھیکیدار ضرور ہے مگر بھوک سے نحیف و لاغر، کندھے پر تہذیب و تمدن کا بوجھ خالی پیٹ نہیں اٹھایا جا سکتا ــــ"

ادیب اپنا فرض چھ آنے کلو میں تولنے کے لئے ردّی والے کی دوکان کی طرف بڑھتا جا رہا تھا، اور اس وقت اُسے بستے کا وزن اپنے کندھوں پر بے حد وزنی محسوس ہو رہا تھا ــــ

مظفر صہبائی

غزل

راس آجائے ہمیں پیار کا لمحہ کوئی
اپنے زخموں کا نہیں اور مداوا کوئی

درکِ احساس کی آنکھوں سے عبارات پڑھو
ان کتابوں میں بھی مل جائے نہ صحرا کوئی

بے مکانی جو مقدر ہے تو شکوہ کیسا
مل ہی جائے گا کہیں رین بسیرا کوئی

اپنے ہی زخم کو پاتا ہوں برہنہ یارو
توڑ دیتا ہے ہر اک شب مرا چہرہ کوئی

کس سے کہتا کہ محبت کی ضرورت ہے مجھے
دو گھڑی آکے مرے پاس نہ ٹھہرا کوئی

اب روایات کی تجدید سے حاصل کیا ہے
اب تو باقی نہیں اس راکھ میں شعلہ کوئی

دوست سب چھین چکا تیرگیٔ وقت ظفر
ڈھونڈتا پھرتا ہوں اب اپنا ہی سایا کوئی

★

منظر حسن دسنوی

غزل

کیا تم کو بتاؤں ہم نفسو، کیوں ضبط کا دامن چھوڑ دیا
سینے میں تپش کچھ ایسی تھی، اک داغ کو روشن چھوڑ دیا

آداب جنوں تھے پیش نظر اور ہوش تھا اتنا وحشت
اپنا ہی گریباں یاد آیا، اس شوخ کا دامن چھوڑ د

طوفاں کا گزر، صیاد کا ڈر، کچھ بھی تو نہ تھا اس مامن میں
کانٹوں کی طلب ہی تھی شاید، خود اپنا نشیمن چھوڑ دیا

کب تک میں رہین درد رہوں کب تک مرا دامن چاک
جب یاس بڑھی، کچھ حد سے سوا تو نالہ و شیون چھوڑ د

سانسوں میں چبھن، اشکوں میں جلن ویرانیٔ دل کو کیا کہیے
ارماں کی شمعوں کو لے کر اس دشت میں روشن چھوڑ دیا

ہنگام بہاراں ہے شاہد پوچھو تو ذرا کیوں منظر
یوں آبلہ پا ہونے کے لیے پھر گوشۂ گلشن چھوڑ د

اب ذوقِ اسیری اس کو کہیں یا کم نگہی اپنی منظر
زنجیر نہیں جب پاؤں میں کیوں کوچۂ دبرزن چھوڑ دیا

★

جگن ناتھ آزاد کی شاعری

(عبد المغنی)

جگن ناتھ آزاد کی شاعری ایک تہلکے کی پیداوار ہے، وہ ایک ایسے وقت میں نمودار ہوئی جب برصغیر ہندوستان اپنی تاریخ کے ایک انتہائی بحرانی دور سے گزر رہا تھا، اس خطۂ زمین کی تہذیب بڑی آزمائش میں پڑ چکی تھی، جنگِ آزادی کا تلاطم ابھی ختم ہی ہوا تھا کہ تقسیم کی خانہ جنگی شروع ہو گئی اور تمام انسانی قدریں تہ و بالا ہو کر رہ گئیں، ہر طرف ایک آگ کا دریا پھیل گیا جس کے شعلوں میں تہذیب انسانیت کی تمام روایات جل کر بھسم ہوتی نظر آئیں اور برصغیر کی تاریخ راکھ کا ایک ڈھیر بن گئی۔

وقت کے اس تہلکے کی چوٹ جگن ناتھ آزاد پر بالخصوص بہت ہی گہری پڑی، وہ وطن میں اجنبی بن کر رہ گئے، ان کی روح کا گھروندہ ان سے چھوٹ گیا اور نتیجتاً ان پر وہ سانحہ گزر گیا جو سینے کے اندر سے دل نکل جانے سے واقع ہوتا ہے، چنانچہ آزاد کی شخصیت ایک تصویرِ درد بن گئی، ان کے زخمی شعور میں ٹیسیں اٹھنے لگیں اور یہ ٹیسیں ان کے پرسوز نالوں سے گونجنے لگیں۔

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری
ذرا دیکھو کہ اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گزری

بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا
بتا اے پیرِ میخانہ یہ میخانوں پہ کیا گزری

فضا میں ہر طرف کیوں دھجیاں آوارہ ہیں دامن کی
جنونِ سرفروشی تیرے افسانوں پہ کیا گزری

وصالِ شمع کی حسرت میں سب بیتاب پھرتے تھے
میں کیا جانوں حضورِ شمع پروانوں پہ کیا گزری

کچھ دیدِ حرم والو یہ تم نے کیا فسوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری

ابھی تو چشمِ عبرت وقت کی رفتار دیکھے گی
ابھی یہ کس طرح کہہ دیں ستم رانوں پہ کیا گزری

نہ پوچھ آزاد اپنوں اور بیگانوں کا افسانہ
ہوا تھا کیا یہ اپنوں کو یہ بیگانوں پہ کیا گزری

(۱۵ اگست ۱۹۴۷ء - بیکراں)

تری بزمِ طرب میں سوزِ پنہاں لے کے آیا ہوں
چمن میں یادِ ایامِ بہاراں لے کے آیا ہوں

تری محفل سے جو ارمانِ حسرت لے کے نکلا تھا
وہ حسرت لے کے آیا ہوں وہ ارماں لے کے آیا ہوں

تمہارے واسطے اے دوستو میں اور کیا لاتا
وطن کی صبح تک شامِ غریباں لے کے آیا ہوں

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
کہ اپنے آپ کو مانندِ مہماں لے کے آیا ہوں
نکلا ہوں میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں لیکن
تفکر میں جمالِ صبحِ تاباں لے کے آیا ہوں
سوا اس کے اب اے آزاد میرا بس کہاں تک ہے
اندھیری رات میں ذکرِ چراغاں لے کے آیا ہوں

(اشعار۔ لاہور میں کہے گئے۔ وطن میں اجنبی)

دونوں محوّلہ مجموعوں کے ان اشعار کو ملا کر پڑھنے سے آزاد کی شاعری کے دو بنیادی نکتے سامنے آتے ہیں۔ اول یہ کہ ان کا سوزِ سخن ۱۹۴۷ء اور اس کے گرد و پیش کے احوال و کوائف کا پروردہ ہے۔ دوم یہ کہ احوال و کوائف آزاد کے لئے صرف دور کا جلوہ نہیں بلکہ دراصل ان کے مقدر کا ایک حصّہ ہیں، یہ محض ان کے علم و ادراک کی چیزیں نہیں، بلکہ ان کے تجربہ و احساس کے عناصر ہیں یہ کوائف ان کے لئے غمِ کائنات سے زیادہ غمِ ذات کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے شعور کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج میں پیوست ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد کے نالے دل سے اٹھتے ہیں اور دل پر گرتے ہیں۔ ان نالوں میں ایک ٹیس ہے، ایک ہوک ہے، ان ہی آرزوؤں کی شکست کی آواز ہے اور بے پناہ حسرت ہے۔

لیکن تلخی، برہمی اور قنوطیت کا کوئی اُبھار اس صدائے درد میں پایا نہیں جاتا، حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو اس کو ان المناک حالات و تجربات کا ایک فطری ردِ عمل کہا جا سکتا تھا جن سے جگن ناتھ کو شخصی طور پر گذرنا پڑا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آزاد کے اس قسم کے اشعار میں ایک لطیف نیکوکاری طنز کی کیفیت ہمیشہ موجود رہتی ہے، مگر اس کا تیور کبھی بھی زہرخند کا نہیں ہوتا، بلکہ اس میں دردناکی کا انداز غالب ہوتا ہے۔ آزاد کی شاعری کا یہ آہنگ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے ان کے فن کی نوعیت آشکار ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں۔ اول یہ کہ یہ فن قنوطی نہیں، اس میں یاس کا غلبہ نہیں، بلکہ اس میں برق سے شمعِ ماتم روشن کرنے کی شان ہے، یعنی آزاد کا غم ان کے لئے طاقت اور اس طرح سامانِ تعمیر ہے، نہ کہ خانہ برباد باعثِ اضمحلال۔ دوم یہ کہ یہ فن ہنگامی اور سطحی نہیں اس کے پس منظر میں کچھ مستقل اقدار و تصورات ہیں جو تمام آلام و شدائد کے باوجود شاعر کے ظرف و ضمیر کی اور استقامت کے ضامن ہیں، چنانچہ وہ اپنے جذبات و احساسات کو خام، طفلانہ انداز میں آنے نہیں دیتا، بلکہ ان کو ایک بالغ اور پختہ اسلوب سے رچا کر پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو چیز ایک باذوق قاری اور سامع کو اپنی طرف کھینچتی ہے وہ محض اشعار کے محرکات نہیں بلکہ خود اشعار ہیں۔

میرے خیال میں آزاد کی یہ شاعرانہ خصوصیت موجودہ دور کے لئے ایک فنی معنویت رکھتی ہے۔ آج شاعری کی جا رہی ہے اس کو درد و غم ہی کی تخلیق بتایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ آج کے فن کار کے ذہن و قلب پر وہ چوٹ پڑی ہے اور آج کا ماحول فن کار کے لئے اتنا اذیت ناک ہے کہ اس کی نارسائی، تلخی، برہمی اور پراگندگی اس کی فطری مجبوریاں ہیں، جو کچھ وہ معاشرے سے پاتا ہے وہی اس کو لوٹا رہا ہے۔ اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جگن ناتھ جس آگ کے دریا کو تیر کر فن کے ساحل پر آئے ہیں اس سے زیادہ بھیانک اور ہوشربا دور یقیناً نہیں جس سے نئی نسل اپنے آپ کو نبرد آزما سمجھتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خدا کی بستی کے اندر اداس نسلیں تلاشِ بہاراں میں آوارہ پھر رہی ہیں اس کی پہلی اور سب سے کاری ضرب تو جس نسل نے برداشت کی اسی کے ایک نمایاں ترین رکن جگن ناتھ ہیں۔ اس لئے ماحول اور اس کی چوٹ

اثرات کو کس طرح ایک فن کار، مخالف اثرات کے باوجود، اپنے فن کے سانچے میں ڈھالتا ہے، اگر اس کا مطالعہ کرنا ہو تو ۱۸۵۷ء کے تھلکے سے ابھرنے والے ان نغمات کا مطالعہ کیا جائے جو آزاد نے اردو شاعری کو دیے ہیں۔ اس مطالعے سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ایک حقیقی فن کار اپنے سماج سے جو کچھ پاتا ہے اس کو فن کی صورت میں کس طرح لوٹاتا ہے۔

بلاشبہ ماحول اور اس کے تجربے نے آزاد کی آواز میں ایک دردناکی اور حسرت خیزی پیدا کر دی، مگر کرب و بلا نے ان کا ذہنی و نفسی توازن برہم نہیں کیا، چنانچہ نہ تو ان کی فکر میں کوئی آوارگی پیدا ہوئی اور نہ فن میں ناہمواری۔ مصائب نے انھیں پاگل نہیں بنایا، بلکہ کچھ اور سیانا کر دیا، اور مصائب کے شدید احساس نے ان کے فنی سانچے کو ریزہ ریزہ کرنے کے بجائے اسے کچھ اور مستحکم کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد نے اس معاملے میں ایک سچے فن کار کے ظرف اور ضمیر کا ثبوت دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جذبات و احساسات کی تمام درد انگیزی کے باوجود آزاد نے غزل کی نزاکت کو کبھی مجروح نہیں کیا اور اس کی تمام لطیف اداؤں کو اپنے اظہار و بیان میں پوری طرح ملحوظ رکھا۔ اسی طرح اپنی تخیل کی جراحت اور تصور کی شدید ناکیوں کو انھوں نے اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ نظم کے وقار و تمکنت پر ضرب لگائیں اور اپنی نظم نگاری میں ترکیب و ترتیب کے آداب کی بہر حال تعمیل کی۔ نئی نسل کے شاعروں کے لیے آزاد کے اس شعور و کردار میں ایک نمونۂ عمل ہے۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ آزاد کی اس شاعرانہ استقامت کے وسائل و اسباب کیا ہیں، ان کے فن کو وہ کون سا پس منظر نصیب ہوا جس کی بدولت ناسازگار حالات میں بھی اس کا توازن برقرار رہا؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنا آج کے دور میں گویا ظلمات کے اندر چشمۂ حیات کا سراغ لگانا ہے۔ بہر حال اس جستجو میں آزاد کے شعور کا ایک اور کمال نظر آتا ہے اور ان کے فنی شعور کا ایک پہلو نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اس سلسلے میں آزاد کی چند اہم اور بڑی نظموں کا مطالعہ معلومات افزا ہوگا۔ ان میں سب سے نمایاں "اردو" "بھارت کے مسلمان" اور "دہلی کی جامع مسجد" ہیں۔ ان نظموں میں محض شاعری یا صناعی یا فقط معروضی مطالعہ نہیں ہے، بلکہ شاعر کے ذہن و روح کی موضوعی وابستگی کے آثار ملتے ہیں اور ایک ایسی کیفیت مترشح ہوتی ہے جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ موضوعات شاعر کی پسندیدہ تہذیبی قدروں کے اشارات و علامات ہیں۔ چنانچہ یہی وہ قدریں ہیں جن کے حوالے سے شاعر فکر سخن کرتا ہے اور یہی قدریں وہ فنی استعارات و تلمیحات اور رموز و علائم فراہم کرتی ہیں جن کے ذریعے افکار و تخیلات اشعار کے روپ میں ڈھلتے ہیں۔

اسلام تو مہر اور مروت کا بیاں ہے
اخلاص کی روداد، محبت کا بیاں ہے
ہر شعبۂ ہستی میں صداقت کا بیاں ہے
اک زندہ و پائندہ حقیقت کا بیاں ہے
کیوں دل میں ترے ہو نہ حقیقت یہ فروزاں
بھارت کے مسلماں

قرآن کی تعلیم سے پھر درس بقا لے
پھر روح میں پیغام محمدؐ کو بسا لے
گذرے ہوئے عظمت کے زمانے کو بلا لے
روٹھی ہوئی ایمان کی دولت کو منا لے
ایمان کی دولت کو گنوا کے ہوئے حیراں
بھارت کے مسلماں

(بھارت کے مسلماں)

تو فقر کی تصویر ہے وہ زیرِ سماوات
ہیں جس سے عیاں سینۂ آدم کے کمالات
دنیا کو دکھا آج کوئی حسنِ کرامات
تو چشمۂ حیواں ہے جہاں عالمِ ظلمات
تو آج ہے اک سوزِ محبت کا نمونہ
اے آدمِ خاکی کی کرامت کا نمونہ
ہر خشت میں آباد ہے افکار کی دنیا
ہر سنگ میں ہے جذبۂ بیدار کی دنیا
ہر نقش میں خوابیدہ ہے اسرار کی دنیا
تعمیر ہے تیری کہ ہے انوار کی دنیا
کیا تجھ سے کہوں کیا ہے تری اوج مقامی
تو عالمِ فانی میں ہے اک نقشِ دوامی
(دہلی کی جامع مسجد)

جگن ناتھ تقسیم ملک کے نتیجے میں پنجاب سے ایک ہندو پناہ گزین کی حیثیت سے ہندوستان آئے اور غیر فطری طور پر اس ترکِ وطن کا نہایت ہی شدید اثر بھی انھوں نے قبول کیا، پھر وہ مغربی تعلیم کی گود میں پرورش پائے ہوئے ایک جوان تھے۔ چنانچہ صورتِ حال کا ایک ردِّ عمل یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ یا تو مسلم دشمن ہو جاتے اور اسلام بیزاری کا ثبوت دیتے یا پھر سرے سے مذہب بیزار ہو کر لادینیت اور اشتراکیت وغیرہ کی باتیں کرتے۔ لیکن انھوں نے نہ تو اس تعصب کا اظہار کیا اور نہ اس سطحیت کا، بلکہ اسلام اور مسلم معاشرت کی انسانی قدروں کا جو گہرا تہذیبی اثر انھوں نے اپنی ذہنی تشکیل کے ابتدائی دور میں قبول کیا تھا اس کو ایک متاعِ گراں بہا کی طرح سینے سے لگائے رکھا، یہاں تک کہ تقسیم کے فوراً بعد جب ہندوستان کے مسلمان سخت انتشار میں مبتلا تھے آزاد نے ایک پناہ گزین ہونے کے باوجود ان کو اپنی تشکیلِ نو کا جو پیام

دیا یا اس میں انھیں اسی دین اور اس کی تہذیب کے احیا کی طرف مائل کیا جو آزاد ہندوستان میں کل بھی ... تھے اور آج بھی ہیں اور جن کو کسی نہ کسی عنوان سرحد کے اس پار تمام فسادات کی جڑ قرار دیا جاتا ہے۔ ... ہے کہ ایسے دین و تہذیب کے احیا کا پیام کسی مصلحت پر مبنی نہیں ہو سکتا، بلکہ وسیع النظری اور عمیق نگاہی ... ساتھ ہی ساتھ اس سے اسلامی تہذیب کے ساتھ آز... کے ایک روحانی رشتے اور جذباتی ربط کا سراغ ... ہے، اس تہذیب کے ساتھ ان کی ذہنی وابستگی اور شیفتگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ بات اقبال کے ساتھ آ... کی بے پناہ عقیدت سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ اس تجز... سے واضح ہوتا ہے کہ وہ تہذیبی پس منظر جو آزاد ... فکر و فن کی استقامت کا ضامن ہے دراصل اسا... مہیا کیا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد کی شاعری کا سب... قیمتی حصہ وہ ہے جو تقسیم سے پیدا شدہ حالات پر... تاثر کے نتیجے میں بروئے کار آیا ہے۔ اس حصے کے ... مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تخئیل شاعر... شیش محل جو ٹوٹ گیا۔ تو وہ سراپا درد بن کر اس کے ... ایک ریزے کو پلکوں سے چن چن کر اپنے نگارخانے کی ... تشکیل کرنی چاہتا ہے اور اس تشکیلِ نو کے لئے خا... ان لوگوں کو غیرت دلا کر شریکِ تعمیر کرنا چاہتا ہے جو ... نگارخانہ تہذیب کے دوسروں سے زیادہ دعوے دار ...

میرے نزدیک جگن ناتھ آزاد کی شاعری کی ا... اہمیت یہی ہے۔ کلامِ آزاد کے اندر سوز و داغ و جستجو ... کی ساری کیفیت اس کے اسی حصے میں پائی جاتی۔ ... بات یہ ہے کہ کوئی فن عظمت کی راہ میں اسی وقت گا... ہوتا ہے جب اس کا رشتہ کسی عظیم نصب العین ا... تصورِ حیات سے کم از کم جذباتی طور پر استوار ہو... اس لئے کہ عظمت ہمیشہ مثبت انداز فکر سے پیدا ہوتی ...

خواہ فن کار کو جن حالات سے سابقہ پیش آئے وہ کتنے ہی منفی کیوں نہ ہوں، اور آزاد کو جذباتی طور پر یہی مثبت اندازِ نظر اسلامی تصورِ حیات کے ذریعے میسر آ گیا ہے، حالانکہ جہاں تک ان کی عمر کے بہترین حصے (شباب) میں ملا اس کے سارے تیور بالکل منفیانہ تھے، مگر شاید کچھ تو عمر کے سب سے اثر پذیر حصے (بچپن) کی تربیت ان کے کام آئی اور اس کی شیریں یادوں نے بہت ہی آڑے وقتوں میں انھیں سہارا دیا، اور کچھ ان کے والد تلوک چند محروم کی وہ بزرگی ان کے لئے مشعلِ راہ بنی جو فسادات کے ریگستان میں ایک نخلستان کی طرح جگن ناتھ کے پورے خاندان پر سایہ فگن رہی اور اسے تقسیمِ ملک کے ان شعلوں سے ذہنی و جذباتی طور پر محفوظ رکھا جو گرد و پیش کی تمام تہذیبی قدروں کو جلا کر خاکستر کئے دے رہے تھے، یا پھر آزاد کی اپنی ہی سلیم فطرت تمام تاریکیوں میں انھیں روشنی دکھاتی رہی، بلکہ شاید زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ان تمام عوامل نے مجموعی طور پر آزاد کے اندازِ نظر کے تار و پود بُنے۔ بہرحال آزاد کے عقائد جو بھی ہوں، ایک مخصوص نظامِ اقدار نے، جسے میں اسلامی کہتا ہوں، انھیں اس وقت اپنے جذبات کو حسن آفریں بنانے پر قادر کیا جب ایک بے پناہ سوز ان کے پورے وجود کو تپا رہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ واقعہ آزاد کو ان کے اپنے طبقے میں پوری اردو شاعری کے اندر بہت ممتاز کر دیتا ہے۔ میں یہاں یہ بات صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے خیال میں اردو ادب اور شاعری کا تہذیبی نظام بنیادی طور پر اسلامی ہے، خواہ اس ادب اور شاعری کی تعمیر و ترقی میں از روئے فن غیر اسلامی عقائد رکھنے والے ادبا و شعرا کا شخصی طور پر کتنا ہی دخل کیوں نہ ہو، ٹھیک جس طرح انگریزی ادب اور شاعری کا تہذیبی نظام اصلاً مسیحیت سے ماخوذ ہے، حالانکہ مسیحیت سے اختلاف ہی نہیں بغاوت کرنے والے بھی انگریزی شعر و ادب کی تاریخ میں ایک مقام رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے اردو شاعری میں جگن ناتھ آزاد کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے ایک مختلف عقیدے کا ورثہ پانے کے باوجود واضح طور پر اپنے ادب کے تہذیبی نظام کے ساتھ اپنی ذہنی و قلبی وابستگی کا اقرار و اظہار کیا اور اپنی دنیائے جذبات اس حد تک اس کے اشارات و استعارات سے آباد کی کہ ایک بہت ہی نازک اور پُرخطر ساعت میں اس تہذیبی نظام پر موروثی عقیدہ رکھنے والوں کو ان کے تنزل نے علی الرغم ایک پیامِ اُمید دیا۔ میرا مطالعہ یہ ہے کہ آزاد کی شاعری کے بہترین حصے میں جو زورِ سخن اور سوزِ فن ہے وہ اسی پیام کے اجزائے ترکیبی کی بدولت ہے۔ اس کی ایک بیّن دلیل یہ ہے کہ آزاد کے کلام کی ساری قوت ان کے اسی حصۂ شاعری میں مرتکز ہے اور یہی حصہ ان کے فن کا طرۂ امتیاز ہے، اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس کی حیثیت حواشی سے زیادہ نہیں بنتی۔ آزاد کا مقام اردو شاعری کی تاریخ میں یہی ہے کہ وہ المیۂ تقسیم کے سب سے موثر نغمہ خواں ہیں۔ اگرچہ آزاد کا کلام کئی مجموعوں میں پھیلا ہوا ہے (اس وقت میرے سامنے بیکراں، ستاروں سے ذرّوں تک، وطن میں اجنبی اور نوائے پریشاں نیز کچھ کتابچے اور کچھ غیر مطبوعہ تخلیقات ہیں) مگر ہر مجموعے میں بالعموم ان کی کسی غزل کا وہی شعر اور کسی نظم کا وہی بند بہتر نظر آتا ہے جس میں المیۂ تقسیم کے کرب کا کوئی عکس و نقش ہے۔

لیکن آزاد نے اپنی تمام تر توجہات اس حصۂ شاعری پر مرکوز نہیں کیں، بلکہ شاید ترقی پسندی اور روشن خیالی کا ثبوت دینے یا کچھ اپنے نئے ماحول سے ساز کرنے کے لئے انھوں نے وقت کے چلتے ہوئے موضوعات پر بھی طبع آزمائی کرنا ضروری سمجھا، جیسے قوم پرستی، سوشلزم، تہذیبِ جدید، سیکولرزم، صنعتی ترقیات وغیرہ [illegible]

خود یہ موضوعات بھی کسی فن کار کے وسائلِ فن ہو سکتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ اس نے دل کی گہرائیوں سے ان کے اُن تمام مضمرات کو محسوس کیا ہو جو ترجیح ہیں اور اس طرح وہ ان کے فنی برتاؤ پر قادر ہو، ورنہ محض فیشن کے طور پر یا مصلحتِ وقت کے پیشِ نظر، ایک سیاسی قسم کے محرک کے تحت اُن موضوعات، یا کسی بھی موضوعات، پر طبع آزمائی کرنا کسی فنی کامیابی اور کمال کا باعث نہیں ہو سکتا۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں آزاد سے غلطی ہوئی ہے، غالباً وہ اپنے اندازِ طبیعت کا پورا اندازہ نہیں کر سکے اور خواہ مخواہ انھوں نے ایک ایسے میدان میں گھوڑے دوڑائے جو ان کے لئے سازگار نہیں تھا۔ آزاد کو سمجھنا چاہئے کہ وہ اصلاً جذبہ و احساس کے شاعر ہیں اور اس لئے ان کا جوہر انہی موضوعات پر چمک سکتا ہے جو ان کے دل کو چھونے والے ہوں، ان کی اصل دولت خلوص ہے جس سے الگ ہو کر وہ ہزار کوششیں کریں کسی میدان میں کوئی کامیابی نہیں حاصل کر سکتے۔ چنانچہ ان کی شاعری کا وہ حصہ کمزور ہے جس میں انھوں نے وقت نیز روایت کے رسمی موضوعات پر دادِ سخن دینے کی کوشش کی ہے۔ فن کار کے تنقیدی شعور کو اتنا بالیدہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنی حدود کو سمجھ کر اور اپنی مخصوص صلاحیت کو پہچان کر اپنی تمام تر توجہات اسی پر مرکوز کرے۔ کیا ضروری ہے کہ ایک قادر الکلام شاعر زمین و آسمان کے تمام ہی موضوعات پر طبع آزمائی کرے؟

شاعری کے معاملے میں آزاد کا جوہر بہت ہی خاص اختصاص ہے۔ وہ طبعاً اس سلسلے میں اتنے حساس واقع ہوئے ہیں کہ پیش پا افتادہ سیاسیات ہی کی طرح فرسودہ عشقیات بھی ان کی طبعِ شاعرانہ کو راس نہیں آتی [illegible] بخلاف سیاسیات کے عشقیات کو بالعموم شعرا کی جاگیر سمجھا جاتا ہے، لیکن بات وہی ہے کہ آزاد رسمی شاعری میں اظہارِ کمال کے اہل نہیں ہیں، وہ بالکل وارداتِ قلبی اور تجرباتِ ذاتی کے فن کار ہیں، یعنی وہ اصلاً شعور سے زیادہ وجدان کے شاعر ہیں، اور ان کے کلام کے تمام پہلوؤں کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اب تک ان کے وجدان کو المیۂ تقسیم کے سوا کسی دوسرے موضوع نے فنی اعتبار سے خاطر خواہ طور پر متاثر نہیں کیا ہے۔ اگر کوئی دوسرا موضوع کسی حد تک ان پر اثر ڈال سکا ہے تو وہ سماج سے ذرا پرے ہٹ کر فطرت اور اس کے بعض مظاہر و مناظر ہیں۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ سماج کے چوٹ کھائے ہوئے ذہن کو فطرت کے آغوش میں جذباتی و حسیّاتی طور پر کچھ سکون ملتا ہے۔

"ستاروں سے ذروں تک" میں "وُلر کے کنارے ایک صبح" بیٹھے ہوئے شاعر کو یہ اندیشہ ہوتا ہے:

تھپک تھپک کے سلایا ہے جن کو وقت نے
اُن آرزوؤں کو میری روح میں نہ جگاؤ
یہ برگ و گل پہ نہ چھیڑو ترانہ ہائے جمیل
یہ شاخسارِ شجر میں اُلجھ اُلجھ کے نہ گاؤ
نہ جانے دل میں ہیں خوابیدہ کتنے ہنگامے
یہ خواب کچھ بھی سہی ان کو خواب سے نہ جگاؤ

جب کہ اس سے پہلے وہ "بیکراں" میں کنارِ وادی ایک نہایت حسین منظر کی نقاشی کر کے کہہ چکے تھے:

پل بھر میں دل کی لیکن حالت ہوئی دگرگوں
اس منظرِ حسیں سے دل دور جا رہا تھا
اک انقلاب آیا ہر شے کی دلکشی میں
جو دل نشیں تھا منظر اب دل کو کھا رہا تھا
اب منظرِ حسیں پر جمتی نہ تھیں نگاہیں
کوئی دلِ حزیں کو پھر یاد آ رہا تھا

کنارِ وادی سے ڈل کے کنارے تک آزاد کے

ذہن نے جو سفر کیا ہے وہ ہمیں معلوم ہے۔ اس کے باوجود "کشمیر سردیوں میں" اور "وادیٔ گریز" کے ارتعاشات اور ارتسامات سے محسوس ہوتا ہے کہ فطرت کے آغوش میں تھوڑی دیر کے لئے ہمارے تھکے ہوئے فن کار کو سکون ملتا ہے اور اس کے بعض جذبات احساسات کو تسکین ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں فن کے کچھ پھول ہمیں میسر آجاتے ہیں۔

کل مری روح کو جس نے تپش آمادہ کیا
آج اس سوز سے خالی ہے ڈلر کی آغوش
وقت کی ایک ہی رَو جس میں سحر ہو نہ ہے شام
بزم کا ایک ہی رُخ جس میں فردا ہو نہ دوش
کس طرح تجھ سے ملاقات ہو کچھ تو ہی بتا
زندگی بولی تو کچھ آج کہاں ہے ذی ہوش
(کشمیر سردیوں میں)

جگن ناتھ آزاد شاعری کے اُفق پر المیۂ تقسیم کی سُرخیاں اور سیاہیاں لے کر اُبھرے اور دنیائے اُردو کو انھوں نے ایک عرصے تک اپنے پُردرد نغمات کا اسیر بنا کر رکھا۔ اس کے بعد انھوں نے سیاست، محبت اور فطرت کی راہوں میں بھی حسن و نغمہ کی تلاش کی، مگر صرف فطرت کے دامن میں انھیں قدرے سکون سا ملا۔ آزاد ابھی تک ان راہوں میں آوارہ گردی کر رہے ہیں، وہ ایک پناہ گزیں ہیں، انھیں ماضی کی جستجو ہے، ان کی شاعری ابھی راہ میں ہے، اس کی منزل کیا ہوگی؟ شاید شاعر کو بھی معلوم نہیں۔ کیا اُن کے فن کی آگ ختم ہو چکی اور صرف خاکستر کی دبی دبی چنگاریاں باقی ہیں؟ کیا یہ چنگاریاں پھر شعلہ نہیں بن سکتیں؟ آزاد وطن کا غم اٹھا چکے، محبوب کا غم سہہ چکے، باپ کا غم بھی اب ان کی شخصیت کا ایک جز بن چکا۔ انسانیت کا غم پہلے ہی ان کے رگ و پے میں ساری ہے اور ان کے دل دوز اشعار، ان کے بہترین اشعار لکھوا چکا ہے، کیا آزاد اس آخری غم کو جو ایک درد مستقل ہے کچھ اور وسیع، منظم اور فعّال بنائیں گے اور منزلِ عظمت کے قریب پہنچ سکیں گے؟

تو ابھی رہ گذر میں ہے، قید مقام سے گذر!

یہ ندا آزاد کے مرشد اقبال کی ہے۔

غزل

فرحت

وادیٔ دل سے خوشیاں گزریں آئی ندی جیسی جوبن میں
بستی غم پر ایسے چھایا جیسے بادل ساون میں
ہم آئے تھے ساتھ میں لے کر نغمۂ نازش نکہت و زر
اب تجھ بن ہم یادوں کے ناگ چھپائے دامن میں
تم ہم سے کیا چھوٹے ساتھی ہم اپنے سے چھوٹ گئے
اپنا عکس لگے ہے اب تو انجانا سا درپن میں
یاد کریں کیوں دل کی نگری کیسے اُجڑی کیونکر چھوٹی
سب کھویا کیا پایا ہم نے کون پڑے اس الجھن میں
جیون کی بازی ہارے لیکن جینا سیکھ گئے
اک عالم آباد پڑا ہے اس سینہ کی سلگن میں

غزل

(سیّد بشارت علی)

یہی ملال ہے کیوں جسم میں مقید ہوں
میں ٹوٹ کے چار دشاؤں میں بٹ گیا ہوتا
وہ سست رَو ہوں کہ میں موت سے بھی دور رہا
جو تیز چلتا یہ رستہ بھی کٹ گیا ہوتا
میں جذب ہو گیا ہوتا وجود میں اس کے
جو دونوں جسموں کا پردہ بھی ہٹ گیا ہوتا
وہ خوف طاری تھا دل پہ کہ سر جھکا ڈالا
جو سر اٹھاتا مرا سر بھی کٹ گیا ہوتا
گھرا ہوا تھا میں نرغے میں تیغ اٹھائی تھی
دگرنہ رن سے میں کب کا پلٹ گیا ہوتا

غزل

شاداں — گوالیاری

تڑپ دل کی بھی وحشیٔ اضطرابِ جاں بھی ناکافی
کہاں تک کہ ہوئی ہر گردشِ دوراں بھی ناکافی
ترے غم کو بساطِ عالمِ امکاں بھی ناکافی
ادھر حشر ادھوری کا ہے اور ادھر انساں بھی ناکافی
انھیں انسانیت کے نام کا کیا واسطہ دیجیے
جنھیں پینے کو خونِ حسرتِ انساں بھی ناکافی
انھیں کیا تجربہ فراق و ہجر کے صدمے محبت میں
یہاں لمحہ بھی اک مدت، وہاں صدیاں بھی ناکافی
کسی کا دامنِ امید بے مانگے بھی بھر جائے
کسی کا شکوۂ صد چاکیٔ داماں بھی ناکافی
جہاں دکھلائے جاتے تھے نمونے آدمیت کے
وہاں پائی گئی آہِ دلِ سوزاں بھی ناکافی
حقیقت، نوعیت، حالت پہ ہی انحصار اس کا
ذرا احساں بھی سب کچھ ہے بہت احساں بھی ناکافی
ہماری جو اُمنگیں ہیں ماورائے ساحل و طوفاں
ہمیں ساحل بھی ناکافی ہمیں طوفاں بھی ناکافی
بڑی قیمت تھی اشکوں کی مگر اس دور میں شاداں
صدف کی بندشوں کو بخششِ نیساں بھی ناکافی

غزل
سلیم شہزاد

سُنی ہو میں نے خموشی میں پھر وہی دستک
غموں کے دیپ بجھے جیسے کہیں خوشی دستک

بدن جو آس مرے من کی آنچ، دے سینے لگی
کھنڈر کے ٹوٹے کواڑوں پہ اِک پری دستک

شعاعیں بند دریچے سے گھر میں در آئیں
سیاہیوں میں کہاں روشنی نے دی دستک

شریر جھونکا ہے برسات کی ہواؤں کا
نہ آئی آج تلک سن کے وہ کبھی دستک

سنا ہو کوئی، مجھے ڈھونڈنے ہی آیا تھا
تھی معنی خیز مرے در پہ رات کی دستک

بسی ہے اُس کے بدن کی ہواؤں میں خوشبو
گیا ہے دے کے ابھی کوئی اپنی دستک

کھُلا نہ آج تلک آگہی کا دروازہ
نڈھال ہو گیا دے دے کے کوئی دستک

صدا کے گھر میں اپنی سلیمؔ سن نہ سکا
میں اپنے شعر کے لفظوں پہ اپنی دستک

غزل
شمیم عباسی

میں جس میں خود کو چھپاؤں وہ جسم و جاں نہ ملا
ملے ہیں یوں تو سبھی کوئی رازداں نہ ملا

وہ ایک لفظ کہ مفہوم جس کا کچھ بھی نہیں
وہ ایک بات کہ جس کا کہیں نشاں نہ ملا

نہ کوئی سیپ نہ سایہ نہ کوئی کنکر ہے
میرا وجود وہ دریا کہ مہرباں نہ ملا

غزل میں کس کو سناؤں، یہ نظم کون سنے
یہ مقدر وہ کہ جہاں کوئی قدرداں نہ ملا

کھڑا ہے سر پہ جو سورج سجائے صحرا میں
وہ ایک شخص کہ مجھ کو کہاں کہاں نہ ملا

یہ سچ ہے آگ لگی ہے تمام شہروں میں
یہ لعبات کہ اُٹھتا ہوا دھواں نہ ملا

سجے ہیں لب تو کسی کے بدن ہوئے زخمی
لٹا دے جو کوئی ایسا کارواں نہ ملا

سب اپنی ذات کے صحرا میں عاشقی گم ہیں
کوئی بھی ٹوٹتے لمحوں کے درمیاں نہ ملا

غزل
ق۔ک۔ نظر

حیات و موت کا سمجھا کے سلسلہ مجھ کو
میں کیا ہوں، کچھ بھی نہیں ہوں بتا گیا مجھ کو

میں اپنی ذات کے جنگل میں راہ بھول گیا
وہ ڈھونڈتا رہا کل رات جابجا مجھ کو

خود اپنی آگ میں جلتا پگھلتا رہتا ہوں
مٹا دے کہیں بڑھتی ہوئی انا مجھ کو

بڑے خلوص محبت سے قبر تک لائے
مگر یہاں پہ ملی ریت کی ردا مجھ کو

ابھی میں زندہ ہوں لوگو، ابھی میں زندہ ہوں
یہ بات کہنے پہ مجبور کر دیا مجھ کو

دیارِ بے اماں

شیخ عبدالسمیع بیدلؔ

شہر یارو!

جانے کیوں یہ سوچتا ہوں

آج مانندِ دیارِ بے اماں ہوں

جسم میرا اب یاسیت کی ہے اک آماجگاہ

نیم وحشی، بے تمدن، وقت کی تہذیب سے نا آشنا

کتنے قرنوں سے نہ جانے یوں ہی بس آباد ہوں

میری سوچوں کا تموج کوچہ و بازار کی رونق لئے

میری سانسوں میں بگولے ریگ زارِ انقلاب سے اٹھتے ہوئے

میرے ہر احساس میں اندیشۂ طوفانِ باد

میری آنکھیں دھوپ میں تپتی ہوئی سنسان کوئی رہگزر

منتظر جیسے کسی تنہا مسافر کے لئے

ہر قدم پر اک تصادم، حادثے، آتش زنی

خوف و دہشت کا اثر، خطرات منڈلاتے ہوئے

زیست کے لمحات سارے شعلہ پوش

اس دیارِ بے اماں میں

عقل و دانش کے پڑوسی کا رویہ جارحانہ ہی لگے

سربلندی کا تصور ہوش گم کردے جہاں

ذہن کی سیال روحیں

تیرتی پھرتی ہیں جب ظلمتِ ادراک میں

شہر سے باہر کوئی شفاف جھیل

سرد و ساکت ہی نظر آئے مگر

کوئی مانجھی درد کی پتوار ہاتھوں میں لئے

جب بھی نکلے گرم لہروں سے جھلس جانے کا ڈر

ذات کا ادراک ہے اور بند سارے بام و در۔

ایک آئینہ کہ جس میں عکس پڑتے ہیں ہزار

ذہن کی آواز سناٹوں کا محض بازگشت

مطمئن کوئی نہیں

اک سرابِ آگہی جو دور سے ساحل کا دکھلائے نشاں

میں کہ مانندِ دیارِ بے اماں

مانگتا ہوں ربِّ موجودات سے ہر دم پناہ

تاغار

مراد کرمانی

اَدھ سِلے کپڑے

اُس کے ہاتھ پاؤں مشین کی طرح چل رہے تھے۔ دکان پر گاہکوں کا ہجوم تھا۔ اس اکلوتی رات کے بعد تو عید کی صبح ہونے والی تھی۔ سب ہی چاہتے تھے کہ صبح سویرے زندگی کو کوئی نئی پوشاک پہنا کر عیدگاہ میں اپنی برتری ثابت کریں لیکن وہی تو ہاتھ، اور وہی تو پاؤں، وہ بھی تھکے ہوئے زندگی کی آسائشوں کے خواہاں، کانٹوں پر چل کر مسرت کے پھول توڑ لینے کے خواہش مند۔ رات ڈھلی چلی جا رہی تھی۔ آنکھیں بوجھل ہوتی جاتی تھیں مشین کی سوئی کپڑوں میں ڈوبتی ابھرتی ذہن میں بے شمار سوئیاں چبھوتی چلی جا رہی تھی وہ چاہتا تھا کہ گاہکوں سے چھٹکارا پا لے تو اپنی منّی اور منّے کے کپڑے بھی تیار کر دے اور اُس شریکِ حیات کے لیے بھی مختلف کپڑوں کے بچے ہوئے ٹکڑوں سے ایک ایسا بلاؤز تیار کرے جس سے اُس کے ارمانوں کی قوسِ قزح جھلک اٹھے وہ قوسِ قزح جس میں کئی رنگ ہوتے ہیں نیلے، پیلے، سُرمئی، چمپئی، دھانی مگر وہی تو ہاتھ اور وہی تو پاؤں مشین کا ایک ہی تو پہیّا بدن میں دوڑنے والا خون اُس پہیّا کے ساتھ کب تک چلے۔

رات اپنا دامن سمیٹ رہی تھی وقت اپنا پیراہن بدل دینا چاہتا تھا۔ کیواڑ کے دراڑوں سے وہ تھکی ہوئی آنکھیں اپنے مزدور ساتھی کو تکا رہی تھیں۔ بچے سو گئے تھے اس تمنا میں کہ کسی طرح رات کٹے، کہ صبح آئے تو نئے کپڑوں میں ہم بھی باپ کی انگلی تھامے رنگ برنگ غبارے اُڑاتے چہلیں کرتے عیدگاہ کی طرف چلیں۔ کتنے خواب تھے جو اُس دکان کے اردگرد بکھرے پڑے تھے۔ تھکے ہارے خواب، مسلے کچلے خواب، جیت اور ہارتا خواب، انگلیوں سے لڑنے والے خواب، ریشم کی طرح ملائم خواب، دھاگے کی طرح کچّے خواب، جوان اور ننّھے منّے خواب، غرض خوابوں کا ایک جال تھا جو کپڑوں کے ساتھ بنتا چلا جا رہا تھا۔

گھڑی نے تین بجائے، کیواڑ کی دراز جھپکتی ہوئی آنکھوں سے محروم ہو گئی۔ وہ معصوموں کے ساتھ ایک معصوم گود بھی سو گئی۔ دکان خالی تھی۔ فرصت ہاتھوں نے اپنے بچّوں اور شریکِ زندگی کے کپڑے اٹھائے تو ذہن میں کشمکش شروع ہوئی۔ دکھتے شانوں نے کہا اب سو جاؤ۔ آتی ہوئی عید نے کہا۔ کاغذ کے کچھ نوٹ، فراک اور بلاؤز نہیں بن سکتے۔ تو یہ پیسے کیا ہوں گے؟؟ اُس نے مشین پر سر رکھ دیا اُس کے خوابوں کی قوسِ قزح کسی کُہرے کی دبیز چادر میں لپٹی چلی جا رہی تھی چار بج گئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں جامع مسجد کے بلند میناروں سے اذان کی آوازیں گونج اٹھیں گی جامع مسجد کے عید کا بازار بھی اب تک بند ہو چکا ہوگا تو کیا بچوں کے جسم نئے کپڑوں کے لمس سے محروم رہ جائیں گے۔ وقت کا تھا رُکنے والا پہیّا اُس مشین کے پہیّے پر بیٹھا ہنس رہا تھا وقت کا پہیّا کہاں تھمتا ہے وہ تو دلوں کو کچلتا مسلتا ہڈیوں کو پیستا، ارمانوں کے اعصاب کو چٹخاتا، روندتا دندناتا چلتا رہتا ہے۔ تھکے ہوئے ہاتھوں نے بلاؤز کے کپڑے کو اٹھایا اس نے کچھ دیر سوچا اور آخر میں فیصلہ کیا کہ نہیں یہ دھنک بعد میں تیار ہو گی

پہلے منّی کی فراک اور اُس نے مشین میں فراک کو لگا یا
پہیا چل پڑا۔ ہاتھ پاؤں اپنی تھکن کو بھول کر پھر متحرک
ہو گئے...... لیکن...... لیکن تھوڑی دیر میں وہ پھر تھکن
کا شکار ہو گیا۔ پہیا رک گیا، پاؤں رک گئے اور
اُس نے مشین پہ سر رکھ کر چاہا کہ ذرا دم لے لے
تو آگے بڑھے کہ نجانے کیا ہوا کہ اس نے دیکھا کہ رنگین
غبارے اُڑ رہے ہیں اُس کے بچّے نئی فراکیں پہنے
اُچھل کود رہے ہیں۔ وہ بار بار اس البیلے بانکے بلاؤز
کی طرف دیکھ رہا ہے جو اُس کی شریکِ زندگی کے سانولے
جسم سے مل کر بے شمار قوس قزح کے رنگوں میں ڈوب گیا
اس نے جلدی سے نظر ہٹائی کیونکہ سامنے سے آتی ہوئی
کار میں بیٹھے ہوئے شاندار کپڑوں میں ملبوس کچھ بچے
اُس کے کپڑوں پہ ہنس رہے تھے۔ کسی نے اُس
کے شانے کو جھنجھوڑا اُس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ
اُس کی بیوی اور دونوں بچّے سامنے کھڑے ہیں۔

اذان ہو رہی ہے لاکھوں نمازیوں کا ہجوم
جامع مسجد پہ کھڑا ہے "میری بھی آنکھ اب کھلی۔ لائو
کپڑے لاؤ" اس کی بیوی نے کہا۔

اس نے بہت سے نوٹ جیب سے نکال کر بیوی
کو دیتے ہوئے کہا۔ "یہ لو۔"

"یہ نوٹ کیا کروں گی؟ بچوں کے کپڑے اور
میرا بلاؤز دو؟" وہ کانپ کر کھڑا ہو گیا۔

بچوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ پتھر کے مجسمے
کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ "اللہ اکبر" اُس کے
کانوں سے اذان کی آواز ٹکرائی اور وہ بے حس و حرکت
کھڑا رہا جیسے اُس کا جسم تو ماحول میں موجود ہو مگر اُس کی
روح اور اُس کا دل وقت کے شور میں کھو گیا ہو وہ کر بھی
کیا سکتا تھا۔ مسیح مصلوب ہو چکا تھا اور مریم سنگسار۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو۔ دلی)

بقیہ بزم شاخسار صہ ۱۳۷ سے

حالانکہ "مسیحا کی زبان" "سفر ہے شرط" "رہ تمنا سے
میں جو گزرا" جیسی نظمیں ان کے کلکتہ کے دوران قیام کی
یادگار ہیں اور زبان و بیان کی پختگی و شستگی کے
اعتبار سے لاجواب کہلا سکتی ہیں، لیکن ان کی فنکارانہ
صلاحیت صحیح معنوں میں "آدی" "اشتراک" اور
"بیوہ" جیسی نظموں میں اپنے عروج کو پہنچتی ہے جن کی
تخلیق کٹک میں ہوئی ہے۔ کہنے کی غرض یہ ہے کہ ترقی
پسندی کے تعطل کے بعد ہندوستان گیر پیمانے پر جب
نئے رجحان کی لہریں ابھرنے لگیں، تب ان سے مظہر امام
نے بھی اثرات قبول کئے اور شعرائے اڑیسہ نے بھی۔
مظہر امام کے اڑیسہ آنے سے قبل خود میں نے "زرد رو انسانیت"
اور "لا انتہا ابھی" جیسی جدید نظمیں کہی تھیں۔ اس لئے
میں کہوں گا کہ اڑیسہ میں شعر و ادب کی نئی روشنی مظہر امام
سے قبل ہی پہنچ چکی تھی۔ البتہ اپنے فکر اور اسلوب کی نئی چاشنی
کے ذریعہ مظہر امام نے کٹک کے ادبی ماحول میں نئی جان
ضرور ڈال دی۔ جہاں تک جدید شعری رویہ کی مقبولیت
کا سوال ہے، یہ تو وقت کا تقاضہ تھی اور اگر مظہر امام اڑیسہ
تشریف نہیں لاتے، تب بھی عین ممکن ہے کہ یہاں یہ
رجحان مقبول ہوتا۔ اس کے ثبوت میں یوسف جمال کی
مثال پیش کروں گا جنھوں نے راج گانگ پور جیسے اڑیسہ کے
دور افتادہ علاقے میں رہ کر بھی جدید شعری رویہ کا صحیح
عرفان حاصل کر لیا۔

کسی شاعر پر سرقے کا الزام لگا دینا اتنا آسان نہیں
جتنا کہ سید احمد شمیم سمجھتے ہیں۔ پیام فتح پوری کے شعر کو
مظہر امام کے شعر کا تصرف کیوں نہیں کہا جائے؟ "زندگی دیکھ کہ
کس حال میں آیا ہوں" میں جو بات ہے وہ "زندگی میری
طرف دیکھ کہ میں آیا ہوں" میں کہاں ہے؟ لہٰذا میری حقیر رائے
میں اس طرح کے تصرف کو "بھونڈی نقل" نہیں بلکہ شعر
میں IMPROVEMENT کہا جائے گا۔

غزل

قیوم [illegible] گیاوی

دیکھیے تصورات کے رنگین محل تمام
لکھی کسی کی یاد میں اپنی غزل تمام

کیا کیا نہ ہم نے زیست کے خاکے بنائے تھے
کیا جانتے تھے ہوں گے یہ نذر اجل تمام

رنگیں تھے سارے قصر بنے تھے جو خواب میں
آنکھیں کھلیں تو گر پڑے رنگیں محل تمام

دنیا کے اضطراب کا ہے ایک ہی علاج
انساں ہوں دل سے حامیٔ حسن عمل تمام

ہم سے نہ پوچھو کیسی گزرتی ہے زندگی
مشکل سے ہم تو کرتے ہیں ایک ایک پل تمام

[illegible] مستقیم ۔ طوالت کو جو نہ راہ
کافی ہیں اتنے شعر کرو اب غزل تمام

غزل

سعید رحمانی

پیاس کے پانی سے بھر جائے اگر خواہش کی جھیل
سطح پر ابھرے گا کیسے آس کا عکس جمیل

دوریٔ منزل کا سبب مل ہی جائیگا پتہ
میں کھڑا ہوں راہ میں صدیوں سے بن کے سنگ میل

آج ہر انساں کے شانوں پر ہے پھولوں کی صلیب
آؤ اپنے بوجھ کا ہم خود ہی بن جائیں کفیل

غم کے صحرا میں عزائم کے ہرن کو چھوڑ کر
آرزو کے کارواں کو دیجیے اذن رحیل

یوں رباب آرزو محروم نغمہ ہو سعید
ہر نفس [illegible] ٹوٹے ساز کی [illegible] دلیل

غزل

ادیب حسن ادیب گیاوی

بستی بستی کوچہ کوچہ تاریکی کا عالم ہے
داغ جگر سے کر لو اجالا دیپک کی لو مدھم ہے

شمع وفا چپ چاپ کھڑی ہے کیا جانے کیسا غم ہے
سوگ میں ڈوبا ہر نقشہ جانے کس کا ماتم ہے

میرے حال پہ ہنسنے والو اپنی جانب بھی دیکھو
تم بھی تو انسان ہو پیارے تم میں بھی کچھ کم ہے
کون بنائے کون سنوارے کون مٹائے اے لوگو

بدلے بدلے وقت کے تیور زلف گیتی برہم ہے
ڈرتے ہو تو ردیف و قوافی کو مت چھیڑو
ہستی کی [illegible] بیٹھے ہیں کیا کم ہے

گاہے بلندی گاہے پستی ایک معمہ [illegible]
دنیا کے [illegible] آنکھ بھی پرنم ہے

گونج

ساجد اثر

گلی سنسان ہے
تاریکیاں بھی رقص کرتی ہیں
میں اپنے گھر کا رستہ
اس گلی کو پار کرکے پاؤں گا
لیکن
مجھے اک خوف سا محسوس ہوتا ہے
گلی کو پار کرتے وقت
کوئی (میرا دشمن) آئے گا
اور بھونک دے گا
ایک خنجر میرے سینے میں

گلی سنسان ہے
تاریکیاں بھی رقص کرتی ہیں
مرا جانا ضروری ہے بہت
لیکن
ابھی میں گھر نہ جاؤں گا!!

سازش

ساجد اثر

گاؤں سے دور، ایک ٹیلے پر
رات کا اختتام ہوتے ہی
ایک عورت کی چیخ لہرائی
توڑ کر ظلمتوں کے گنبد کو
اک جھماکا سا نور کا گونجا
خامشی کے عمیق ساگر میں
شورشوں کا حباب تھرّایا
کھڑکیوں کے دراز کھل گئے
نیند کی جھیل خشک ہونے لگی

اور معصوم دل کے بربط میں
اک تجسس کی راگنی لے کر
لوگ ٹیلے کی سمت دوڑ پڑے

چند لمحوں کے بعد ہی سارا
گاؤں تھا آگ کی لپیٹوں میں

مجید کوثر

غزل

ملنا ہو اگر مجھ سے تو منبر سے اتر یئے
چہرے پہ برستی ہوئی وحشت نہ ڈھریئے

چھوٹی سی کسی بات کا ماتم نہیں اچھا
ہنستے ہوئے اس شوخ کے کوچے سے گزریئے

سادہ ہے یہ تصویر تو پرکار بہت ہے۔
کھو جائیگی سچائی کوئی رنگ نہ بھریئے۔

کس حال کو پہنچے ہیں کہ اب اُنکے نگر میں۔
آتے نہیں بھولے سے بھی یادوں کے ہریئے

اک قطرۂ خوں بھی نہ رہا اپنے بدن میں
ہنستے ہوئے پھر کس کیلئے جاں سے گزریئے

ڈر کر بھی کسی شخص نے ہم کو نہیں دیکھا
ہم سب سے یہ کہتے رہے کہ اک لحظہ ٹھریئے

★ ★

ظہور منصوری نگاہ

غزل

دن بھر مجھے کچلتا ہے پرچھائیوں کا درد
اور شب کو سر اٹھاتا ہے تنہائیوں کا درد

عالم دل و جگر کا عیاں ہے جبین سے
ابھرا ہے آج ہونٹوں پہ گہرائیوں کا درد

اے چاند تجھ تک آ کے یہ معلوم تو ہوا
کس درجہ دلخراش ہے اونچائیوں کا درد

جب بھی کھنک کے باغ میں چٹکی کوئی کلی
یاد آگیا مجھے تری انگڑائیوں کا درد

بن کر لہو اتر گیا اپنے وجود میں
اس دورِ نور و نار میں پرچھائیوں کا درد

یادوں کی خشک جھیل بھی لبریز ہو گئی
جب بھی برس گیا تری تنہائیوں کا درد

دیکھو سمجھ کے پالنا اس روگ کو نگاہ
دنیا میں لاعلاج ہے سچائیوں کا درد

★ ★

خاں ارمان

غزل

چھلکی شرابِ ساغرِ لب، مست ہو گئے
پیاسے تھے ہونٹ، جام میں پیوست ہو گئے

اک بات آپڑی تھی جو سب کچھ لٹا دیا
ایسا نہیں کہ یونہی تہی دست ہو گئے

کچھ کائناتِ عشق بھی بے رنگ ہو گئی۔
کچھ حوصلے حیات کے بھی پست ہو گئے۔

پل بھر میں ہم نے یاد کیا اور بھلا دیا!
ہم کو تیرے خیال کی اک جست ہو گئے۔

یہ شخص بدحواس ہے، سنتے ہیں اسکے ساتھ
دو چار حادثات زبردست ہو گئے۔

★ ★

محمد بدیع الزماں

خطوطِ مولانا محمد علی

غالب کے خطوط کی ظرافت و مولانا ابوالکلام آزاد کی خطوط کی لطافت نے ہمیں اس درجہ مسحور کر دیا ہے کہ اردو ادب کے آسمان کے بہت سے درخشندہ ستارے ان بادلوں میں چھپ گئے ہیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت رئیس الاحرار مولانا محمد علی کی ہے۔ جن کے خطوط میں ہمیں بہ یک وقت غالب کی ظرافت اور آزاد کی لطافت شیر و شکر نظر آتی ہے یہ خطوط بھی اردو ادب کے وہ لازوال جنس گرانمایہ ہیں جو تا ابد قائم رہیں گے۔

مولانا محمد علی بہ یک وقت چوٹی کے سیاسی رہنما صفِ اوّل کے صحافی، پختہ مغز شاعر اور سچے مبلغ تھے ان کی شخصیت پر سب کا بہ یک وقت گہرا چھاپ ملتا ہے۔ اور ان کے خطوط میں ہمیں سب کی جھلکیاں بھی بہ یک وقت نظر آتی ہیں۔ غالب اور آزاد، فارسی، اردو اور عربی کے پروردہ تھے۔ ان کے خطوط کا صفِ اوّل میں جگہ پا جانا تعجب کی بات نہیں۔ مگر یہ الہ آباد یونیورسٹی اور آکسفورڈ یونیورسٹی کا گریجویٹ بھی اس پر قادر تھا۔ کہ اردو کے شعراء اور نثر نگاروں میں بھی اپنی ایک ممتاز جگہ بنا لے۔ یہ مولانا محمد علی نے کسب سے حاصل کیا۔ ان کے خطوط میں ظرافت کے ساتھ، چست بندشیں، موزوں فقرے، متناسب الفاظ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ذیل میں ان کے خطوط سے چند ٹکڑے دیئے جا رہے ہیں۔ جن سے ہمیں قائل ہونا پڑے گا کہ جہاں تک خطوط کے ادبی حیثیت کا سوال ہے۔ ہمیں ان کو بھی غالب اور آزاد کی صف میں رکھنا ہو گا۔

مولانا آزاد کے سارے کے سارے خطوط فرضی ہیں جو جیل میں رقم کئے گئے۔ مگر مولانا محمد علی کے خطوط زیادہ تر جیل سے اپنے رفقا کو بھیجے گئے۔ اس لئے دونوں کے خطوط میں اسیری سے پیدا شدہ تاثرات ایک جیسے دوڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔ مولانا محمد علی کے بہت سارے خطوط جیل سے باہر بھی لکھے گئے ہیں۔ مگر اسیری کی چھاپ وہاں بھی لگی نظر آتی ہے۔

اوائل بیسویں صدی میں نواب محسن الملک مرحوم ایم۔ اے۔ او کالج (جہاں سے مولانا نے بی۔ اے۔ کی ڈگری لی۔ اور جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنا) کے روحِ رواں ہی نہیں بلکہ مسلم سیاست کے سربرآوردہ رہنما تھے۔ انھیں ایک ۲۸ سالہ نوجوان کی علی گڑھ کے معاملہ میں تیکھی طنز خط مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۶ء میں ملاحظہ ہو۔ جس میں مولانا آزاد کی لطافت نظر آئے گی:

”نواب صاحب قبلہ! آپ آج اس رگ کو چھیڑتے ہیں جو بہت عرصے سے نشتر کی لذت سے آشنا ہو رہی ہے۔ انسان کے دل کا حال سوائے اس کے یا اس کے خدا کے دوسروں پر ظاہر نہیں ہوتا۔ اگر ہو سکتا تو آپ یہ سوال نہیں کرتے کہ کیا تم مجھے اپنا بزرگ یا دوست سمجھتے ہو۔

اب آپ منزلِ عمر کے اس حصّہ پر آگئے ہیں کہ ذرا گردن اٹھا کر عالمِ جزا کی سیر بھی کر سکتے ہیں اور آپ کی نظر میں یہاں کے انعام اور صلے، بیج اور چھوٹے بڑے ستارے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے گو خدا اس زمانے کو ابھی دور رکھے۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ وہ زمانہ کچھ ایسا دور نہیں ہے جب کہ آپ ایسی جگہ چلے جائیں گے جہاں نہ نائٹ ہڈ کی فکر ہے نہ تمغوں کی تمنا، جہاں نہ آرزو ہے۔ نہ خواہش۔ ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام اور رضوان اللہ ہی سب سے بڑا آرڈر ہے۔ اور سب سے عزیز تمغہ .... قوم کی خاطر .... آپ .... زہرِ ہلاہل کے گھونٹ شربت کے سے مزے لے لے کر پی رہے تھے۔ .... یہ کعبے کی راہ نہیں ہے۔ یہ ترکستان کا راستہ ہے۔"

جیل خانہ بیتول سے سید سلیمان ندوی کے نام خط مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۱۹ء کے کچھ حصے۔

"عمر تو کچھ ایسی زیادہ نہیں ہے۔ مگر اس عمر میں بھی اتنے گناہ کئے ہیں کہ اگر کافر ہوتا تو ضرور شبہہ ہوتا کہ روزِ جزا ان سب کو کس کو حساب یاد رہے گا۔ اور غالباً چند کبیرہ ہی پر کافی سزا بہ عبورِ دریائے جہنم" دے کر تمام صغیرہ کو یوں ہی چھوڑ دینا پڑے ..... برادرم اب تک دنیا میں باوجود حکم ایّاکَ نعبدُ و ایّاکَ نستعین کے ہزاروں سے لو لگائی اور کچھ نہ پایا۔ مگر اب تجربے کافی ہوگئے ہیں۔" بھوکے بامن گائے کہانی۔ اب کہا ایش تو رام دہائی۔" یہی وجہ ہے کہ اطمینانِ قلب تسکینِ خاطر نصیب ہے۔ اور وہ فرصت میسر ہے۔ جس کی غالب کو آرزو تھی ..... بفضلہ تعالیٰ ایمان بظاہر سلامت ہے۔ قید نے دستِ عمل کو کوتاہ کر دیا اور اس طرح سے عمل کی تلافی کر لی .... سب سے

پہلا کام تو یہ کر رہا ہوں کہ حفظ قرآن پاک شروع کیا ہے۔ حافظ کے خطاب کا بھوکا ہوں کیوں کہ خود خداوندِ عالم نے اپنے لئے بھی یہ اسمِ گرامی تجویز فرمایا ہے۔ اس وحدہٗ لاشریک کے ساتھ کہاں جا کر شرکت کی ٹھانی ہے۔"

بیتول جیل میں ساڑھے چار سال سے مقید رہنے پر بھی تشکر اور تسلیم و رضا کے متعلق جناب مسعود علی ندوی کے نام خط مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۱۹ء کے چند جملے ملاحظہ ہوں جو ادبی شہ پارے ہیں۔

"..... اس ساڑھے چار برس کی قید میں فرنگ میں تو ہم توام ہو گئے ہیں اور سیام کے جڑواں بھائیوں کی طرح نہ صرف ایک جان بلکہ ایک قالب بھی...... رہا خوشی اور اطمینان کا معاملہ تو بھی سبحان اللہ.. .... بحمد اللہ کہ ابھی تک اسی خدا کی زمین پیروں کے نیچے ہے۔ اور اسی کا آسمان سر پر آویزاں ہے یہی نہیں بلکہ ؎

"رات دن گردش میں ہیں سات آسمان
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا"

.... جب تم بدرجۂ اتم ان حالات سے واقف ہو اور زلیخا سے زیادہ اس یوسفِ کنعانی کو محبوب سمجھتے ہو جس نے اس رسمِ قید کی بنا ڈالی اور اس کے لئے اللہ سے یہ تجویز فرما کر ساتھ: ربِّ السجنُ احبُّ الیَّ مما یدعوننی الیہ، تو پھر کس طرح کہہ سکتے ہو کہ ہم لوگ اس کو انتہائے مصیبت خیال کرتے ہیں۔ عزیزم مالکِ منعمِ حقیقی کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ..... اس نے اپنے دوستدار اور ناکارہ بندوں کو مخصوص کیا

۶۔ میرا ایک شعر ہے۔

سرکش نہیں، باغی نہیں، غدار نہیں ہم
پھر ہم پہ تقاضائے وفا اور ہی کچھ ہے

اسی خیال کو یکے از "یارانِ مجلس" حسرت نے کیا خوب ادا کیا ہے۔ لکھتا ہے۔ ؎

بے وفائی مجھ کو کیا معلوم کہتے ہیں کسے
وہ مرے سرکار ہیں، میں انکے وفاداروں میں ہوں

... پھر بھی تم اسے انتہائے معصیت سمجھتے ہو۔ ارے بھائی سو دمعافی مانگو، ہاتھ جوڑو، پاؤں پڑو، ناک رگڑو اور دیکھو، آئندہ ویسی انتہائی حماقت نہ کرنا ورنہ پٹ جاؤگے۔ میرے ہاتھ سے اور سرکار علیحدہ ناراض ہو جائے گی۔ سچ کہا تھا میں نے۔

یہ نظربندی تو نکلی ردِ سحر
دیدہ ہائے ہوش اب جاکر کھلے

اب کہیں ٹوٹا ہے باطل کا طلسم
حق کے عقدے اب کہیں ہم پر کھلے

اب ہوا ہے ماسوا کا پردہ فاش
معرفت کے اب کہیں دفتر کھلے

فیض سے تیرے ہے اے قیدِ فرنگ
بال و پر نکلے قفس کے در کھلے

ورنہ یہ ہے کہ:

طاقتِ پرواز ہی جب کھو چکے
پھر ہوا کیا گر ہوئے بھی پر کھلے

اور کاش یہی سچ ہو جائے۔

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر
مرکے جوہر آپ کے جوہر کھلے

اب اس خرافات کو ختم کرتا ہوں...... معاف کرنا بھائی۔ ہم قید ہی کے لئے موزوں ہیں۔ اگر چھوٹے اور یہ خرافاتی سلسلہ ساتھ لائے تو تم لوگوں کو تو ایک تماشہ ہاتھ آجائے گا۔

شہر کے لڑکوں کی بن آئی مرادو — بندۂ دیوانہ رہا ہو گیا۔

اب جنوں بہت بڑھ گیا ہے۔ اگر اسی طرح ایک آدھ صفحہ اور لکھا تو جان لو کہ جیب و گریبان کی خیر نہیں ؎

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ارے بھائی۔ یہیں تو آکے تفرقے سب باہر باقی ہیں یہاں تو یک سوئی ہے اور یکتائی۔ عیدین میں بھی ایک امام اور دوسرا مقتدی ہے۔ موذن بھی اور مکبر بھی۔ یہی حال ہر جمعہ اور ہر جماعت کا ہے۔ عیدین میں ایک نے دوسرے کو گلے لگایا گویا ساری خدائی نے ساری خدائی سے عید مل لی۔ اس قطعہ کا لطف یہاں حاصل ہوا ہے۔ ؎

مستان رسید عید بیاران ندا کنید
باشد ہزار شکر خدا را ثنا کنید
زاہد اگر قبول نشد روزہ و نماز
در کوئے مے فروش دوگانہ ادا کنید

محفوظ علی بدایونی کی اہلیہ کے انتقال پر تعزیت کے ایک خط مورخہ ۲۲ راپریل سنہ ۱۹۱۸ء میں روتوں کو ہنسانا ملاحظہ فرمائیے۔

"برادرم! کیا تمہارے عشق و محبت کے لطف میں تمہارا چھوٹا بھائی شریک نہ ہوتا تھا اور اس لطف و دل فریبی کو دوگنا نہ کرتا تھا۔ اگر تم نے بدمزگی، بے لطفی، خستگی اور کوفت میں شریک کیا ہوتا تو کیا یہ شرکت ان سب کو آدھا نہ کر دیتی۔ دوستی کی کیمیا بھی عجیب ہے، خوشی کو دوگنا اور رنج کو آدھا کر دیتی ہے۔ شرکتِ غم میں غیریت صرف غیر کے ساتھ ہوتی ہے۔ اپنوں سے یہ بیگانگی! حیف صد حیف۔ اگر تم سے یہ کہوں کہ بھائی! ہنوز بیاد آئینہ دیکھو،

تو اس کا یہی حال ہے کہ پانی سے، میدکی جائے کہ بلندی پر چڑھے۔ نشیب کی طرف عود نہ کرے، یا آگ سے التجا ہو کہ جلنے والی چیزوں کو نہ جلائے۔ بھائی روؤ اور خوب روؤ۔ آہیں کھینچو اور ضرور کھینچو۔ مگر ؎

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال
صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

اور آخر کے چند جملے ملاحظہ ہوں:

"ارے کمبخت آ اور جلد آ۔ ع
بیا بیا کہ مرا طاقتِ جدائی نیست
خدایا وہ دن کب آئے گا کہ ایک جوان بھائی کے موٹے موٹے چکنے چپڑے گٹھے ہوئے گال ایک بوڑھے بھائی کی چھچھی داڑھی سے وابستہ ہوں گے؟

خوشا وقتے و خرم روزگارے
کہ یارے برخورد از وصل یارے

ظالم بس اب ظلم نہ کر۔ آ کیوں نہیں آتا۔ آتشِ شوق شعلہ افگن ہے۔ آج سے ہر روز تیرا انتظار رہے گا۔"

اپنی شاعری کے متعلق لطیف چٹخارے ملاحظہ ہوں۔ جو مولانا عبدالماجد دریابادی کو ۱۶ راگست ۱۹۱۶ء کو لکھے گئے ہیں۔

"آپ میری شاعری کا کیا پوچھتے ہیں۔ بچپن میں تو بہت سے سامان ایسے بہم ہو گئے تھے کہ میں آج زلف و ابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا۔ رامپور میں اس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ داغؔ۔ امیرؔ، تسلیمؔ، جلالؔ، عروجِ دہلی اور لکھنؤ کے آسمان کے ٹوٹے ہوئے ستارے سب رامپور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے۔ خود میرے خاندان میں بھی شعر گوئی کا ذوق تھا۔ . . . جناب والا۔ اس کے بعد اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں تو بجا نہ ہوگا مگر میرا دعویٰ تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ سنئے تو میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں۔ بلکہ اس کی

تو نذر کر دیا ہوں۔ اسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں۔ غرض کوئی بے ادبی یا گستاخی باقی نہیں رہی ہے۔ جو میں نے شعر و سخن کی شان میں نہ کی ہو۔

"میری پیدائش ۱۸۷۰ء کے اواخر کی ہے۔ میں نے دس برس ہی کی عمر میں بہت سے لغو و فضول شعر۔ مگر بامعنی اور موزوں کہے تھے اور اچھا ہوا کہ اب وہ کسی کو یاد نہیں ورنہ جب میری OFFICIAL BIOGRAPHY (یعنی گورنمنٹ کی طرف سے نہیں بلکہ بقول آپ کے میری امت کی طرف سے) لکھنے کا وقت آتا تو میرے سیرت نگار کو سخت مشکل کا سامنا ہوتا کہ اس لچر پوچ کو ردی دان بلکہ آتش دان کے نذر کیا جائے یا سیرت میں توالی قوم و ملک میں جگہ دی جائے؟"

محفوظ علی بدایونی کو خط مورخہ ۲۹ مئی ۱۹۱۵ء غالبؔ کی طرز تحریر ملاحظہ ہو:۔

"تم سے ناراض ہی نہیں بلکہ سخت اور بہت سخت ناراض ہوں، اس لئے نام تک لینا نہیں چاہتا۔ شاید خدا کیہ کے خیال سے دعا دینے پر کچھ دوں، گو وہاں بھی غالبؔ کا مصرع

میرے سکنے سے غیر کو کیوں تیرا گھر ملے

جب سے بڑودہ سے گئے ہو ایک حرف تک نہیں لکھا۔ اب تک زندہ ہو۔ شکایت صرف اسی کی ہے کہ اب تک زندہ بھی ہو۔"

سید سلیمان ندوی کے نام خط چندوارہ نظر بندی کیمپ سے مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۱۷ء میں مسلمانوں پر لطیف طنز ملاحظہ ہو:

"اگر ایمان اور عمل صالح دونوں جدا کئے جا سکتے ہیں تو شاید ایمان والوں میں میرا شمار ہو سکے۔ اور اگر دونوں ایک ہی شے ہیں۔ اسلام کے دو ایسے اجزا ہیں جو ایک دوسرے سے علیحدہ بھی نہیں تصور کئے جا سکتے اور اصل اجزا نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ہی شے کی دو حیثیتیں؟ تو پھر افسوس کے ساتھ اقبال کرنا پڑے گا کہ میں ابھی تو اسلام سے بہت دور ہوں۔ خدا مسلمان کرے۔ آپ بھی دعا فرمائیے اور یہ کوشش فرماتے رہیے کہ مسلمانوں کو مرقع شاعری کے امداد سات کو دور

محمد علوی

خصوصی مطالعہ

جمیل کلیمی ـــــ ایک تعارف

غالباً ۱۹۶۵ء کی بات ہے کہ پہلی بار میں ایک کتاب خریدنے گیا تھا کتب خانہ کا نام تھا "کلیم بکڈپو"۔ نہایت مختصر سی اور بہت ادنیٰ سی دوکان تھی۔ جو صاحب خاصے آرام سے آدھے لیٹے آدھے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ جمیل کلیمی تھے۔ اونچا قد گورا چٹا رنگ اور نرم و نازک آواز۔ پہلی بار انہیں دیکھ کر میں بجد مرعوب ہوا۔ اس وقت بھی جمیل صاحب شہر کے اچھے نوجوان شاعروں میں شمار ہوتے تھے اور پھر یوں ہوا کہ روزانہ میں ان کی دوکان پر آنے جانے لگا۔ (یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔) احمد آباد میں انہیں کی اک دوکان ہے جس میں ادبی کتابیں بھی مل جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے احمد آباد میں ادبی ذوق رکھنے والوں پر جمیل صاحب کا واقعی احسان ہے کہ وہ آج تک انکے شوق کو پورا کرتے آرہے ہیں۔ شروع شروع میں جمیل صاحب روائتی قسم کی غزلیں کہتے تھے۔ پھر ترقی پسند شاعری کرنے لگے۔ اور اب کچھ عرصے سے جدید شاعری کر رہے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ انکی شاعری میں بھی تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ وہ جو بزرگوں میں ایک قسم کی ہٹ دھرمی پائی جاتی ہے وہ اب تک جمیل صاحب کے ہاں جگہ نہیں بنا پائی ہے۔ شاعری انہیں وراثت میں ملی ہے ان کے والد قبلہ کلیم صاحب شہر کے ایک دو استادوں میں سے ایک تھے۔ جن کا مجموعۂ کلام کلیم کے نام سے اردو میں چھپ چکا ہے۔ اس شہر میں آج بھی ان کے شاگرد پائے جاتے ہیں۔

آجکل جمیل صاحب جم کر شعر کہہ رہے ہیں۔ بہت جلد انکی کتاب بھی "حرف" کے نام سے شائع ہونے والی ہے۔ انکی شاعری سے متعلق فی الحال میں اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے پسند ہے اور آپ بھی پڑھ کر اپنی رائے دیکھئے کہ وہ زیادہ اہم ہے۔

غزل

جمیل کلیمی

پھول کی طرح قلم سے مرے الفاظ چلے
اس کی تعریف کے پل باندھنے کاغذ پہ ڈھلے
میں نے دیکھے ہیں شب وصل ترے ہاتھوں میں
کتنے دہکے ہوئے انگارے گلابوں کے تلے
سیکڑوں نقطوں کے پاؤں میں پڑے لفظوں کے
اک زمانہ زیر و زبر ہونے پہ کٹتے ہیں گلے
کوئی افسانہ گڑھا جاتا ہے بازار کے بیچ
کوئی جاتا ہے ترے شہر سے ہاتھوں کو ملے
خون پیتے ہیں وہی آکے مرا راتوں میں
میری غزلوں مرے شعروں میں جو دن رات پلے
آسماں سویا ہے خود چاند ستارے لے کر
نیچے دریا سے اُدھر دور بچھے، پہاڑوں کے تلے

غزل

آگ کے شعلوں میں سرتاپا گھرا ہوں میں بھی
سوچ کے گہرے سمندر میں پڑا ہوں میں بھی
کوئی تنکا ہوں تو تنکا ہی اڑا لے جائے
ایک مدت سے چٹانوں میں کھڑا ہوں میں بھی

پہنچو تو آ کے ساحل بھی لگتی ہی ہووے گا !!
ایک اک موننا سے کل رات لڑا ہوں میں بھی
بولا بیٹھا کوئی سایا کوئی پیکر مل جائے
اجنبی سڑکوں پہ یوں کب سے کھڑا ہوں میں بھی
صبح کی کرنیں اٹھا کر مجھے لے جائیں کہیں
رات کی گود میں چپ چاپ پڑا ہوں میں بھی
کوئی جا کر اے جمیلؔ آشنا یاران سے کہہ دے
سخت پتھر ہیں اگر وہ تو کڑا ہوں میں بھی

○

نہ ساحل کی خبر تھی نہ کچھ جزا بڑی کی
جہاں نوردی میں پھر بھی یہ عمر آخر کی
کبھی تو آ کے پڑھو مجھ کو کچھ کرو تحقیق
جو میں ہوں وہ نہیں فطرت مرے عناصر کی
جو بات میں نے پڑھی اس کے چہرے چہرے سے
وہ بات اس نے زباں سے کبھی نہ ظاہر کی
سمندروں کے سفر میں جو میں نے دیکھی ہیں
بتاؤں کیسے میں تصویریں ان مناظر کی
نہ دن میں چین نہ شب کو سکون کی صورت
یہ آدمی ہے کہ ہے لاش عصر حاضر کی
بنا ہے جس کے سبب دل میں ایک بت خانہ
جمیلؔ وہ ہو عنایت بس ایک کافر کی

○

ابھی [illegible] خیال کے لفظوں کے پر لگا
وہ [illegible] کبھی [illegible]
وہ [illegible] مل جا کے [illegible]
وہ رنگ و نکہت و [illegible] بہار [illegible] لگا
کرے [illegible] جب [illegible] سات آسمان گرد
جس شخص [illegible] وہ [illegible] سفر لگا

دل کی سڑک پہ کون تھا محو خرام سا
آواز جس کی چاپ کا شام و سحر لگا
ہر ڈال ڈال سانپ تھے ہر پات پات بھوت
جنگل کا راستہ بھی بڑا پر خطر لگا
جس سال میرے گھر میں وہ مہمان تھے جمیلؔ
وہ سال دیکھنے میں بڑا مختصر لگا

جمیل کلبی

○

غزل

میں کہیں گل ہوں، کہیں خوشبو کہیں تلوار ہوں
مجھ کو پڑھ لو میں ہرے موسم کا اک اخبار ہوں
آندھیاں ٹکرا کے مجھ سے ہو گئی ہیں سرنگوں
گو میں بوسیدہ مکان کی کھوکھلی دیوار ہوں
جس کو چھونے کی تمنا میں جلے ہیں کتنے ہونٹ
وہ دہکتا پھول ہوں وہ لب و رخسار ہوں
جس کے سائے میں پیمبر بھی سکوں کی سانس لیں
جس کے بل میں جواں ہوں سانپ میں وہ غار ہوں
بوریاں دکھلائے جس کو دریا کی ہوا
آسماں باتیں کرے جس میں وہ کہسار ہوں
میں بھی ہوں صدیوں کی خونی داستاں کا راز دار
آ دشمنو مجھ کو چھیڑو میں لب اظہار ہوں
میری غزلوں میں دھڑکتے ہیں ہزاروں دل جمیلؔ
میں گل نغمہ ہوں، بلبل کی اک منقار ہوں

○

غزل

جاڑے کے چاند کوئی نہیں کوہسار پر
سناٹے چیخ اٹھیں گے تیری پکار پر
کچھ لکھ گئی ہیں صبح کی کرنیں ابھی ابھی
بیدار ہو کے دیکھ تو دیوار یار پر
آواز مجھ کو دے نہ کنارے سے تو بلا
طوفان کی موج موج ابھی ہے ابھار پر
بے تو ہوا کو ان کہا سرگوشیوں میں وہ
جنگل میں شام سے شجر سایہ دار پر
جادو جگا رہا ہے وہ دن رات دھیان میں
دیکھا تھا چلتے چلتے جسے رہگزار پر
کیا جانے دل پہ بیتی ہے کس گھڑی جمیلؔ
بیٹھا ہے کوئی سوچ کے خنجر کی دھار پر

نقد و نظر

سرابوں کے سفیر

مرتبین:۔ عقیل شاداب، ظفر غوری، کرشن گوپال، ودیع

ناشر:۔ مولانا آزاد لائبریری۔ برج راج پورہ۔ کوٹہ

مبصر ـــــــــ فرخ ندیم

سرابوں کے سفیر، راجستھان کے گیارہ شاعروں کا مجموعۂ کلام ہے۔ کتاب کے شروع میں، آئینہ داران دشت، کے عنوان سے شمس الرحمٰن فاروقی کا دیباچہ بھی شامل ہے۔ سب سے کمزور اسمیں دیباچہ ہی ہے۔ جو عجیب سر و پا باتیں کہی گئی ہیں۔ چنانچہ شروع میں اختر شیرانی کا خواہ مخواہ ذکر چھیڑ دیا گیا ہے۔ اسی طرح فاروقی نے اپنے سرپرستوں کو خوش کرنے کے لئے ان کے قولِ زرّیں اوزان کی شاعری کی عظمت کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ چنانچہ اس میں خلیل الرحمٰن اعظمی کے "نکات" پیش کئے گئے ہیں اور شہریار کی شاعری کا اثر ممتاز راشد کی شاعری میں تلاش کیا گیا ہے جبکہ خود شہریار کی شاعری میرؔ نیازی کا چربہ ہے۔ دیباچہ نگار کو نظم و غزل میں امتیاز کرنے کا شعور بھی نہیں ہے۔ چنانچہ شاہد عزیز کی نظم کے ایک ٹکڑے کو شعر بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

اس دیباچہ میں فاروقی نے امجد نجمی سے متعلق نیاز فتحپوری کا جو قول بطور حوالہ پیش کیا ہے۔ وہ نیاز کا نہیں بلکہ خود فاروقی کا من گھڑت ہے۔ غرض کہ یہ دیباچہ فاروقی کی ہمہ دانی اور ان کے سرپرستوں کی عظمت کا پروپیگنڈہ زیادہ اور اس کتاب میں شامل شعراء کا تعارف کم ہے۔ دیباچہ کے بارے میں مزید کچھ کہنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہاں تبصرہ کلام پر کرنا مقصود ہے نہ کہ دیباچہ پر۔

کلام کی ترتیب اس کے معیار کو پیش نظر رکھ کر نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب ہوئی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلا نام ابن رضا کا ہے۔ ابن رضا کی صرف نظمیں ہی ہیں اور کافی کمزور ہیں۔ اگر ابن رضا کم عمر ہیں تو ممکن ہے کہ آگے چل کر ان کے ہاں کوئی موڑ آ سکے اور ارتقا ہو اور اگر عمر رسیدہ ہیں تو ان کی شاعری کے امکانات بہت محدود ہیں۔

دوسرا نام احتشام اختر کا ہے۔ یہ نام خاصا جانا پہچانا ہے۔ رسائل اور ریڈیو کے توسط سے احتشام اختر ادبی حلقوں میں پہلے ہی سے متعارف ہو چکے ہیں۔ انھوں نے ابھی سے اپنا لہجہ بنا لیا ہے۔ مگر ان کی آواز باوقار اور ممتاز نہیں ہے۔ پھر بھی منفرد ضرور ہے۔ احتشام اختر کی انفرادیت اپنے

ہم عصروں پر بھی اثر انداز ہوئی ہے۔ چنانچہ آفتاب شمسی سے لیکر رسول احمد تک نے ان کی مشہور غزل " ع

" میں اگر دشت نہ ہوتا تو سمندر ہوتا"

کا چربہ اتارا ہے۔ یہ غزل سرابوں کے سفیر، میں شامل ہے۔

احتشام اختر کی نظمیں غزلوں کے مقابلے میں کمزور ہیں۔ تاہم روشنی دفنانے سے پہلے" اور تعمیر نو" وغیرہ نظمیں قابل مطالعہ ہیں۔ ایک حیرت انگیز بات ان کے ہاں یہ ہے کہ غزلوں میں انکے ہاں غیر رومانی یا غیر عشقیہ ذہن ملتا ہے۔ جب کہ انکی نظمیں زیادہ تر عشقیہ ہیں۔ غزلوں کے زیادہ تر اشعار ان کے ہاں ایسے ملتے ہیں جو فوراً توجہ اپنی طرف منعطف کراتے ہیں۔ سہ

منزلیں دور ہیں کتنی یہ خبر ہی دیتا
میں کہ جادہ ہی سہی میل کا پتھر ہوتا
مجھ کو خود اپنے ہی لوگوں نے جلانا ہی چاہا
جل ہی جاتا میں اگر جسم کے اندر ہوتا
تم وقت کی بھیڑوں میں ایسا نہ کھو جاؤ
موسم کی طرح ہم تو ہر سال ہی آئیں گے
نئے زخم کی لذتوں کے لئے کرایہ کا گھر میں بدلتا رہا

اگلا نام خلیل تنویر کا ہے۔ خلیل تنویر کی نظموں میں ایک ہی خیال کی تکرار زیادہ ہے۔ ان کی نظمیں خواہش، تشنگی اور رشتہ کے تکون سے باہر نہیں نکلتیں۔ ان کے ساتھ ان تینوں لفظوں کے انسلاکات بھی بار بار دہرائے گئے ہیں۔ مثلاً لہو، حسرت، جان، وغیرہ، بعض نظموں کے عنوانات نہیں دیئے گئے ہیں صرف نظم" لکھا ہے۔ خلیل تنویر کی نظموں میں وزن کا بظاہر التزام کیا گیا ہے۔ لیکن درحقیقت نظمیں وزن سے خارج ہیں۔ ان نظموں کو نثری نظم میں بھی شمار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ بعض مصرعے بحر میں ہیں اور بعض خارج از بحر ہیں۔ ایک آدھ نظم ایسی ضرور ہے جو بے قافیہ ضرور ہے لیکن پابند نظم ہے۔ احساس جمال ایسی ہی نظم ہے جو رومانی نظم ہے اور کافی خوبصورت ہے۔ خلیل تنویر کی صرف دو غزلیں ہیں لیکن دونوں غزلیں قابل مطالعہ ہیں۔ دو چار شعر خوبصورت ہیں۔

بہت غرور نہ کر اپنی بے بسی بھی دیکھ
تو آگ ہے تو سمندر جلا کے دیکھ ذرا
یہ کیسی پیاس ہے میں جسم کے سراب میں ہوں
نکل کے جاؤں کدھر کیسے اضطراب میں ہوں

شاہد عزیز کی صرف نظمیں ہیں۔ ان پر ندا فاضلی کا اثر کافی ہے لیکن پھر بھی شاہد عزیز کے ہاں اپنا لہجہ بنانے کے امکانات روشن ہیں۔ زخم تمنا، ان کہی اور نئی زندگی کافی خوبصورت نظمیں ہیں۔

ظفر پرواز کی نظمیں اور غزلیں دونوں ہیں۔ لیکن نظمیں کافی روایتی اور پامال موضوعات کی حامل ہیں۔ انداز بیان بھی روایتی ہے۔ البتہ غزلوں میں انفرادیت جھلکتی ہے لیکن انہیں اپنا لہجہ بنانے میں وقت لگے گا۔ بعض اشعار انکے ہاں خوبصورت ہیں۔ سہ

فریم سے باہر نکلی مجھ سے لپٹ گئی تصویر تری
ڈر کے مارے چیخ رہا تھا رات ابھرا سناٹا
شیشہ کی طرح ٹوٹ نہ جائے کہیں بدن
بند قبا کو اور بھی آہستہ کھولئے

ظفر غوری کی بھی نظمیں اور غزلیں دونوں شامل ہیں۔ ظفر غوری کے ہاں ارتقا کے امکانات بہت روشن ہیں۔ اس کے لئے ریاضت کی ضرورت ہے فن کار فن کو جب تک عبادت نہ سمجھے۔ تب تک فن میں پختگی اور ابدیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ فن کو عبادت سمجھنے سے فنکار کے اندر فن میں مستغرق ہونے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی خلوص بھی پیدا ہوتا ہے۔ یہ خلوص اور محویت احساس فن کو نکھارتی ہے۔ اور اسے ابدی قدروں کا ترجمان کا اہل بناتی ہے۔ صوفیوں کی اصطلاح میں [illegible] "مراقبہ" کا نام ہے۔ ظفر غوری نے جہاں کہیں اپنے بدن اور [illegible] کو سمویا ہے وہاں ان کی آواز انفرادیت اور لہجہ نکھرا ہے۔

آپ جو میں رقص فرما تھا سمندر کا شباب
سخت مٹی کے کنارے خود بخود کٹ کر گرے

کس چاندنی کی آنکھ سے بکھری شفق کی ریت میں
موتی سا ڈھل کے گر پڑا شام کے دل کا درد سا

ظفر غوری کی غزلوں میں لفظیات کا استعمال روایتی حد تک محدود ہے۔ چنانچہ دستِ ناز، بادِ گل فشاں، چشمِ دل وغیرہ تراکیب اب پامال ہو چکی ہیں، البتہ نظموں میں لفظوں کا استعمال تخلیقی انداز سے ہوا ہے۔ بعض نظمیں اپنے (CONTENT) مواد اور (TREAT MENT) کے اعتبار سے تہہ دار اور منفرد ہیں۔ "قاتل لمحہ" زیرِ نظر مجموعہ میں ان کی نظموں میں بہترین نظم ہے۔ "تعاقب اور" "ابدیت" بھی نظمیں ہیں۔

عابد ادیب کی صرف غزلیں ہیں۔ انکی غزلوں کے بعض اشعار متاثر ضرور کرتے ہیں۔ لیکن ان کی غزلوں میں پختگی اور گہرائی و گیرائی نہیں ہے۔ نئے بن کے چکر میں ان کے ہاں زیادہ تر اشعار محض بیانیہ اشعار ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان میں شعریت اور تغزل پیدا نہیں ہو پایا ہے۔ ابھی عابد ادیب کو بہت طویل سفر طے کرنا ہے۔ ان کے ہاں دلیے ارتقا کے امکانات ضرور پائے جاتے ہیں۔ ان کے بعض شعر دل کو چھوتے ہیں۔ اور یہی شے ان کے فنی ارتقا کی ضمانت ہے۔

دھرتی ہلی تو لوگ گھروں سے نکل پڑے
جیسے انھیں گھروں سے کوئی واسطہ نہ تھا

عقیل شاداب کے کلام میں پختگی اور گہرائی و گیرائی ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں ایک دراک ذہن ملتا ہے۔ عقیل شاداب کے ہاں فلسفہ کو شاعری بنانے کی کوشش نظر آتی ہے۔ یہ اقدام اگرچہ مستحسن ہے بلکہ اس طرح ان کے ہاں حسن و عشق کا جذبہ ماند پڑ گیا ہے۔ انہوں نے حسن کی لطافت اور عشق کے گداز کو محسوس کرنے کے بجائے بودلیر کی طرح عشق کی شدت کو [illegible] محسوس کیا ہے۔ زبان و بیان کی غلطیاں عقیل شاداب کے ہاں بالکل نہیں پائی جاتیں۔ تاہم کہیں کہیں ایک آدھ لفظ کا تلفظ وزن کی پابندی کی وجہ سے غلط ہو گیا ہے۔

عقیل شاداب کی غزلیں، انکی نظموں کی بہ نسبت اس لئے منفرد اور ممتاز ہیں کہ ان میں انھوں نے چند قافیوں اور ردیفوں کو اپنے طور پر استعمال کیا ہے اور اس طرح اسے نئی معنویت عطا کی ہے۔ عقیل شاداب نے اپنا لہجہ بنا لیا ہے۔ ؎

گر چھلک اٹھا تو دھرتی کا جگر جل جائے گا
زہر کا پیالہ ہے پیاسا شنکروں کے بیچ میں

ہو سکے تو اپنے یگ کے کرشن کو آواز دو
دروپدی ننگی کھڑی ہے شوہروں کے بیچ میں

اس کے علاوہ انکے ہاں جدید حسیت بھی ملتی ہے اور جدید عہد کے درد و کرب کی ترجمانی بھی عقیل شاداب کی غزلوں سے ہوتی ہے۔ ؎

گردوں سے دروازے ناخوش، دالانوں سے صحن خفا
مل جل کر سب سوچو آخر ایسے گھر کا ہوگا کیا؟

نظموں میں خدا کی موت۔ بجھی اور ایک نظم، اچھی نظمیں ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنی نظموں میں (ECONRMY OF WORDS) کا خیال نہیں رکھا۔ فن کار کو یہ نکتہ ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے کہ شاعری خواہ نظم ہو یا غزل، کفایتِ الفاظ کی قائل ہوتی ہے۔ اسی لئے علامت، تشبیہ، اور استعارہ، حسن کلام کا زیور سمجھے جاتے ہیں۔

فضل المتین کا سفر بہت طویل ہے اور مجھے خدشہ ہے کہ راستے میں ہی یہ دم نہ توڑ دیں۔ تخلیقی ذہن انکی نظموں اور غزلوں دونوں میں نہیں ملتا۔ تقلید کو انھوں نے تخلیق بنانے کی کوشش کی۔ یہ شعر ایک شاعر نہیں متعدد شعرا کی گونج انکے ہاں سنائی دیتی ہے۔ جہاں جہاں کہیں انھوں نے تقلیدی انداز سے ہٹ کر اپنے طور پر کچھ کہنے کی کوشش کی ہے۔ وہاں کسی قدر انکی شخصیت ابھری ہے۔ ؎

ہم سنگ گراں ہیں خس و خاشاک ہیں کیا ہیں
معلوم ہو جیسے کوئی [illegible]

لیکن اس قسم کی کوشش ان کے ہاں بہت کم نظر آتی ہے۔
[illegible]

زبان و بیان کی غلطیاں اور عروضی لغزشیں بھی نہیں پائی جاتیں۔ رباعیات اور قطعات کی بہ نسبت ان کی نظمیں زیادہ جاندار اور متنوع ہیں۔ بعض طویل نظمیں ضرورت سے زیادہ طویل ہو گئی ہیں۔ انھوں نے بھی EODNOMY OF WORDS کا خیال نہیں رکھا ہے۔ مجرم تاخیر، اور شہر اب بھی اسی جگہ ہے۔ دونوں نظمیں اچھی ہیں۔ جدیدیت اور عصری آگہی محمود کے ہاں نظموں کے بجائے غزلوں میں پائی جاتی ہے۔ بعض شعر کافی تہہ دار ہیں:

کیا گزر گاہِ شب و روز پہ میرا وجود
بھاری قدموں سے مجھے وقت کچلتا کیوں ہے
ہو رہی ہے دم بہ دم پت جھڑ کی آندھی تیز تیز
ٹوٹتی شاخوں سے اڑتی جا رہی ہیں پتیاں

زیرِ نظر کتاب کا آخری نام ممتاز راشد کا ہے۔ جن کی صرف غزلیں اس میں شامل ہیں۔ اگرچہ بعض تراکیب اور الفاظ کا استعمال ان کے ہاں فیض اور ظفر اقبال کے اثر کی وجہ سے ہوا ہے۔ تاہم مضامین تازہ کی تلاش اور اسے اپنے طور پر بیان کرنے کا رجحان ان کے ہاں ضرور پایا جاتا ہے۔ بہت کم عرصے میں انھوں نے اپنا لہجہ بنا لیا ہے۔ یہ واقعی حیرت کی بات ہے۔ ان کے بعض اشعار تہہ دار اور اچھوتے مضامین کے حامل ہیں۔ ؎

میں نے مانا تو گھٹا ہے مگر اتنا نہ برس
میں بھی دریا ہوں کناروں سے ابل جاؤں گا
چھینٹے پڑتے تو اور بڑھتی ہے تشنگی
میرے وجود میں کسی صحرا کی پیاس ہے۔
میں وہ مٹی ہوں جو ہے چاک کی گردش میں اسیر
دستِ گر ہاتھ لگا دے تو سنور جاؤں گا!!

مجموعی اعتبار سے نیرنگ کے سفیر، ایک قابل مطالعہ کتاب ہے۔ جدید شاعری کے انتخاب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اردو کے [illegible] کتاب کی قیمت معمولی [illegible]

بقیہ بزم شاخسار صـ ۱۴۴ کا

پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مجھ پر تنگ دلی کا الزام لگانے والا شخص یقیناً غلط فہمی کا شکار ہے۔ جہاں تک اڑیسہ میں شعر و ادب کی نئی روشنی کے پہنچنے کا سوال ہے، یہ کہنا درست نہیں کہ یہ پہلی بار مظہر امام کے ساتھ وہاں پہنچی۔ خود مظہر امام جب وہ کٹک پہنچے تو ان کی شاعری نیم ترقی پسند اور نیم رومانی تھی۔ اُس وقت ان کے اس نوعیت کے اشعار اڑیسہ میں بے حد مقبول ہوئے۔

بھلا امام تجھے گنہگار کیا جانیں،
کہ رات کتنی حسین ہے شراب خانے کی
اے کاش! ترے سایۂ گیسو میں کٹے عمر
آرام، ترے سر کی قسم یوں تو بہت ہے
آیا ہے کبھی ذکر اگر دار و رسن کا
گیسو و قید بلا کی بات آ ہی گئی ہے

مظہر امام کے یہ اشعار اڑیسہ آنے سے قبل کے تھے۔ [illegible] اڑیسہ کے دوران قیام میں ان کے لہجے میں جو نئی [illegible] اور تازگی پیدا ہوئی ہے، اس کی مثال ملاحظہ فرمائیے:

جگمگاتے ہوئے خیالوں کی
اونگھتی تیرگی بھی دیکھی ہے
گفتگو کا سکوت دیکھا ہے
بولتی خامشی بھی دیکھی ہے

خواب زادوں کی شفق ہو جیسے
زیست، پھولوں کا ورق ہو جیسے
یوں ابل پڑتے ہیں الفاظ سے رنگ
سینہ جذبات کا شق ہو جیسے
[illegible]

بزمِ شاخسار!!

بدنام جو ہوں گے بھی تو کیا نام نہ ہوگا؟

ظہیر غازی پوری ـــ ہزاری باغ

"شاخسار" شمارہ نمبر ۴۱، ۴۲، ۴۳/۴۴، موصول ہوا۔ اب کی آپ نے "میرا صفحہ" کے زیر عنوان آج کے BURNING TOPIC پر قلم اٹھایا ہے۔ اور بڑی وضاحت کے ساتھ شاعری اور اینٹی شاعری، غزل اور اینٹی غزل پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس سے قبل "کتاب" اور "شاعر" کے صفحات پر بھی آپ اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔

زیر نظر شمارہ میں فضا ابن فیضی، حرمت الاکرام، آزاد گلاٹی، نصر قریشی، غلام مرتضیٰ راہی اور لطف الرحمٰن کی غزلیں نئے رنگ و آہنگ کی حامل ہیں۔ حرمت الاکرام، رونق نعیم، ساجد آثر، صفدر محمود خاور، نازش انصاری اور انیس الرحمٰن کی نظمیں دیرپا اثر چھوڑ گئیں۔

آپ کا تحریر کردہ مضمون "مسرو یا نہ تنقید" بطور خاص بہت پسند آیا۔ بیچارے "نوآمدہ" محمود واجد پر کیا کچھ نہ گزر گئی ہوگی۔ انھیں بھلا کیا پتہ تھا کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑنے لگیں گے۔ یہ مضمون اگر آہنگ میں شائع ہوا ہوتا تو بات ہی کچھ اور ہوتی لیکن ان لوگوں میں حقائق سے آنکھ ملانے کی سکت بھی کہاں ہے۔ اس سلسلے میں ایک نیا انکشاف ہوا ہے کہ کلام حیدری اسے آہنگ میں شائع کرنے کے حق میں تھے لیکن محمود واجد کا [illegible] کلام حیدری کو [illegible]

پر ساانستا آسان بھی ہے اور اچھا بھی لگتا ہے لیکن پتھروں کی بوچھار کا ہنس کر خیر مقدم کرنا بڑی اخلاقی جرأت کا متقاضی ہوتا ہے۔

میرے ایک دوست نے بتایا کہ جناب واجد کسی بھی موضوع پر اپنے مخاطب کو اپنے دلائل سے مرعوب یا زیر کرنے میں بڑی مسرت محسوس کرتے ہیں۔ لیکن جب کبھی خود شکنجے میں آتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ جھنجھلاتے ہیں بلکہ رو پڑتے ہیں۔ کیا کسی ایسے ذکی الحس کے لئے دعائے خیر ہی کافی نہیں۔ دعائے مغفرت بھی کرنی چاہیئے!

گیا ہے ایک دوسرے قریبی دوست نے انکشاف کیا کہ جناب واجد کا دعویٰ ہے کہ وہ جس شاعر یا ادیب پر دو مضامین لکھ دیا وہ آسمانِ ادب کا خورشید درخشاں بن جائے گا۔ خدا کی پناہ!

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے۔

جناب واجد کے مختلف تبصرے پڑھ کر مجھے متعدد ارباب ادب نے خطوط لکھے ہیں۔ میں صرف اقتباسات (نام مخفی رکھ کر) پیش کر رہا ہوں۔ قارئین شاخسار یقیناً ان سے محظوظ بھی ہوں گے اور صبر کے حق میں دعا بھی فرمائیں گے۔

(۱) "محمود واجد تو وقتی شہرت کے چکر میں ہیں لیکن [illegible] کی چال کی نقالی میں [illegible] چال بھی بھول گیا۔"

(ب) "واجد صاحب بڑی [illegible] معلوم ہوتے ہیں

سب سے زیادہ ان کا لہجہ افسوسناک ہے:

(ج) "سورج کو اندھا کہنے سے سورج اندھا نہیں ہو جاتا۔ ادبی دنیا میں ایسے ہنگامے تو روز برپا ہوتے ہیں۔ اور اپنی نیند سو جاتے ہیں۔ آجکل گروہی تعصب ہر جگہ کارفرما ہے۔ نئے نقاد تنقید کے منصب کو پوری طرح نہیں سمجھا سکے ہیں اس کا رونا تو ہر ذی شعور اور سنجیدہ فنکار کو ہے۔"

(د) "محمود واجد وہی ہیں جو [illegible] سے قبل ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ابھرتے تھے۔ اس کے بعد .....
اب یہ حضرت ..... تنقید نگار بن بیٹھے ہیں۔ بہرحال نام نہاد تنقید نگاروں کی وجہ سے ادب تماشاگاہ بن کر رہ گیا ہے۔ مداریوں کی ڈگڈگی وقتی طور پر بج رہی ہے۔"

(س) "محمود واجد کا تبصرہ پڑھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گیا کے کچھ حلقوں میں آپ کی روزافزوں شہرت اور مقبولیت کو حسد اور تعصب کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔"

مندرجہ بالا تمام آرا اس لئے مخلصانہ اور غیر متعصبانہ سمجھی جانی چاہئیں کہ تمام ارباب قلم سے میرا صرف خلوص کا رشتہ ہے۔ نہ مجھے کسی رسالہ کی ایڈیٹری میسر ہے اور نہ کسی یونیورسٹی کی پروفیسری کہ خواہ مخواہ کوئی مجھ سے کسی قسم کی امیدیں وابستہ کر سکے۔!

چند حلقۂ بگوش جناب واجد کے تبصروں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے بھی ملا رہے ہیں اور انھیں "ذہانت کے اظہار و انکشاف پر قادر" "غیر جانبدار اور قلم اور دل کا سچا" وغیرہ کہہ کر غالباً مزید خوش فہمیوں میں مبتلا کر دینا چاہتے ہیں۔

ان کی ذہانت کے اظہار کا یہی نمونہ کیا کم ہے کہ انہیں میری نظم "اردو زبان" ناز سن کی نظم کا چربہ [illegible] ہوا جبکہ ناز سن کی نظم میری نظم کے بعد وجود میں آئی ہے۔ اب رہی غیر جانبداری کی بات تو حقیقت یہ ہے کہ تبصرہ لکھتے وقت

انھوں نے کتنی غیر جانبداری برتی ہے یہ ان کا دل ہی جانتا ہے۔ غلط ترتیب عمومی پیش کش کو متاثر کر رہی ہو یا نہ کر رہی ہو لیکن "تصویروں کے تکرار اور تخلیقات کی تقدیم پر اصرار" کی بات ان کے ذہن میں کہاں سے پیدا ہو گئی۔ آپ نے تو انہیں صرف "نقاد مولوی" ہی سمجھا۔ لیکن مجھے تو یہ حضرت کسی ولی اللہ سے کم نہیں نظر آتے۔ "جانبداری" اور "غلط" کی ایسی شاندار مثال دنیائے ادب میں اب تک مفقود رہا ہے۔ میں خود "مورچہ" کے صفحات پر اظہار خیال کا خواہش مند تھا۔ لیکن "مولویانہ تنقید" کی مثال میرے سامنے تھی۔ بہتر میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ کسمپرسی کے عالم میں ادارہ سپر کسی شمیم اصغر کے فرضی بھائی کو جنم دے!

بدیع الزماں خاور ——— واپل (حیدرآباد)

عرصہ کے بعد "تازہ شاخسار" ملا ہے۔ شکریہ۔ "[illegible]" اور "مولویانہ تنقید" پڑھ کر آپ کا قلم چوم لینے کو جی چاہا۔

انیس الرحمٰن ——— مظفرآباد

(۱) بار "شاخسار" گرچہ کافی طویل مدت کے بعد لیکن نئے رنگ و آہنگ میں۔ آپ نے "مولویانہ [illegible]" محمود واجد صاحب کی خوب خوب نقاب کشائی کی [illegible] بھی عام طور سے محسوس کیا جا رہا ہے کہ ان کا [illegible] (AGGRESSIVE) ہے۔ جو کسی بھی طور پر تنقید کے لئے اچھا نہیں۔ خود مورچہ میں بھی اس سلسلہ میں خطوط کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر نذیر ثانی ——— [illegible]

• شاخسار میں محمود واجد [illegible] اور [illegible] [illegible] نے ناقدین ارد [illegible] [illegible] آپ نے [illegible] سید [illegible] کے متعلق [illegible] [illegible] عجب ہے تمام [illegible] نام [illegible] کے مضامین اپنے نام سے شائع کرنے میں [illegible] ان کا [illegible] خود اپنے [illegible] صاحب [illegible] بیدار [illegible]

محمد اقبال ماہر — (الہ آباد) شاخسار کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔

صحت مند ادب کے ترجمان کی حیثیت سے شاخسار بحیثیت اعلیٰ کا جریدہ مانا گیا ہے۔

اداریہ کارآمد ہے۔ ہمیں یہ یقین محکم ہونا چاہئے کہ اردو یونیورسٹی کا قیام ضرور ہوگا۔ اگر مگر، پس و پیش اندیشہ ہائے دور و دراز اور فلسفیانہ مباحث کے چکر سے نکل کر میدان عمل میں قدم رکھنا ہوگا۔ ہر قدم کے ساتھ راستہ خود بخود بنتا جائیگا۔ موقع سے جائز فائدہ اٹھانا چاہئے۔ ہم مستقبل سے ناامید نہیں۔

الجم نجمی کے خطوط معلومات آفریں ہیں۔ ظہیر غازیپوری کا مقالہ متوازن ہے۔

دوراں صاحب کا مقالہ خوب ہے لیکن عنوان بہت یاس انگیز ہے۔ نظیر اکبرآبادی غالب اور اقبال سے ہوتا ہوا جو ادب ہمارے دور تک آیا ہے وہ آئندہ بھی زندہ اور تابندہ رہے گا۔ حقیقت پسندی نئے زمانہ کے نئے مسائل کی ترجمانی اور روشن مستقبل پر ایمان ہی ترقی پسندی ہے اور یہی جدید شاعری ہے وقت کے ساتھ ساتھ نئے موضوعات نئے مسائل کے ساتھ نئے الفاظ کی اختراع اور جدید علامات خود بخود لہجہ بدل دیں گی۔

یاسیت اور قنوطیت کی تو تاریخ اور سائنس خود تردید کرتی ہے۔

دو سال قبل نام نہاد جدیدیت کی تحریک کے ابتدائی دور میں یہاں بھی ناخوشگوار حادثہ پیش آیا تھا۔ فوری جذبہ کے تحت میں نے بھی نظمیں کہی تھیں۔ پھر میں نے سوچا یہ موضوع بذات خود اتنا سنجیدہ نہیں۔ ہمارے چند ساتھیوں نے زبردستی چند غیر معروف لوگوں کو اتنی اہمیت اور شہرت بخشی۔

افسانوی ادب کو اور بلند ہونا چاہئے۔ طبعزاد افسانوں کی کمی کھٹکتی ہے۔

یہ پرچہ ہنوز زیر مطالعہ ہے۔

سلیم شہزاد — (مالیگاؤں)

شاخسار کے شمارے ۳۹/۴۰ کی دو کاپیاں ملیں پرچے میں آپ نے سبھی کچھ جمع کر دیا ہے۔ خصوصاً انجم نجمی کے خطوط۔ ان خطوط کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔ یہ سلسلہ جاری رکھئے۔ اس بار اڑیسہ کے تین شعرا سے آپ نے متعارف کرایا ہے مگر صاحب سچ پوچھئے تو سب کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ خالد رحیم کی صرف تین غزلیں دی ہیں جبکہ ساجد اثر کی چھ اور یوسف جمال کی نو غزلیں تعارف میں شامل ہیں۔ نظمیں مستزاد۔ کیا غزلوں میں تین چھ اور نو کا تناسب برقرار رکھنا ضروری تھا؟ تینوں میں یوسف جمال کی شاعری (غزلیں) پسند آئی۔ تعارف میں اگر آپ کچھ تنقید اور تبصرے کا مادہ بھی شامل کرلیں تو فنکار اچھی طرح سامنے آئیں گے۔

جدیدیت کے خراب اعضاء پر نشترزنی ضروری ہے (ظہیر کا مضمون جدید غزل کا دوسرا رُخ) لیکن جس قسم کا یہ مضمون ہے ایسے کئی مضامین سامنے آچکے ہیں۔ اچھا ہوتا اگر ظہیر اس موضوع کو کسی اور ڈھنگ سے پیش کرتے۔ ادلیس احمد دوراں (مضمون، کیا ۱۹۶۰ء کے بعد ترقی پسند ادب ختم ہوگیا) اور ادریس احمد دوراں کیا ایک ہی شخصیت ہے ادلیس کی ایک غزل شامل ہے۔ یہ کتابت کی غلطی تو نہیں جو پرچے میں جا بجا نظر آتی ہے۔ مضمون پسند آیا۔

(ادلیس احمد دوراں کا نام غلطی سے ادریس احمد دوراں چھپ گیا تھا۔ ادارہ معذرت خواہ ہے۔ (ادارہ))

منظوم حصہ اگرچہ آپ نے بہت طویل کر دیا ہے اور مختلف لہجے اس میں بولتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر غزلوں کی بھیڑ میں کسی کا مخصوص چہرہ صاف نظر نہیں آتا اور پھر دو تین غزلوں کے درمیان آڑی ترچھی لکیریں کھینچ دینے سے پرچے کا حسن زائل سا ہوگیا ہے۔ [illegible]

نازشی، اختر یوسف (دھندلی چاپ) اور نشتر پسند آئے
ویسے نشتر کی نظم کا موضوع بھی بار بار برتا جا چکا ہے۔ منشور
کی غزل تو آپ نے پورے ایک صفحے پر دی ہے لیکن دو
اشعار غزل کے کالم سے خارج کر کے بازوؤں پر لکھ دیئے
ہیں۔ فضا مقصود، عشرت، دوراں، جامی، فراز اور ملکہ خورشید
کی غزلیں کئی لحاظ سے اچھی ہیں۔

شاخسار کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ فیشن زدہ
جدید تخلیقات، خواہ نظم یا غزل، نہیں شائع کرتا۔ ورنہ زیر نظر
شمارے کی تخلیقات میں ایسی چیزیں آ سکتی تھیں جو اور پرچوں
کا خاصہ ہے۔

افسانہ بغدادی پسند آیا۔ ابن زبید کی بات ہی اور
ہے۔ اکثر مرتبہ آپ کے تبصرے نظر نہیں آتے۔ ہر پرچے کو
پابند کیجئے۔

شاغر مہدی ـــــ (بہرائچ)

شاخسار ۳۹ ۔ ۴۰ موصول ہوا۔ میرا صفحہ کے
تحت کرامت صاحب نے اردو ذریعہ تعلیم کے مسائل پر
کافی بصیرت افروز باتیں کی ہیں۔ خصوصی مطالعہ کا سلسلہ
بہت خوب ہے۔ امجد نجمی صاحب کے خطوط واقعی ادبی علمی
اور ثقافتی ورثہ کے ساتھ ساتھ انشائیہ ادب میں قدر
کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔ ظہیر غازی پوری اور اویس احمد
دوراں کے مضامین دلچسپ رہے
مگن ناتھ آزاد صاحب کیا یادوں کی کوئی اور
بارات نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں دوسرا گوشہ حصہ نظم
کا انتخاب اور زیادہ سخت ہونا چاہئے۔ میرے خیال
میں حصہ نثر کے مقابلے میں حصہ نظم اس اعتبار سے کمزور
ہے۔ اس طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے

شرافت حسین ـــــ (فیض آباد)

[illegible] شاخسار کا شمارہ ۳۹ ۔ ۴۰
[illegible] کی طرف سے موصول ہوا۔ پرچہ ہر لحاظ
سے بہت خوب ہے۔ "اپنا صفحہ" کے تحت کرامت علی کرامت
نے ایک اہم مسئلے کو اٹھایا ہے۔ میں ان کی رائے سے
پوری طرح متفق ہوں۔

خصوصی مطالعہ کے ساتھ ساتھ اطلیسہ سے تین جدید شعرا
خالد رحیم، ساجد اثر اور یوسف جمال کے کلام کا تعارف
ہو گیا ہے۔ عزمت اللہ اکرام کی آزاد نظم بہت اچھی ہے
افسانوں کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ غزلوں کی
بھرمار ہے۔ اگرچہ تمام غزلیں خوبصورت اور معیاری تھیں۔

ش۔ک۔ نظام ـــــ (جودھپور)

شاخسار شمارہ ۳۹ ۔ ۴۰ باصرہ نواز ہوا۔ اچھا لگا
امجد نجمی صاحب کے خطوط جناب عبد اللطیف عارف
کے نام بہت پسند آئے۔ واقعی آج کے دور میں اس
قسم کے ادب پاروں کی بہت ضرورت ہے۔ مثلاً لفظ
"غسل" پر ہی دیکھئے کتنی باتیں سامنے آ گئی [illegible]
کو بالکل ہی نظر انداز کر دینا سمجھداری کی بات نہیں
بے شک اس دور کے تقاضے کے مطابق کیا گیا ہے [illegible]
زیادہ توجہ دینا چاہئے مگر کیسے کیا ہے؟ بچوں پر توجہ دینا
ضروری ہے ـــ امید ہے "شاخسار" [illegible]
کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اس قسم کے مضامین
دیتا رہے گا ـــ

مضامین میں "جدید اردو غزل کا دوسرا رخ" از
جناب ظہیر غازی پوری قسط ہوتے ہوئے بھی اچھا ہے
ایسے مضامین بھی لکھے جانے چاہئیں۔

ساجد اثر کا یہ شعر اچھا لگا۔

بس یہی سوچ کر مجھ کو جھوٹا ہے تو کو
تیرے قد کے برابر مرا قد نہیں

دوسری غزلیات میں رشید افروز، فضا ابن فیضی
[illegible] زیبا، مصور سبزواری کی غزلیں اچھی لگیں [illegible]
اور دو گش دور میں آپ کی خدمات قدر و منزلت کی [illegible]

سے نکل جائیں گی۔

مجھے فرشتہ۔ آج سے اندازاً ایک سال قبل میری ایک غزل آپ نے پسند فرمائی تھی مگر وہ آج تک شائع نہیں ہوئی اور اگر شائع ہوئی تو مجھے اس کی کوئی اطلاع نہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے "شاخسار" کسی گروہ سے جڑا ہوا نہیں اور اگر ہے تو پھر اس دور میں کوئی تعجب نہیں مگر ناانصافی جب منصف مزاج شخص کے ہاتھوں ہوتی ہے تو تکلیف ہوتی ہے — کیا کسی سنگلاخ خطے میں پیدا ہونا یا غیر معروف جگہ بیٹھ کر ادب کا مطالعہ کرنا یا تخلیق کرنا جرم ہے؟ آپ سے توقعیں امید ہیں۔

شہزاد معصومی —— (پٹنہ)

"شاخسار" کا تازہ شمارہ نظر سے گزرا۔ کافی اچھی باتیں اس شمارے میں دیکھنے میں آئیں۔ جناب امجد نجمی کے خطوط بڑے کام کے ہیں۔ اس طرح کے خطوط شائع کرنے چاہئیں جن سے زبان و ادب کی صحت ہوتی ہے۔

خالد رحیم، ساجد اختر اور یوسف جمال کی شاعری کا مستقبل روشن معلوم ہوتا ہے۔ کرامت صاحب نئے شاعروں کا خصوصی مطالعہ اسی طرح جاری رکھیں تو بہتر ہے۔

ادریس احمد دوراں کی نفسیاتی گرہوں کا پیچ اُن کے مضمون "کیا ۱۹۶۰ء کے بعد ترقی پسند ادب ختم ہو گیا" میں کہیں کہیں پہ جھلک جاتا ہے۔ مثلاً جہاں یہ وہ مظہر امام کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے اپنے شکست خوردہ احساسات اُن کی تحریر کے پس منظر سے جھانک رہے ہیں۔ بیان میں تضادات کی کمی نہیں۔ ترقی پسند ادب اور جدید ادب، ترقی پسند تحریک اور جدید رجحان ان میں کسی ایک پر بھی ان کا ذہن صاف نہیں ہے۔ یہ اپنے مضمون میں ترقی پسند ادب سے زیادہ ترقی پسند تحریک کے مخالف نظر آتے ہیں۔

ادب کے سلسلے میں ان کا شعور ترقی پسند تحریک، دیگر تنظیم کے دائروں میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ادب کو کسی مخصوص نظریئے کے احاطے میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کوئی جامد شئے نہیں ہے۔ اسے کسی جھیل سے بھی تشبیہ نہیں دے سکتے کیونکہ اس کا احاطہ بھی کسی تنظیم و تحریک کی حد تک محدود ہے۔ ادب تو مختلف مشاہدات، احساسات و کائنات کا ایک بہتا ہوا دریا ہے جو اپنے دامن میں عصری تقاضوں کو لئے زمانے کے ہر نشیب و فراز سے ہوتا ہوا منزل بہ منزل کبھی تیز رو کبھی نرم رفتار ہو کر رُکتا، تھمتا، سمٹتا، پھیلتا آگے بڑھتا جاتا ہے۔

شمس فریدی —— (جمشید پور) "شاخسار" کا شمارہ ۴۱، ۴۲، ۴۳ موصول ہوا۔

زیر نظر شمارہ میں کافی تعداد میں معیاری تخلیقات کی شمولیت سے "شاخسار" کی تاخیر سے شائع ہونے کا احساس جاتا رہا۔

میرا صفحہ میں آپ نے نئی غزل اور نئی شاعری پر بہت اہم اور نکتہ رس گفتگو کی ہے۔ آپ کا یہ نقطۂ نظر "نہ میں نئی شاعری کو شاعری ماننے کو تیار ہوں اور نہ شاعری کو نئی شاعری" حقیقت پسندانہ ہے اور میں آپ کے اس خیال سے قطعی طور پر متفق ہوں۔

مولویانہ تنقید، پڑھ کر لطف آ گیا آپ نے مولوی صاحب کی خوب درگت بنائی ہے اور اس کی ضرورت بھی تھی۔

ڈی۔ کے۔ کنول —— بڑگام (کشمیر)

"شاخسار" کا تازہ شمارہ ملا۔

آپ نے اپنے تجزیاتی مضمون "مولویانہ تنقید" میں محمود واجد کی خوب خبر لی ہے۔ نہ جانے ان حضرات کو یہ جلاپے کی شکایت کب سے ہوئی ہے۔ پہلے جناب وطنی صاحب کو اس قسم کی خارش ہونے لگی تھی۔ وہ

صاحب بھی بہت بڑے نقاد بن بیٹھے تھے۔ وہ شمارہ میں کچھ اوٹ پٹانگ باتیں لکھ کر وہ اس زعم میں رہتے کہ انہیں نقادِ اعظم کے خطاب سے نوازا جائے گا مگر جب آپ نے اپنے قلم کو جنبش دی اور جالب وطنی صاحب کے چہرے پر پڑے ہوئے نقاب کو اتار پھینکا تو جب سے منہ چھپائے پھر رہے ہیں بیچارے۔

اب محمود واجد صاحب پر بھی اسی قسم کا دورہ پڑ چکا ہے۔ وہ بھی بہت بڑے نقاد ہونے کی خوش فہمی میں مبتلا ہیں ان کے کارناموں کا تجزیہ پیش کر کے کم از کم ہم بھی ان کی ناقدانہ صلاحیتوں سے متعارف ہوئے۔ واقعی ان کے کارنامے شیخ چلی کی حماقتوں سے کم نہیں۔ ایک طرف یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اردو ادب کا غم کھائے جا رہا ہے۔ در پردہ ان کے کرتوت دیکھئے کہ اردو ادب کی بے لوث خدمت کرنے والے شعرا پر یہ حضرات کس طرح کیچڑ اچھالتے رہتے ہیں۔ امجد نجمی جیسے کہنہ مشق و پختہ ذہن شاعر پر مضحکہ خیز تنقید کر کے انہوں نے اپنی تعصبانہ ذہنیت کا پورا پورا ثبوت پیش کیا ہے۔

میں محمود واجد صاحب کو یہی مشورہ دوں گا کہ وہ نقاد بننے کی کوشش نہ کریں کیونکہ تنقید نگاری بچوں کا کھیل نہیں۔

واحد پریمی — (بھوپال) تازہ "شاخسار" ایک خاص نمبر کی صورت میں موصول ہوا۔ یقین فرمائیے بیماری اور تنہائی کے ایسے عالم میں جبکہ میں جسمانی تکالیف کے ساتھ ساتھ ذہنی پریشانیوں میں بھی مبتلا تھا "شاخسار" کا یہ شمارہ میرے لئے مژدۂ جاں فزا ثابت ہوا۔ کیونکہ اس کے مطالعہ کے دوران کئی گھنٹے نہایت سکون اور بے فکری میں گزر گئے۔

اس بار بھی میرا مضمون "نہایت مفید و کارآمد [illegible] "مولویانہ تنقید" [illegible]

کلام کی ابتدا ہی ہے۔ ایسے تمام حضرات کی نقاب کشائی بے حد ضروری ہے جو کچھ نہ بن سکے تو دو چار چونکا دینے والے مضامین یا تبصرے لکھ کر اپنی ناقدانہ حیثیت بنانے میں لگ گئے ہیں۔ اگر ایسے حضرات کی تحریروں کا بروقت جواب نہیں دیا گیا تو وہ دن دور نہیں جبکہ ادبی دنیا میں بیسیوں کلیم الدین احمد اور شمس الرحمٰن فاروقی نظر آئیں گے اور تنقید جو فنکار کے فن کو جلا دیتی ہے غلط ہاتھوں میں جا کر ایک مذاق بن جائے گی لیکن امید ہے کہ آپ جیسے بیباک اور باشعور صاحبِ قلم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ آپ اس سلسلے کو ضرور جاری رکھیں۔ دیگر تخلیقات کے بارے میں کیا عرض کروں۔ ہر تخلیق معیاری اور شگفتہ ہے کس کس کی تعریف کروں۔ آخر میں محترم بھائی مناظر عاشق ہرگانوی کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے میری غزل گوئی کے بارے میں مضمون نہایت خلوص اور محنت سے لکھا ہے۔

سالک لکھنوی — (کلکتہ) آپ کے مضمون "مولویانہ تنقید" اور جناب علی عباد زیدی کا بزمِ شاخسار میں شائع شدہ خط پڑھا۔ انہوں نے میرے ایک نصف لکھے ہوئے مضمون کو "مرحوم" کر ڈالا میری کاہلی کی یہی سزا ہے۔ آپ کا مضمون پڑھا تو محسوس ہوا کہ — "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" — حالانکہ احساسات دل سے اتر کر مضمون تک تقریباً پہنچ چکے تھے کہ شاخسار ملا اور آپ کے مضمون اور زیدی صاحب کے خط کی روشنی میں میرا لکھا ہوا مضمون "حرفِ گفتہ شدہ" ہو گیا ہے۔ میں نے جناب محمود واجد کے چند تبصرے بھی [illegible] پڑھے اور کچھ ایسا محسوس ہوا [illegible] نہیں ہو سکا ہے بلکہ کسی [illegible] [illegible]

[illegible] رشیم — (جمشید پور) شاخسار کے شمارہ [illegible] میں آپ نے اڑیسہ کے تین نئے شاعروں کا [illegible] مطالعہ پیش کرکے ایک اہم ادبی فریضہ ادا کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کا سلسلہ جاری رہنا چاہئے
کرامت علی کرامت کا تعارفی مضمون اُن کی تنقیدی بصیرت کا غماز ہے اور بڑے سلیقے سے لکھا گیا ہے لیکن ایک دو جگہ اُنھوں نے تھوڑی سی تنگ دلی سے بھی کام لیا ہے جو کرامت صاحب جیسے مخلص شاعر اور صاحب نظر نقاد کو زیب نہیں دیتیں۔

اس میں شک نہیں کہ مکرمی امجد نجمی صاحب نے نصف صدی سے زیادہ اڑیسہ کے شعری اور ادبی ماحول کو سنوارا اور نکھارا ہے۔ اور اس وقت آپ کی شخصیت وہاں کی بزرگ ترین ادبی شخصیت ہے۔ موصوف نے اپنے یہاں کے لکھنے والوں پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ نجمی صاحب کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس کہن سالی کے باوجود آپ نے نئے اذہان کا ساتھ دیا ہے لیکن بنیادی طور پر آپ کا مزاج کلاسیکی ہے۔ اور جہاں تک میری واقفیت ہے میں سمجھتا ہوں کہ اڑیسہ میں شعر و ادب کی نئی روشنی مظہر امام کے ساتھ پہنچی ہے۔ کٹک کے ادبی ماحول کو فکر اور اسلوب کے نئے رجحانات سے روشناس کرانے میں موصوف کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔ مظہر امام کے وہاں جانے کے بعد بہتوں نے اُن سے براہ راست استفادہ بھی کیا ہے ساجد اثر اور خالد رحیم کی ذہنی نشو و نما پر امجد نجمی صاحب کے رول سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ان پر مظہر امام کے اثرات سے چشم پوشی بھی نہیں کی جا سکتی ہے۔ اور خاص طور پر خالد رحیم تو [illegible] سے بہت قریب رہے ہیں۔۔ اسی قربت کا اثر خالد صاحب کے اشعار میں نمایاں ہے۔

[illegible]

اور مظہر امام کہتے ہیں ؎

جن سے کترا کے نکلتے رہے بر سر راہ
اُن سے کل ہاتھ ملایا تو وہ اپنا نکلا

شاخسار کے اس شمارہ میں پیام فتحپوری کی غزل کا مطلع پڑھ کر بے اختیار مظہر امام کا ایک مشہور مطلع یاد آگیا ؎

اپنے رستے ہوئے زخموں کی قبا لایا ہوں
زندگی میری طرف دیکھ کہ میں آیا ہوں

اور پیام صاحب کی اس کی بھونڈی نقل یوں پیش کرتے ہیں۔

زخم دل زخم جگر زخم قبا لایا ہوں
زندگی دیکھ کہ کس حال میں میں آیا ہوں

یہ توارد نہیں صاف اور صریح سرقہ ہے۔ مظہر امام کی غزل غالباً چھ سات سال پہلے نقوش میں شائع ہوئی تھی اور اس کے بعد کئی انتخاب میں بھی آ چکی ہے۔ پیام صاحب کو شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ایک شاعر کو سب سے پہلے ایماندار ہونا چاہئے۔

کرامت علی کرامت :-

"اڑیسہ میں مظہر امام کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے میں نے اپنی تالیف "آب خضر" میں لکھا ہے۔
"آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے سلسلے میں [illegible] ۱۹۵۰ء سے [illegible] تک آپ کا قیام کٹک میں رہا۔ لیکن اس مختصر مدت قیام میں، آپ نے اڑیسہ میں جتنی پر خلوص ادبی خدمت انجام دی ہیں، شاید کسی اور کو یہ بات نصیب نہیں ہوئی۔۔۔ اڑیسہ کے بہت سے نوجوان شعرا آپ کی طرز شاعری اور انداز بیان سے متاثر ہیں اور یہ [illegible] کی بہت بڑی دلیل ہے۔" [illegible]
"آب خضر" [illegible]

اردو زبان کا منفرد علمی و ادبی جریدہ

ماہنامہ

شاخسار

اپریل ۱۹۷۳ء

اشاعت کا نواں سال

شمارہ ۴۷

مدیرِ اعلیٰ: امجد نجمی

صلاح کار:
سید حرمت الاکرام
سید اولاد اصغر رضوی
احمد حسین آزاد

معاون: سالک لکھنوی

قیمت: ۷۵ پیسے

زرِ سالانہ: ۹ روپے

پتہ
بخشی بازار کٹک ۱
(اڑیسہ)

ترتیب

کتابت: ایس. ممتاز حسین لکھنوی۔
مطبوعہ: سرفراز پریس لکھنؤ

میرا صفحہ

ترقی اردو بیورو کی طرف سے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کی تالیف اور ترجمے کا کام بڑے تشفی بخش طریقے پر ہو رہا ہے۔ اصطلاحات سازی کا کام بھی خاصا آگے بڑھا ہے۔ امید ہے کہ تین سال کے اندر اردو میں مختلف علوم و فنون کی معیاری کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو جائے گا۔ لیکن اردو داں طبقہ سوچ رہا ہے کہ آخر ان کتابوں کا مصرف کیا ہوگا؟ یہ کتابیں طالب علموں کے استعمال میں آئیں گی یا محض لائبریری کی زینت بنیں گی؟ اردو یونیورسٹی کے قیام کے بغیر ان کتابوں کی طباعت بے معنی ہے۔ اس سلسلے میں بعض احباب کی رائے یہ ہے کہ اردو یونیورسٹی جیسی سکنڈ کلاس یونیورسٹی قائم کیوں کی جائے؟ جدید ترین علوم و فنون کی کتابوں کا معقول ترجمہ اردو میں ہو جائے تو پھر اردو یونیورسٹی سکنڈ کلاس یونیورسٹی کیسے رہ جائے گی، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ جن یونیورسٹیوں کا ذریعۂ تعلیم انگریزی، بنگالی، تیلگو یا تامل ہو وہ تو فرسٹ کلاس یونیورسٹی ہو سکتی ہے، لیکن جس یونیورسٹی کا ذریعۂ تعلیم اردو ہو وہ سکنڈ کلاس یونیورسٹی ہو جائے۔ یہ ہٹ دھرمی اور احساس کمتری کی انتہا بھی ہوتی ہے۔ کچھ دنوں میں یونین پبلک سروس کمیشن کے امتحانات مختلف علاقائی زبانوں میں ہوں گے۔ اب غور فرمائیے، اردو یونیورسٹی کے قیام کے بغیر اردو والے کیا دوسروں کے مقابلے میں ٹھہر سکیں گے؟ میری تو رائے یہ ہے کہ اردو یونیورسٹی میں CORRESPONDENCE COURSE کا انتظام ہو تاکہ ہندوستان بھر کے اردو خواں طلبا اس سے استفادہ کر سکیں۔ لیکن اردو کے لئے صرف اردو یونیورسٹی کا قیام ہی کافی نہیں ہے۔ اردو یونیورسٹی کے لئے طلبا کہاں سے آئیں گے؟ جب تک ابتدائی اور ثانوی سطح پر اردو کی تعلیم کا انتظام نہ ہوگا؟ اس لئے ضروری ہے کہ ابتدائی اور اعلیٰ دونوں سطحوں پر اردو کی تعلیم کا بیک وقت انتظام ہو۔ اس سلسلے میں ہمیں اردو یونیورسٹی کمیشن کی تجویزوں کا بے چینی سے انتظار ہے۔ میری رائے میں اردو اور سندھی، ان دونوں زبانوں کا کوئی صوبہ نہیں ہے۔ اس لئے اگر مرکزی حکومت ان دونوں بڑی زبانوں کی تعلیم کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں لے لے تو موجودہ بحران بڑی حد تک دور ہو سکتا ہے۔

بعض احباب کا خیال ہے کہ جدید علوم و فنون کی اردو کتابوں کو دینی اداروں میں مروج کیا جائے تو بہتر ہے۔ میں دینی اداروں کے نصاب میں جدید تبدیلیوں کا قائل ضرور ہوں، لیکن تبدیلیاں ایسی نہ ہوں کہ دینی ادارے محض دنیاوی ادارے بن کے رہ جائیں اور دینی ہو کے باقی نہ رہیں۔ اگر دینی اداروں کے سلیبس کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ان اداروں سے نکلنے والے طلبا کو بینک، صوبائی پی۔ ایس سی اور یونین پبلک سروس کمیشن کے امتحانوں میں حصہ لینے کا موقع دیا جائے اور ان امتحانات کے لئے سوالات اس سلیبس کے مطابق ہوں تو یہ مشورہ بامعنی ثابت ہو سکتا ہے ورنہ اس مادہ پرست زمانے میں اقتصادیات کو بالائے طاق رکھ کر ہر طرح کی تجویز بے سود اور بے معنی ثابت ہوگی۔ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

کرامت علی کرامت

مرتب:- کرامت علی کرامت

امجد نجمی کے خطوط

عبداللطیف عارف کے نام

۲۸ر دسمبر ۶۴ء

عارفِ پُرجوش

کو سلام سے نوازش۔ کل اطہر الامین صاحب آئے تھے۔ جلسہ کی کامیابی پر میں نے اُن کو مبارکباد پیش کر دی۔ بڑے خوش تھے۔ فرمانے لگے وہاں لوگوں میں کافی جوش و خروش ہے۔ شبِ قدر میں پڑھائی گھر کا سنگِ بنیاد رکھا جائے گا جس کے لئے سب لنگ کے حاجی صاحب رضامند ہو گئے ہیں۔

کیندراپاڑا کے جلسۂ مشاعرہ اور محفلِ دعوت دونوں کی کامیابی کا سہرا درحقیقت صاحبِ موصوف کے سر ہے۔ اس سے پہلے بھی میں اُن کے خلوص سے متاثر ہوا ہوں۔ بڑے کام کے آدمی ہیں۔ کام کے آدمی کام کرنے میں برق، اور نکتہ چینی حرف گیری میں غرق۔ ایسے پُرخلوص انسان دو چار اور نکل آئیں تو سمجھیے کہ ہمارا بیڑا پار ہے۔

جلسہ کی ہر کارروائی ابتدائے بسم اللہ تا انتہائے تمت بھی سعادت صاحب کے خطبۂ استقبالیہ سے لے کر انور صاحب کی اختتامی تقریر تک، نہایت شاندار رہی۔ پھر ہمارے نائب صدر ساجد میاں کا تحریری خطاب گویا نورٌ علیٰ نور ہو گیا۔ ضیٔ صاحب نے مشاعروں کی افادیت پر جو کچھ برجستہ ارشاد فرمایا، وہ مختصر ہونے کے باوجود نہایت مدلل اور مثبت تھا۔ صدرِ جلسہ نے اردو کی عالمگیری شہرت پر جو چند باتیں کہیں، وہ بڑی کام کی تھیں۔ خصوصاً بنگالی ادبی کانفرنس کے ساتھ مشاعرے کا موازنہ تو بڑا لطف دے گیا۔

اب شعراء کے کلام پر مختصر سا تبصرہ ملاحظہ ہو:۔

جلال الدین بدر کے قطعات اچھے تھے اور غزل بھی خوب۔ اچھی طبیعت پائی ہے۔

جنوں اپنے جنوں میں پختہ کار نکلا یعنی شعراء کی بھیڑ بھاڑ سے میں گھس کر آخر اپنی غزل محفل میں پڑھ ہی دی۔ میاں رونق اس دفعہ کافی سنجیدہ اور متین نظر آ رہے تھے۔ نوجوانوں سے مخاطب ہو کر اہلِ مشاعرہ سے خراجِ تحسین وصول کر ہی لیا۔ راقم نے بھی دو چار شعر پڑھ ڈالے ہی تھے۔ شاکر کی غزل گو چست تھی مگر پڑھنے کا انداز قابلِ رحم تھا اس لئے کچھ داد بھی ملی کچھ بے داد بھی۔ بہاء الدین ساحل کی نظم "وہ آئے" اور خالد رحیم کی نظم "حسنِ معصوم" اپنے انداز کی چیزیں تھیں۔ نکھری ستھری اور سلجھی ہوئی۔

ضمیر خاں ضمیرؔ کی نظم مثلث کو ان کا اندازِ ترنم محفل میں لے اڑا۔ ایسا کہ اُنھوں نے سب کا دل موہ لیا۔ خصوصاً صدرِ جلسہ تو ان کے گرویدہ بن گئے۔ ہر بند کافی پُر اثر تھا۔ حافظ دتہؔ نے بھی اپنے کئی شعر پر واہ واہ کا ٹیکس وصول کر لیا۔

حیدر نایابؔ کی مے نوشی اور بے پیئے کی مدہوشی" نے ساری محفل کو مست کر دیا۔ فرادؔ صاحب کے تخیلات اِس دفعہ گہرائی لیے ہوئے تھے۔ قادر بخش سلیمؔ ہمیشہ سے محفل میں "ناصحِ مشفق" کا فرض انجام دیتے آئے ہیں اور اِس دفعہ تو اور اونچے اُڑے۔

آپ نے تو ماشاء اللہ غضب ہی ڈھایا۔ ایسا جوش ایسی اُمنگ یہ ولولہ یہ FORCE (زور) اِس سے پہلے آپ میں میں نے کم دیکھا۔ محفل میں آپ کے مسدس کی پذیرائی خوب رہی۔ سامعین پر آپ ایسا چھا گئے تھے کہ محفلِ مشاعرہ میں ایک سماں بندھ گیا تھا۔ میں خود بھی مبہوت سا رہا۔ واہ شاباش آفریں! ماشاء اللہ صلِ علیٰ! میر اگیتہ گویا سَنت کبیر داس کا دوہا تھا اور بس۔ اب رہے میاں صمد خاں برقیؔ، تو ظالم نے اپنے مزاحیہ اشعار سے جملہ خواص و عوام کو مسخر کر لیا۔ گویا مشاعرے کے اسٹیج پر کلاؤن (مسخرہ) کا پارٹ ادا کیا۔ بزم میں اہلِ نظر سے بڑھ کر تماشائی زیادہ ہوتے ہیں، اس لئے بھی چند سے تماشے کا لطف آ گیا۔ لیکن سچ پوچھئے تو مذاق مذاق میں بڑے کام اور رتبہ کی باتیں کہہ گیا۔ الغرض ہر گُلے را رنگ و بوئے دیگر است کی طرح ہر شاعر نے اپنے اپنے رنگ کے اشعار محفل میں پیش کر کے اہلِ کیندرا پاڑا میں ایک نئی روح پھونک دی جس کا اثر تا دیر قائم رہے گا۔ وہاں کا کاروانِ ادب، اب جادہ پیما ہو تو کچھ عجب نہیں۔ خیر، کچھ بھی ہو ع

محبتیں اپنی جواں ہیں تو جواں ہے اردو!

نجمی

۲۸ مارچ ۶۵ء

مولوی صاحب سلامت

مزاجِ اقدس! آج چونکہ یکشنبہ تھا اس لئے اشتیاقِ دید اور شوقِ ملاقات میں آستانِ عالی پر حاضر ہوا تھا۔ لیکن محرومیٔ قسمت کو کیا کیجئے؟ معلوم ہوا کہ آپ بہراج پور کسی کے ہاں دعوتِ ولیمہ میں تشریف لے گئے ہیں۔ اللہ اللہ! کھُلے آسمان کے نیچے، تپتی ہوئی زمین پر، چلچلاتی دھوپ میں، تنِ تنہا، پندرہ بیس میل کا سفر اور وہ بھی سائیکل پر! کیا کہنے ع

لذتِ صحرا نوردی دوریٔ منزل میں ہے!

خیر۔ مولانا عبدالرشید صاحب نقادؔ کی مزاج پرسی کے بعد جب گھر واپس آیا تو اُڑیا روز نامہ اخبار "سماج" میں ایک خبرِ وحشت اثر نظر سے گزری جس کو آپ کی اطلاع کے لئے لکھ رہا ہوں۔ اپنی یادداشت میں نوٹ فرما لیجیے تاکہ اس کی تصدیق یا تکذیب میں آئندہ چل کر مدد ملے۔ ایک جوتشی بی۔ کے۔ کول نامی فروری ماہ سے واردِ شہر ہو کر ہنوز یہیں قیام پذیر ہیں۔ کٹک کے مشاہیر سرکاری آفیسر صحافی، ادیب وغیرہم سے مل کر انھوں نے چند اہم پیشین گوئیاں کی ہیں۔ سماج کے مدیر شری رادھا ناتھ رتھ پرجاتنتر کے ایڈیٹر شری جانکی ولبھ پٹنائک اور پبلک سروس کمیشن کے سابق چیرمین شری سومناتھ مہاپاتر وغیرہم ان سے مل کر ان کی فال گوئی پر بحث مباحثہ کر چکے ہیں۔

جناب کول اس کے پیشتر صوبۂ بہار میں ایک کامیاب منجم کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی چند پیشین گوئیاں درجِ ذیل ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

(۱) آئندہ ماہِ مئی میں بھارت کے ایک مشہور نیتا یا تو اپنے عہدے سے الگ ہو جائیں گے

یا [illegible]

(۲) جولائی یا اگست تک بھارت کے اور ایک
لیڈر کی موت واقع ہوگی۔

(۳) اڑیسہ، پنجاب، کیرل، مدراس، بہار اور
مہاراشٹر وغیرہ ریاستوں میں راشٹرپتی
شاسن یعنی حکومت صدر جمہوریہ قائم ہونے
کے امکانات ہیں۔

(۴) آئندہ ماہ اکتوبر تک پاکستان کے سب سے
اعلیٰ عہدہ دار رہنما کو مسندِ حکومت سے
علیحدہ ہونا پڑے گا۔

(۵) جون اور ستمبر کے درمیان دنیا کی مختلف
ریاستوں میں ایک عالمگیر تباہی کے آثار
رونما ہوں گے۔ زلزلہ سے جاپان، ایران
اور شمالی ہند کا کچھ حصہ یعنی پاکستانی علاقوں
میں کچھ تباہ کاریاں عمل میں آئیں گی۔

(۶) ملک میں عام طور پر فرقہ وارانہ فسادات ہونے
کا اندیشہ ہے۔

(۷) شمالی امریکہ وغیرہ ملکوں میں حکام کی سخت
مخالفتیں ہوں گی جس سے ان کی جانِ عزیز
خطرے میں ہوگی۔

یہ ہیں چند پیشین گوئیاں جو انھوں نے بڑے
وثوق کے ساتھ کی ہیں۔ علم نجوم گو دیگر علوم متعارفہ
مثلاً فلسفہ، منطق، موسیقی، طب، سائنس وغیرہ وغیرہ کی
طرح ایک اہم اور دلچسپ علم ہے لیکن ہمارے عقیدے
کے خلاف ہے۔ اس کے لئے مختصر فتویٰ یہی ہے کہ اعتبار
را نشاید۔ مرقوم الذیل قطعہ ملاحظہ ہو ؎

علمِ غیبے کس نمی داند بجز پروردگار
گر کسے گوید کہ من دانم باو باور مدار
مصطفےٰ ہرگز نہ گفتے تا نہ گفتے جبرئیل
جبرئیل ہم نہ گفتے تا نہ گفتے کردگار (یحییٰ)

۷، دسمبر ۱۹۶۵ء

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
مدت ہوئی ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

مولانا صاحب۔ السلام علیکم۔ مزاج اطہر!
عمر خیام جس کے خمریات کا شہرہ جوارِ مشرق سے
بڑھ کر دیارِ مغرب میں گونج رہا ہے اور جو ع

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ

کی طرح اپنے خمکدہ کا آپ پیرِ مغاں ہے، مئے ولی سکا ستو
میں وہ پتے کی باتیں کہہ گیا ہے جو صرف دیکھنے سے تعلق
رکھتی ہیں اور جن کو پڑھ کر اہلِ ذوق اور صاحبدل جھوم
اٹھتے ہیں۔ لیکن ظاہر پرست یورپ ہے کہ محض ان کے
سطحی مفہوم کا دلدادہ ہے اور سمجھتا ہے کہ خیام کا فلسفہ
بھی یونانی فلسفی اپیکورس کے فلسفۂ زندگی کے مشابہ
ہے یعنی کھاؤ پیو، عیش و عشرت میں زندگی کے دن گذا(رو)
کیونکہ سب کو آخر ایک دن مرنا ہے حالانکہ ایسی بات
ہرگز نہیں ہے۔ بہرکیف اس کی یہ رباعی ملاحظہ ہو ؎

من بندۂ عاصیم رضائے تو کجاست
تاریک دلم نورِ صفائے تو کجاست
ما را تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی
ایں مزد بود، لطف و عطائے تو کجاست

اسی مفہوم پر شہزادی زیب النساء مخفی کا یہ مقطع پڑھئے

مخفی بہ قدرِ طاعتِ ما گر عطا دہند
در روزِ حشر رحمتِ پروردگار چیست؟

حافظ کہتے ہیں ؎

سہو و خطائے بندہ اگر نیست اعتبار
معنیٔ عفو و رحمتِ پروردگار چیست؟

لیکن عرفی شیرازی کی خودداری ملاحظہ فرمائیے۔ کہتا ہے ؎

گرفتم آنکہ بہشتم دہند بے طاعت
قبول کردن و رفتن نہ شرطِ انصاف است!

اب کیا فرماتے ہیں علمائے دین کرام بیچ اس مسئلہ خودداری کے؟

(۲) ایک اور رباعی سنیئے۔ کہتا ہے ؎

آباد خرابات ز مے خوردن ماست
خون دو ہزار توبہ بہ گردن ماست
گر ما نہ کنیم جرم، رحمت چہ کند؟
آرائش رحمت ز گنہ کردن ماست

اسی تخیل پر حضرت امیر مینائی کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

موقوف جرم ہی پہ کرم کا ظہور تھا
بندے اگر قصور نہ کرتے قصور تھا

غالب فرماتے ہیں ؎

کس پردے میں ہے آئینہ پرداز اے خدا
رحمت کہ عذر خواہ لب بے سوال ہے

غالب: ؎

ہفت دوزخ در نہاد شرمساری مضمر ست
انتقام است اینکہ با مجرم مدارا کردہ ای

(۳) ایک رباعی اور سماعت فرمائیے۔ ؎

رفتند و ز رفتگاں یکے نامد باز
تا با تو گوید از پس پردۂ راز
کارت ز نیاز می کشاید، نہ نماز
بازیچہ بود نماز بے صدق و نیاز

نماز اور نیاز پر ملا شیدا کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔ کیا سچ کہا ہے ؎

نماز را بگذار و نیاز پیش آور
دوگانہ را چہ کنی آں یگانہ را دریاب

خدائے بے نیاز کی بے نیازی پر داغ کا یہ قول بھی کتنا چبھتا ہوا ہے۔ کہتے ہیں ؎

وہاں ہے بے نیازی داغ اسکی کس کو ہے پروا
یہ طاعت اپنی رہنے دو عبادت اپنی رہنے دو

اصغر گونڈوی کہتے ہیں ؎

بے نیازی کو تری کچھ بھی پذیرا نہ ہوا
شکوہ اخلاص مرا شکوۂ باطل میرا!

گناہ اور سجدۂ نیاز پر غنی کشمیری کا یہ شعر کتنا سچا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ؎

سر پیش نگندن ز گنہ داد سجائم
صد طاعت نا کردہ بیک سجدہ ادا شد

رحمت اور گناہ پر غالب کا یہ شعر بھی خوب ہے ؎

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا!

اسی گنہ اور رحمت پر ان کا یہ شعر بھی بہت مشہور ہے ؎

فرط گنہ سے دل کو نہیں کچھ ہراس ہے
ہم کو بہت بڑی تری رحمت کی آس ہے!

ہاں امیر کا ایک شعر اور یاد آیا ؎

گو عفو معاصی سے لگائے رہیں عاصی
رحمت کو بہت آتے ہیں بخشش کے بہانے

داغ کا یہ سادہ شعر بھی ملاحظہ ہو ؎

مری بندگی سے مرے جرم افزوں
ترے قہر سے تیری رحمت زیادہ!

دیکھا آپ نے بات کہاں سے کہاں پہنچی۔ رحمت، عفو، کرم، فضل، لطف:

ع لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

زیادہ حد۔ وَاللّٰہُ لَطِیفٌ بِالْعِبَادِ۔

نجمی

(۱۲ دسمبر ۶۵ء)

خط لکھیں گے گرچہ مطلب نہ ہو!
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے!

جناب عارف

یا اللہ عشق اللہ [illegible] ہے جینا

مگر حال یہ ہے۔ گرانی زندگیوں پر بھاری ہے، سردیوں کی گرم بازاری ہے۔ سالِ رواں تشریف لے جا رہے ہیں، میاں رمضان دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں۔ ایسے میں جی چاہا آپ سے کچھ گپ شپ کر لوں، بزرگوں کی دعاؤں سے دامنِ مراد بھر لوں۔ لکھنا لکھانا ہم دیوانوں کا فرض ہے لہٰذا علمِ صنائع میں سے صنعتِ لغز پر آج کچھ عرض ہے۔

لغز کے لغوی معنی ہیں جنگلی چوہے کا سوراخ یا بل اور چونکہ یہ سوراخ نہایت پیچیدہ ہوتا ہے، اس لئے یہ ایک قسم کے مبہم کلام کا نام ہوگیا جس کو فارسی میں چیستاں اور اردو یا ہندی میں پہیلی کہتے ہیں۔ چیستاں، چیست آں سے ہے یعنی جس کو سن کر آدمی اس کے معنی مفہوم پوچھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایں چہ معنی دارد؟

آپ کی دلچسپی کے لئے چند پہیلیاں درج ذیل ہیں ان کو پڑھ کر لطف و حظ اٹھائیے گو آپ ان سے آشنا ہی کیوں نہ ہوں؟ ع

لطفِ ایں مے ز شناسی بخدا تا نہ چشی

امیر خسرو کہتے ہیں ؎

زنگش چو رنگِ زعفراں
بریاں چو جانِ عاشقاں
(۱) پا دارد و بے سم بہ داں (پاپڑ)
جاناں بگو ایں چیستاں؟

گر مہ شود مہ را ستارہ شود بری
(۲) باخوانِ نعمت تو کند کے برابری (بڑا بڑی)

(۳) جا بیٹھے بوٹ چلے
اور آ کے بیٹھ رہی (تالی)
امیر خسرو یوں کہیں کہ
بوجھ پہیلی موری!

بہادر شاہ ظفر کہتے ہیں ؎

ایک تھال موتیوں سے بھرا
سب کے سر پر اوندھا دھرا
چاروں طرف وہ تھال پھرے ۔ موتی اس سے ایک نہ گرے
(آسمان اور تارے)

تجلی صاحب فرماتے ہیں ؎

کان میں رکھ تو یہ ابہام
(۵) نیچے لٹکے اوپر نام (بالا

شاد عظیم آبادی کا شعر ہے ؎

برسوں نہ منہ لگاؤ تو وہ بھی رکی رہے
(۶) پہلو میں دو جگہ تو قدم پر جھکی رہے (زلو

کوئی صاحب بنسی کہتے ہیں ؎

پیپل کی کونپل ڈوبے اور ہاتھی کھڑا نہائے
بنسی غریب پیاسا جا کر پیاسا واپس آئے (اا

(۷) چونچ نہ ڈوبے گھڑا نہ پھوٹے چڑیا پیاسی جائے
ایک اچنبھا ایسا دیکھا ہاتھی کھڑا نہائے

تو بھی بنی ہے دھاگے سے اور میں بھی بنا ہوں دھا
(۸) تو کھلتی ہے پیچھے سے میں کھلتا ہوں آگے سے
(دھوتی اور پاجامہ)

ایک کے کرے دو اور دو کے کرے چار
(۹) جتنے چاہیں دو دو کرے ایک ہو یا ہزار (آئ

زلف میں جکڑا ہوا ہوں پیر میں زنجیر ہے (رگتا
گھاٹ کا اترا ہوا ہوں قتل کی تدبیر ہے

(۱۰) امیر خسرو ؎

بیسوں کا سر کاٹ لیا
نا مارا نا خون کیا (نہرنی)
سر پہ پتھر منہ میں انگلی (انگوٹھی)

(۱۱) ہاں اقبال کا یہ مقطع بھی اسی صنعت سے متعلق ہے

اقبال میرے نام کی تاثیر دیکھنا
میں جس کے ساتھ ہوں اسے ہوتی نہیں شکست!

آں سخت کوش کیست کہ گرد ز سنگ آب
اقبال محتاجِ خضر مثلِ سکندر نمی شود (شمشیر)

غسل گناه دیده نمناک پاک کرد
در جوئے آب و دامن او تر نمی شود

گلشن میں ایک پیڑ ہے جس کو نہیں ہے چین
باہر غم حسن ہے تو اندر غم حسین (مہندی)

ایک ڈبے میں بارہ خانے
ہر خانے میں تیس تیس دانے (سال)

ایک قلعے میں نو دس پریاں
آپس میں سر جوڑے کھڑیاں (نارنگی)

زیادہ چہ؟ از تو نازے و از من نیازے — نجمی
۱۷ فروری ۱۹۶۶ء

ع دگر از سر بگیرم قصۂ زلف پریشاں را

جناب من السلام علیکم۔ مزاج شریف؟

شعر کے سحر کن اثر سے یہ نہیں کہ صرف حضرات شعراء ہی متاثر ہیں بلکہ سیاست داں، حکیم، ادیب، فلسفی، مفکر، مورخ، عالم، خطیب اور صوفی بھی اس سے کافی اثر لیتے اور عالم خلوت و جلوت میں اپنے پسندیدہ اشعار (یا شعر) اکثر گنگناتے رہتے ہیں۔ یہ اشعار شاید ان کی سوانح حیات کے آئینہ دار ہوتے ہیں جن کے اعادہ سے ان بخیۃ مغزانِ جنوں کے بیقرار دل کو یک گونہ تسکین ہوتی ہے۔ نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے اشعار میں ایک طرح کی پیش گوئی مضمر ہوتی ہے اور وہ بسا اوقات الہام کی طرح سچے ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں ان کے ایک ہم مکتب دوست سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ لال بہادر شاستری آنجہانی اپنے اسکول لائف کے زمانے میں مرزا غالب کا یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے۔

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

دیکھئے تو بدقسمتی سے غالب کا یہ شعر شاستری جی کے معاملے میں کس قدر سچا ثابت ہوا۔ کیونکہ تاشقند میں ان کی موت واقع ہوئی جہاں ان کا کوئی رشتہ دار تیمارداری کے لئے موجود تھا نہ نوحہ خوانی کے لئے!

اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو جو ایک سیاس، ادیب، مفکر، مورخ اور مقرر تھے، اپنی تقریروں میں کسی کا یہ شعر اکثر دہراتے رہتے تھے۔

اس طرح طے کی ہیں ہم نے منزلیں
گر پڑے گر کر اٹھے اٹھ کر چلے!

چونکہ سیاسی جد و جہد ان کے پیش نظر تھی، اس لئے یہ شعر ان کے بالکل حسب حال تھا۔

ہندوستانِ جنت نشان کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کا شعر ہے

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

خدا کی شان کہاں اس بدنصیب بادشاہ کے آبا و اجداد کا وطن ہندوستان؟ اور کہاں وہ دیارِ غیر برما کا کوہستان؟ کہاں دلی اور کہاں رنگون! فاعتبروا یا اولی الابصار! ع

بیچے آب و دانہ دوم خاک گیر!

مولانا محمد علی جوہر کا مرقوم الذیل شعر ان کی غریب الوطنی کی موت کی گویا ایک زبردست پیشین گوئی تھی۔ انگریزوں کی سامراجی حکومت سے مخاطب ہو کر انھوں نے بھی کہا تھا

تو بچ سکو مواخذۂ حشر سے وہاں
مارو دیارِ غیر میں ہم کو وطن سے دور

قدرت کے کرشمے کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں مدعو ہو کر ایک ولولہ انگیز تقریر کے بعد انھوں نے لندن میں انتقال فرمایا اور مدفون ہوئے بھی تو کہاں؟ بیت المقدس کی سرزمین پاک میں۔ سچ ہے یہ بھی اپنی نیک نیتوں کا ثمرہ ہے!

وما تدری نفس بای ارض تموت۔ آیت شریف ہے کہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ کس زمین میں مرے گا۔

علامہ اقبال کی زندگی سے جب ڈاکٹروں نے قطعی مایوسی کا اظہار کر دیا تو ان سرگوشیوں کا حال علامہ موصوف کو بھی معلوم ہو گیا مگر آپ مطلق پریشان نہ ہوئے بلکہ کہا تو یہ کہا کہ "میں مسلمان ہوں اور موت سے نہیں ڈرتا۔" پھر اپنا یہ فارسی شعر دہراتے رہے۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

دیکھا آپ نے ایمان و یقین کا کیا جذبہ بے پایاں تھا! اللھم توفنی مسلما و الحقنی بالصالحین۔ آمین!

(بقیہ صفحہ ۲۸ پر)

ڈاکٹر نریش

ہندی ادب میں مسلمانوں کا حصّہ

مسلمان جب مستقل طور پر ہندوستان میں آباد ہو گئے اور ہندوستانی کے ساتھ ہندوستانی روایات کو حاصل کرنے لگے۔ تب اظہار خیال کے لئے انھوں نے جس زبان کا انتخاب کیا وہ انکی مادری زبان نہ تھی۔ بلکہ ہندوستانی زبان تھی۔ جو شعراء زبان کے زور سے اپنی علمیت کی دھاک جمانا چاہتے تھے۔ ان کے ہاتھ تو فارسی کے روایاتی استعارات و تشبیہات کے لئے پھیلے رہے۔ لیکن جو جذبات کی گہرائی میں ڈوب کر دلی احساسات کی ترجمانی کرنا چاہتے تھے انکی انانیت نے کہیں سے کچھ مستعار لینا گوارا نہ کیا۔ لہٰذا ان کے پاؤں سر زمین ہند پر ہی ٹکے رہے۔ اگرچہ اپنے کلام کو دلکش بنانے کے لئے ان کے پاس عرب اور ایران کی مذہبی و معاشی روایات موجود تھیں لیکن ان کے کلام کی بنیاد ہندوستانی زندگی ہی بنی۔ ہندی شاعری کی تاریخ عبدالرحمٰن، امیر خسرو، ملک محمدؐ جائسی، رحیم، منجھن اور رسکھان جیسے مسلمان شعراء کے بغیر نامکمل ہے۔ عبدالرحمٰن کی تصنیف "سندیش راسک" کو جہاں ہندی کا اولین مجموعۂ کلام ہونے کا شرف حاصل ہے وہاں کلام امیر خسرو کے متعلق بھی اکثر محققین کی یہی رائے ہے۔ دونوں میں سے کسی کتاب کو بھی ہندی شاعری کی پہلی کتاب تسلیم کر لیا جائے۔ یہ تو طے ہے کہ ہندی شاعری کا موجد مسلمان ہی تھا۔ جائسی کی تصنیف "پدماوت" کو ہندی شاعری کی عظیم کتاب مانا جاتا ہے۔ لیکن ان گنے چنے ناموں پر ہی اکتفا کرنا مسلمانوں کے ساتھ ہی نہیں ہندی شاعری سے بھی ناانصافی ہے۔ یہاں ہم ایسے مشہور شعراء کا نہیں بلکہ ان شعراء کا ذکر کریں گے جنھیں تاریخ دانوں نے وہ مقام نہیں دیا جو ان کا حق ہے۔ ہندی ادب کی ابتدا سے لیکر آج تک کے مسلمان شعراء کا تذکرہ ایک طویل سلسلہ بن سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا دھارا ہے جو آج تک رواں ہے، راستے میں کہیں تھما نہیں، رکا نہیں مسلسل بہتا چلا آ رہا ہے۔

سنہ ۱۴۸۶ء میں مکہ میں پیدا ہو کر بچپن میں ہی ہندوستان چلے آنے والے شاعر شمس العشاق شاہ میرانجی نے پانچ تصانیف سے ہندی ادب میں اضافہ کیا ہے۔ یہ تصانیف ہیں (۱) خوش نامہ (۲) خوش نغز (۳) شہادت التحقیقت، (۴) شرح مرغوب القلوب (۵) سب رس۔

خوش نامہ میں جہاں دنیاوی علامتوں کے ذریعہ سے روحانیت کے پیچیدہ مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ وہاں خوش نغز میں توکل، فکر، محبت اور ذکر۔ عبادت کے چار پہلوؤں پر روشنی ڈال کر صوفیوں کے طریق عبادت کی تشریح کی گئی ہے۔[1] مثلاً

سہ تجھ بن اور نہ کوئی تا خالق دوجا
یے تیرا ہوئے کرم تو تو نے سبھی جیرم
اس کارن تجھ کو دھیاؤں اور ترا نام لوں
تجھ سا رتا کون تجھے اور پوری صفت بکھانے

آپ کے بعد دوسرے اہم شاعر شاہ برکت اللہ پریمی ہیں۔ آپ کی پیدائش سنہ ۱۶۶۰ء میں بمقام سری نگر ہوئی۔ ایسا آپ ہی کی تصنیف "پریم پرکاش" سے معلوم ہوتا ہے۔ سہ

---

[1] سنڈے ایم۔ رادھا کرشنن۔ ساپتہ سندیش۔ مئی ۱۹۶۰ء

ہم باسی اس ری نگر کے آئے ہے سب چھوڑ
مادہیرے نگر میں یہاں شاہ نہیں چور

آپ کی مشہور تصنیف "پریم پرکاش" فارسی رسم الخط میں دستیاب ہوئی تھی۔ جسے ۲۰۰ برس کے بعد جناب لکشمی دھر شاستری نے دیوناگری میں منتقل کیا۔

اس کتاب کی نظمیں روحانیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ بھگتی اور پریم کو اہمیت دی گئی ہے۔[1] پریمی کے کلام کی نمایاں خصوصیت آفاقیت ہے آپ کے کلام میں ایک بیدار ہندوستانی، درما کر دیتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ہوں چکوی وا سندھو کی جہاں نہ سُرج چند
رات دویں نہیں ہوت ہیں نہ سکھ ناہیں انند
من بھورا بھنات نت تم سکھ انج کا نج
جیوں پتنگ پر دیپ سوں جات نہ کب ہو لاج
ہوں چاہوں پیا پکڑوں درہا پکرے پائے۔
ویر ہو تی جی سدا سمٹ سمٹ رہ جائے
اُٹ سادن ات ین ہیں اُٹ گرجن اُت آہ
اُنہوں لوک ات ہر کسے سکو نہ ہوں بچاہ

صوفی شاہ نامی ایک اور شاعر نے ہندی ادب میں اضافہ ہی نہیں کیا۔ بلکہ حضرت محمدؐ کو کرشن کے روپ میں پیش کر کے اور انہیں نورِ مجسم ثابت کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مذہبی ہم آہنگی پیدا کر کے انہوں نے پریم کی ڈور سے باندھنے کی شاندار کوشش بھی کی ہے۔ سید مرتضیٰ نے بنگلا اور ہندی کو قریب لانے کی سعی کی تو قاضی چاند نے زبانِ بنگلا میں ہندی الفاظ کا استعمال کر کے اسی کوشش کو تقویت دی۔ نصیر نے اگم نگم کو بنیاد بنا کر روحانیت کی تفسیر پیش کی تو عادل نے کرشن کنھیا کے روپ پر عاشق ہو کر ان کی مرلی کی تان کو کلام میں بھر دیا۔ ان کے علاوہ ملا داؤد نے "چنداین" سے ہندی ادب کو نوازا تو رزق اللہ نے مختلف تصانیف سے ایوانِ ہندی کو سجایا۔ حفیظ اللہ خاں نے بھی متعدد تصانیف سے ہندی ادب کو نوازا جن میں "نو رتن سنگرہ" "سفر دو" "کادیہ سنگرہ" "پریم ترنگنی" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

نظیر اکبر آبادی کو شاید اس لئے ہندی کی اوجینتی میں مقام نہیں دیا گیا کیونکہ ان کا کلام فارسی رسم الخط میں موجود ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ نظیر کی خدمت ہندی کو نظر انداز کرنا بڑی زبردست غلطی ہے۔

نظیر آبادی نے مسلمان شعراء کو ہندوستانیت کی راہ دکھائی اور متعدد دیوی دیوتاؤں، اوتاروں، ہندوستانی، موسموں، پہاڑوں، ندیوں اور مقدس مقامات پر نظمیں کہہ کر ادب میں نئے رجحانات کو جگہ دی اور شاعری کو نئے مضامین سے روشناس کر دیا۔ انھوں نے گنگا نہا کر نماز پڑھی تو روزہ رکھ کر آرتی اتاری، شری کرشن سے متعلق ان کی نظم کا اقتباس ملاحظہ ہو:

تعریف کروں اب میں کیا کیا اس مرلی ادھر بجیا کی
نت سیوا کنج پھریا کی اور بن بن گؤ چریا کی
گوپال بہاری بنواری دکھ ہارن مہر کریا کی
گِردھاری سندر شیام ورن اور ہلدھر جو کے بھیا کی[1]

اور پاروتی سے متعلق ایک نظم میں فرماتے ہیں:

اس راجہ ہماچل کے گھر میں اک بالی سندر بیٹی تھی
کہ اس کا چندر رگن کا تھا نام اس کا گورا پاربتی[2]

دورِ حاضر میں بھی متعدد مسلمان ہندی شعراء کے علاوہ اردو میں شعر کہنے والے بیسیوں ایسے شاعر ہیں جنہوں نے ہندی زبان میں نظمیں کہی ہیں۔ لیکن ہندی ادب کے تاریخداں اور محققین فارسی رسم الخط سے بے بہرہ ہونے کے باعث ان کے کلام سے لطف اندوز ہونے سے محروم رہتے ہیں۔ لہٰذا ان کے ہاتھوں ان حضرات کا ذکر ہونا ممکن ہی نہیں

---

[1] ماسک جھلک، مئی ۱۹۶۵ء۔

[1] نظیر اکبر آبادی۔ "کنھیا جی کا کھیل کود"

[2] نظیر اکبر آبادی۔ "مہادیو جی کا بیاہ"

۶۔ پاکستان کے کئی شعراء ہندی میں شعر کہتے ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

جاگ سہیلی آنکھیں کھول کر جاگ سنبھل کر
او البیلی جاگ سہیلی
دیکھ وہ اٹھ کر گیا ندی پر
ساجن تیرا نیند کی ماتی اپنی سیج سے[1]
قتیل شفائی

ساری سمجھے گھونگھٹ پیچھے ہوگا چاند سا مکھڑا
گھونگھٹ کے پٹ کھلے تو نکلا مرجھایا سا مکھڑا

. . . .

نئی نویلی کا یہ سواگت نیند نہ سانس نہ دیور
میکے سے بھی کیا لائی ہے کھوٹ کے پیلے زیور[2]
قتیل شفائی

اندھیارے کا درپن ٹوٹا پورب نے پوربساتی
انگارے کا جھومر پہنے اوشا نے لی انگڑائی
جنگل مہکے بھینی بھینی ہلکی ہلکی پروائی[3]
احمد ندیم قاسمی

یقیناً ان مسلمان شعراء نے اسلام اور ہندو مذہب کے درمیان کے فاصلے کو کم کرنے کی قابلِ داد کوششیں کی ہیں۔ فن سے متعلق کرشمہ سازی سے قطع نظر انہوں نے آفاقیت کا راستہ اپنایا ہے۔

فارسی تلمیحات و تشبیہات یہاں اجنبی نہیں رہتی ہیں بلکہ ایک ایسی ڈور بن جاتی ہیں جن سے مغرب اور مشرق بندھ گئے ہیں۔ نئے نئے الفاظ تراش کر زبان کو قوت دی ہے اور ہندی زبان کو مثنوی کا انداز بخشا ہے۔ ان شعراء نے تنگ نظری کے میل کو اپنے کلام کی نفاست سے دھو کر تشنہ ذہنوں پر چندن کا لیپ کیا ہے۔

---

[1] قتیل شفائی۔ مجر۔ صفحہ ۱۶ (۲) قتیل شفائی۔ مجر۔ صفحہ ۸۰
[3] احمد ندیم قاسمی۔ جلال و جمال۔ صفحہ ۹۴

بقیہ "شعاعوں کی صلیب" ص ۱۶

عبدالمغنی

پٹنہ۔ ۳ر نومبر ۱۹۶۲ء

برادرم! السلام علیکم ورحمتہ اللہ

تحفۂ کلام ملا۔ اس عنایت کے لئے شکریہ۔ آپ کے اشعار کے مطالعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کو زبان و بیان پر قدرت ہے۔ اور عصرِ حاضر کے احساسات و افکار سے بھی آپ کی کافی واقفیت ہے۔ لیکن اس ثروتِ سخن و ذہن کا پورا فنی استعمال آپ ابھی تک نہیں کر سکے ہیں۔ میرے خیال میں دو باتیں آپ کے فن کے فروغ کی راہ میں حائل ہو رہی ہیں۔ اوّل یہ کہ آپ نے نظم آزاد کی ہیئت کو خواہ مخواہ اپنے غالب وسیلۂ اظہار کے طور پر اختیار کر لیا ہے۔ جبکہ آپ پابند نظم کی ہیئت میں بہتر فن کاری کر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ اس پہلو سے بھی غور کیجئے کہ فی الحال ابھی پابند نظمیں بہت ہی کم کہی جا رہی ہیں۔ اور آزاد نظم تو ہمارے ادب میں شاید STILL BORN ہے۔ چنانچہ اگر آپ اپنی فنی صلاحیتوں کو پابند نظم نگاری پر مرکوز کریں تو اردو شاعری کے دورِ جدید میں یہی آپ کے لئے ایک امتیازی مقام کا باعث ہوگا۔ دوسرے یہ کہ آپ کا "جگر" ابھی تک "خون" نہیں ہوا ہے۔ اس لئے آپ کے کلام میں وہ سوز اور جوش کی وہ کیفیت ناپید ہے جس کے بغیر اہم شاعری نہیں کی جا سکتی۔ شاید خونِ جگر زندگی کا ایک اعلےٰ نصب العین ذہن و قلب میں جاگزیں ہو جانے سے پیدا ہو۔ صفحہ ۷ کے آخر میں آئن سٹائن کے نظریے کے بارے میں آپ نے جو بات لکھی ہے اس کی تفصیل کا مجھے تجسس ہے اس موضوع پر کوئی کتاب؟ صفحہ ۲۲ پر نظریۂ امکانات کے متعلق بھی تفصیل چاہتا ہوں۔ خدا کرے آپ بخیر ہوں۔

عبدالمغنی

محسن جامی

میرے نغمے

میں اُن نغموں کا خالق ہوں
جنگل جنگل جن کو اب تک گاتا آیا
صدیوں سے ہر ایک گڈریا
گاتا آیا بستی بستی پیار کی دھن پر
شہروں شہروں سارا زمانہ
نطق سے میرے
جو آواز بھی نکلی اب تک
سیدھی سچی میٹھی کر دی
ایک امانت جان کے میں نے
لفظوں کو پیکر دے دے کر
آج اس قابل کر ڈالا ہے
اب خود آنکھ ملا کر مجھ سے
ایک اک نغمہ پوچھ رہا ہے
(شہرت پا کر)
کیا تم ہی خالق ہو میرے
اب میرے نغمے بھی گویا میرے نہیں ہیں
اب تو یہ میراث ہیں سب کی۔

★ ★

انیس الرحمن۔ ایم۔ اے

جان پہچان

راستوں پر ہزاروں چہرے ہیں
جن کے اپنے جدا جدا خد و خال
جن کی اپنی الگ الگ رنگت
اور اگر ان میں کوئی بھی چہرے
چلتے پھرتے اِدھر اُدھر سے کہیں
سامنے آئے اور گزر جائے
ان کی تصویر اپنی آنکھوں میں
نقش ہوتی ہے۔ اور اسی صورت
جان پہچان ہونے لگتی ہے۔
اور اسی طرح اپنی آنکھوں سے
چند ایسی بھی صورتیں ہیں جو
ذہن کے بیکراں سمندر میں
دھیرے دھیرے اترنے لگتی ہے
جیسے اپنے ہی گھر کا کوئی فرد
یا کوئی اپنا بے تکلف دوست۔
اپنی آنکھوں کی روشنی بن جائے
اور اگر گھر میں بیٹھے بیٹھے کبھی
یا کبھی راستوں پہ چلتے ہوئے
ان سبھی صورتوں سے جی گھبرائے
اور پھر اک اداس لمحے میں
اپنی صورت کا دھیان آجائے
اپنی مجبوریوں پہ سوچیں ہم
سب کو پہچانتے تو ہیں لیکن
خود کو پہچان ہی نہیں پائے۔

★ ★ ★

شاعروں کی صلیب

معاصرین کی نظر میں

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی

۳۳، ذاکر باغ، علی گڑھ
۹؍ نومبر ۱۹۷۲ء

محبی تسلیم۔

"شاعروں کی صلیب" کا تحفہ عین عید کے روز موصول ہوا کیا بتاؤں کس قدر خوشی ہوئی۔ آپ کے حالات میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھے۔ آپ کی ادبی سرگرمیوں کی روداد معلوم کر کے مسرت ہوئی۔ یوں تو اس مجموعے کی سب نظمیں اور غزلیں آپ کی شاعرانہ شخصیت کی مناسب اور موزوں ترجمانی کرتی ہیں۔ مگر مجھے چند نظمیں بطورِ خاص پسند آئیں۔ وہ نظمیں یہ ہیں۔

"بے وزنی کا احساس، ایک کیفیت، سرگذشتِ سفر، گم گشتہ گھر، تناسخ اور خاک کے مجموعے کی اشاعت پر میری دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ خیر اندیش۔

خلیل الرحمٰن اعظمی

رام لعل

لکھنؤ۔ ۲۳؍ دسمبر ۱۹۷۲ء

برادرم آداب۔

آپ کی کتاب مل گئی تھی۔ رسید بھجوانے میں بہت دیر کر دی ہے نا۔ آپ نے اڑیا ادب میں جو دلچسپی دکھائی ہے۔ اور اُس زبان کے ادب کو اردو میں پیش کر کے جو خدمت کی ہے وہ بیحد قابلِ قدر ہے۔ اس سلسلے میں آپ کے سارے مضامین اور ترجمے میری نظر سے گزرتے رہتے ہیں۔ اس مجموعے میں بھی آپ نے کچھ نظموں کے ترجمے شائع کر کے کتاب کو متنوع بنا دیا ہے۔ آپ کی طبع زاد نظمیں پھر سے ایک تسلسل سے پڑھنی ہیں۔ آپ نئی نسل کے ایک باشعور اور حساس شاعر و نقاد ہیں یہ کہنے میں مجھے کوئی تردد نہیں ہو رہا ہے۔ آپ نے جو طویل دیباچہ لکھا ہے۔ اسے بھی میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھا ہے۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔

آپ کا

رام لعل

ڈاکٹر محمد حسن

سری نگر، ۱۰؍ اکتوبر ۱۹۷۲ء

کرامت صاحب کرم

آپ کے باکرامت ہونے کا مدت سے قائل ہوں۔ نام نہاد جدیدیت کی جہلیت کے طوفان کا آپ نے پامردی سے مقابلہ کیا۔

آپ نے شعری مجموعے کی اشاعت پر یاد فرمایا۔ اس کا شکریہ۔ اس
آپ کی لطافت احساس کا ثبوت ملا۔ افق تا افق کی نظمیں نادر
کتنا قاتل خوب ہیں۔ البتہ تکرار اور بے جا وضاحت سے احتراز
کریں تو اچھا ہے۔ غزلوں کے بعض اشعار پوری پوری نظموں پر
بھاری ہیں۔ خاکسار
محمد حسن

فضا ابنِ فیضی

مئونات بھنجن۔
یکم دسمبر ۱۹۷۲ء

برادرِ گرامی۔ سلام فراواں
آپ کی نذر کردہ ادبی سوغات "شعاعوں کی صلیب"
بدست ہوئی۔
شعاعوں کی صلیب آپ کے تخلیقی سفر کا پہلا سنگ میل ہے
نظمیں ہوں یا غزلیں، فکر کی تازگی، اسلوب کی بلاغت، اور
فکر و ادب میں عصری حیات و حقائق کا امتزاج بڑا خوش کن
ہے۔ آپ نے جو کچھ کہا ہے۔ پورے شعور اور خود آگہی کے ساتھ کہا
ہے۔ اور فنی تلازموں کے ساتھ۔ یہ خود آگہی اور روش سب کے
بس کی بات نہیں۔ اہل نظر اس کی داد دینے پر مجبور ہوں گے۔
تنگ نظری اور گروہ بندی کی اور بات ہے کہ اس نے ہمارے
ادب کو بہت نقصان پہنچایا ہے اور کتنوں کو نظر انداز کر دیا ہے
فضا ابن فیضی

کرشن موہن

دہلی ۱۰ ر نومبر ۱۹۷۲ء

محب مکرم۔ تسلیم!
"شعاعوں کی صلیب" آپ سے تو آج ملی۔ لیکن ایک
ہفتہ پہلے شل صاحب کی کاپی دفتر تحریک سے اٹھا لایا تھا۔
اور اب تک اس کے اکثر صفحات پڑھ کر لطف اندوز ہو چکا ہوں۔
اس مجموعے میں شگفتگی کے ساتھ پختگی بھی جلوہ گر ہے۔ مندرجات
کی بوقلمونی اور تنوع سے بنہایت متاثر ہوا ہوں۔ شاعر کے
سالنامے میں آپ کا دلچسپ اور فکر انگیز مقالہ بھی پڑھا:
"شعاعوں کی صلیب کو عصر حاضر کے چند اچھے مجموعوں میں شمار
کرتا ہوں۔"
خلوص و احترام
کرشن موہن

ڈاکٹر طلحہ رضوی برق

آرہ،
۱۴-۱-۷۲ء

مکرمی و محترمی کرامت صاحب سلام عقیدت
رمضان المبارک کی چاندرات برادر محترم حفیظ بنارسی صاحب
نے اپنے ذرِ نظر کی معرفت "شعاعوں کی صلیب" بھیجی۔ دیکھتے ہی
کھل اٹھا۔ آپ کے اس مبارک تحفہ نے مجھے کتنی شادمانی اور
لذتِ دل و نگاہ کا سامان فراہم کیا۔ کن الفاظ میں عرض کروں؟
بظاہر رسمی و روایتی الفاظ میں پرخلوص ہدیۂ تبریک و تشکر
پیش کرتا ہوں۔ یقین کیجئے۔ یک نشست دیباچہ نظمیں اور
غزلیں پڑھ گیا۔ تراجم ابھی نہیں دیکھ سکا ہوں۔ محاسن
صوری و معنوی کا اتنا دلکش و جاذب توجہ مجموعہ شاید اب تک
سامنے نہ آیا ہو۔۔۔۔۔
صائب تبریزی کا اپنے سبک کا بادشاہ ہے لیکن جب اس نے
غنی کشمیری کا یہ شعر سنا۔

حسنِ سبزے بخطِ سبز مرا کرد اسیر
دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدیم

تو نازاں بیٹھا تھا اور روایت یہ بھی ہے کہ شعر سن کر وہ غنی سے
ملنے ہندوستان آیا اور اس شعر کو غنی سے اپنا دیوان دیکر خریدنا
چاہا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے غالب نے مومن کو ان کے شعر۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کے موضوع اپنا دیوان پیش کرنا چاہتا تھا۔ خیر یہ تو بزرگوں کی بڑی
آئیں تھیں۔ کوئی اپنے رنگِ سخن کا عاشق تھا، کوئی اپنی
معنی آفرینی کا شیدا۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ یہاں تو حالات
کا الٹ، احساسات و مدرکات کی شدت ہی فنکاروں کی
جان ہے۔ میں "شاعروں کی صلیب" پڑھتا ہوا جب صفحہ
۱۱۲ کی غزل "خودی کا سانپ، زندگی کا تشنہ پرینے" تک پہنچا تو بخدا یہ معلوم ہوا
تھا جیسے یہ میرے اپنے اشعار ہوں۔ یہ اشعار آپ بیتی ہی نہیں
جگ بیتی کے حامل ہیں۔ اپنی تمہید کے پیش نظر چھوٹا منہ بڑی
بات۔ جی بے اختیار چاہا کہ یہ غزل ہی آپ سے مانگ لوں۔
غیر سے مقطع بھی غائب ہے۔ گرچہ بدل اشتراک کے لائق ایک
مصرع بھی اپنی تحویل میں نہیں۔ ممکن ہے کوئی احساسات کا
کوراس غزل کو پڑھ کر یہ پھبتی بھی کہے کہ یہ غزل تو غالب و
ذوق کے عہدِ ذہنی جمناسٹک کی یادگار ہے اور مثال میں
نقاب میں سانپ اور شراب میں سانپ والی مشہور غزل
پیش کرے، مگر حقیقت یہ ہے کہ موجودہ معاشرے میں ایک
باشعور اور حساس انسان کے دل کی ایک ایک کسک اور
ہر تڑپ منعکس ہے۔ معتدل و متوازن جدیدیت آپ جس کے
علم بردار ہیں، ٹکسال باہر سانچوں (گمراہ جدیدیوں کے
نزدیک) میں بھی نئے اور رائج الوقت سکے ڈھال سکتی ہے۔
یہ غزل اس کا ثبوت ہے۔ پوری غزل ایک متموج UNDER CURRENT کی حامل ہے۔ جو صنفِ غزل پر مشہور طعن
کلیمی کا رد بھی ہے۔ چھٹے شعر کے متعلق تو آپ نے خود دیباچے
میں اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ میں کیا بتاؤں کب تک اس غزل
سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

آپ کی غزلوں میں تمام کیف سامانیوں کے ساتھ ساتھ
غم اور حزن کی جو حلاوت اور رنگینی ملتی ہے اس سے معلوم ہوتا
ہے کہ آپ کا لاشعور زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں ایک گہری
چوٹ کا اثر لے چکا ہے۔ یہاں پر میں محترمی حرمت الاکرام
صاحب کی گرانقدر رائے سے کامل اتفاق کرتا ہوں ہر چند کہ
آپ نے اپنی اب تک کی زندگی کو ANALYSE کر کے پیش کیا ہے۔
جذبات حقیقی کی اساس "غم" ہی ہے اور یہ نقطۂ غم کائنات
کو محیط ہے۔ اسی غم کی دھیمی دھیمی آنچ زندگی کے ہر رخ کو
نکھارتی ہے، سنوارتی ہے۔ افسوس کہ یہ غم اور اس کا ادراک
سب کا مقدر نہیں۔ میں یہ کہنے میں قطعی کوئی جھجک محسوس نہیں
کرتا کہ دنیائے شعر و ادب میں اگر آپ کا کلام باقی رہا تو اسی
مایۂ غم کے طفیل، کیونکہ یہی قدر قدرِ اول ہے۔ کون ہے جو ان
اشعار کی حرارتِ عزیزی سے انکار کرے گا۔
ڈاکٹر کلتوں کو مجروح یہ کر سکتا ہے سنگ تو نے ابھی دیکھا ہی نہیں
کوئی مزدور ~~بھی اگر غم~~ کو میں پیکرِ شعر ہی میں ڈھالوں۔

چبھو کے سینے میں اپنے نشتر
ترانہ گاتا ہوں سرخوشی کا

ہم نے ہی رنگ گلستاں کو نمک بخشا ہے
گل کا یہ رنگ نہ تھا خونِ جگر سے پہلے۔

خوشی بھی آئی تو غم کا لبادہ اوڑھے ہوئے
نقاب درد سمجھ لیجئے مسکرانے کو

سپری ہے ساتھ لئے، آرزو کی دریا اپنی
نشاط کرب میں ڈوبے ہوئے فسانے کو

آخر یہ نشاط کرب کیا ہے؟ لذتِ آزردگی غم ہی تو ہے جو
باعثِ سکون بھی ہے۔

غم کے سائے میں کچھ سکون ملا۔
ورنہ ہر سمت خشک صحرا ہے۔

یہ آرزو ہے کہ جینے کا جو اہتمام کریں
رسومِ عشق کو سارے جہاں میں عام کریں

یہ عشق جو بنیادِ کائنات ہے۔ حکیم و طبیب روحانی حضرت
رومی مثنوی شریف میں فرماتے ہیں۔ سہ

جذاء اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما

وہ دل جو رسومِ عشق کو عام کرنے کی تمنا اور حوصلہ رکھے دل زندہ

ہے اور تو ہرگز نہ رسد تا نگردش زمہ عشق" ۔ یہ عشق کی تفسیر کا مقام نہیں۔ کہاں تک آپ کا قیمتی وقت ضائع کروں۔

آپ کے یہاں آگہی و شعور آگہی کی جو بے رش و تیزی ہے یہ سامانِ کرشمہ اسی کا ہے۔ آگہی، حجابات نظر دور کرتی ہے۔ آشوبِ وقت نے ہمیں کچھ ایسا نڈھال کیا ہے کہ آگہی کی آگہی کا غم بھی نہیں۔

آپ کا شعر پیش نظر ہے ۔

شاید ہے اس پہ وقت کے آشوب کا اثر
کس درجہ ہے نڈھال غم آگہی کا ناگ

حالات کی کتنی سچی ترجمانی ہے۔ اس شعر میں، شعور و آگہی عجیب دولت ہے۔ "یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا" اور انجام آگہی وہی غم آگہی۔

میں محسوس کر رہا ہوں کہ "شعاعوں کی صلیب" نے مجھ پر جو مثبت اثر چھوڑا ہے اس کے تحت بس نہ جانے کیا کیا لکھے چلا جا رہا ہوں بیچ چلتے چلتے آگہی پر بات آگئی ہے تو اپنی ہی غزل کا ایک مقطع آپ کی نذر کرتا چلوں۔ میری یہ غزل شاید "کتاب" میں بہت پہلے شائع ہو چکی ہے۔

اے برق آگہی نے اک انگڑائی سی جو لی
دیکھا لباسِ حسنِ تمنا مسک گیا

میں پھر آپ کو اس عمدہ و گرانقدر شعری اضافہ پر عمق دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ع

گر قبول افتد زہے عز و شرف" فقط

والسلام مع الاکرام
برق عفی عنہ

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

DELHI - 18/11

برادر عزیز کرامت صاحب

مجموعہ کلام "شعاعوں کی صلیب" مل گیا۔ یاد فرمائی کے لئے ممنون ہوں۔ آپ کی شاعری کا میں ایک مدت سے قائل اور مداح رہا ہوں۔ فراق صاحب کی رائے سے متفق ہوں کہ آپ کا کلام فکر و تامل پر مجبور کرتا ہے ...... والسلام

نارنگ

ڈاکٹر قمر رئیس

دہلی ۔ ۱۸ر دسمبر ۱۹۷۲ء۔

برادرم کرامت صاحب مکرم!

مجموعۂ کلام "شعاعوں کی صلیب" ملا۔ اس نوازش کے لئے بیحد شکر گزار ہوں۔ میں آپ کی شاعری اور تنقیدی بصیرت دونوں کا دلدادہ ہوں۔ گزشتہ چند سال میں جدیدیت کے نام پر برپا ہونے والے طوفانِ بے تمیزی کے خلاف آپ نے جو کچھ لکھا ہے میں اس کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کے مضامین کا مجموعہ بھی جلد ہی منظر عام پر آئے گا۔ نیاز مند،

قمر رئیس۔

بانیؔ

نئی دہلی ۔ ۲۱ر نومبر ۱۹۷۲ء۔

کرامت بھائی، آداب

"شعاعوں کی صلیب" مل چکا ہے (PRODUTION) کے اعتبار سے اس دہائی میں چھپے کسی مجموعے سے کم خوبصورت نہیں۔ سب سے پہلے آپ کو آپ کی نثر کی داد دے لوں۔ اتنی رواں دواں نثر اور آپ کی زندگی کے تمام پہلو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ نظمیں، غزلوں سے کہیں زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ غزلوں میں کہیں کہیں، رہداری کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ ترجمے بھی آپ کی (UNDERSTANDING) اور زبان پر قدرت کو ظاہر کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ مجموعہ کامیاب ہے۔ شاید آپ کو اس کے لئے سچی مبارکباد دیتا ہوں۔

آپ کا بھائی
بانیؔ

بدیع الزماں خاورؔ

آزاد غزل

میرے چہرے میں کیا ڈھونڈتا ہے. یہ تو، ہو سکے تو، میرے دل کی تہ میں اُتر
تجھ کو مل جائیں گے جگمگاتے گہر۔
فصلِ گل آ گئی ہے چمن میں مگر، کیا کسی کو نہیں آ رہا ہے نظر
بُوٹا بُوٹا اگلنے لگا ہے شرر۔
کوئی پتا کھڑکتا نہیں ہے کہیں، جھومنے سے ہیں مجبور شاخ و شجر۔
کیوں ہوا بھی ہے خاموش یہ دیکھ کر؟
سب سے خاموش و ویران بستی ہے یہ، آرزوؤں کی سنسان بستی ہے یہ
کیجئے رات کوئی یہاں بھی بسر۔
روشنی کے لیے دل بجھا کر، دیے جب مکانوں کے اندر جلائے گئے۔
ہو گئے اور تاریک دیوار و در۔
یہ نہ میرے بدن کو جلا پائے گی، ہے یقین مجھ کو گلزار بن جائے گی
آگ میں آج میں کود جاؤں اگر۔
چلتے چلتے یہ رُکتے ہوئے سے قدم، یہ کڑے مرحلے اور یہ پیچ و خم
زندگی بھی ہے جیسے تری رہگزر!
میرے دشمن جو تھے. ڈر گئے سب کے سب، دُور تک برق میدان میں ہرائی، جب
کٹ کے روشن ہُوا میری گردن پہ سر۔
تم کو معلوم ہو تو بتاؤ ذرا، کیوں میرے ساتھ خاورؔ وہ چلتا نہیں
کوئی سچ مچ اگر ہے میرا ہم سفر۔

★ ★ ★

از ظہیر ناشاد دربھنگوی

مغربی بنگال کا تنقیدی سرمایہ

ہندوستان میں مغربی بنگال کی پوزیشن سیاسی، تاریخی اور ادبی اعتبار سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے موجودہ دور میں اردو زبان و ادب کی کوئی بھی تاریخ مغربی بنگال کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں کہلا سکتی ہے جس اردو کی نشوونما میں پنجاب، دکن، دہلی، لکھنؤ اور عظیم آباد کی تاریخی اہمیت ناقابل فراموش ہے اسی طرح مغربی بنگال کی ادبی اہمیت مسلم ہے کیونکہ یہاں کے شاعروں اور ادیبوں نے ہر عہد میں باغ اردو کی آبیاری میں حصہ لے کر اس کو سرسبز و شاداب کیا ہے۔

سیاست کے میدان میں بنگال کی عظمت تو ہمیشہ بلند رہی ہے لیکن ادبی دنیا میں بھی اس کا مرتبہ کبھی پست نہیں رہا۔ بنگلہ اور انگریزی کے علاوہ اردو زبان کی ترویج و ترقی کے علاوہ بنگال نے نمایاں رول ادا کیا ہے۔ بنگال ہی کی خاک سے رابندر ناتھ ٹیگور، قاضی نذر الاسلام، سرت چٹرجی، راجہ رام موہن رائے، سید امیر علی خان بہادر، رضا علی وحشت، ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی جیسی فخرِ روزگار ہستیاں پیدا ہوئیں۔ جن کے پیغامات اور نغمے آج بھی فضاؤں میں گونجتے ہیں۔ ان مشاہیر و قابل احترام ہستیوں نے اپنے افکار و آرا سے نہ صرف بنگال ہی کو بلکہ سارے ہندوستان کو فیضیاب کیا ہے۔ جہاں تک اردو زبان کی ترقی کا تعلق ہے۔ بنگال کے اہل قلم حضرات نے ہمیشہ کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں اور آج بھی مغربی بنگال کے فنکاروں کی ادبی خدمات کسی بھی اعتبار سے ہندوستان کے دوسرے مقامات کے فنکاروں کے مقابلے میں کمتر نہیں کہی جا سکتی ہیں۔

بنگال میں اردو زبان کی نشوونما اٹھارہویں صدی میں شروع ہوئی۔ اردو کی ترویج و ترقی اور تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں جو کام فورٹ ولیم کالج نے تنہا انجام دیا ہے اسے تاریخ اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کا واحد مقصد ایسٹ انڈیا کمپنی انگریز افسروں کو دیسی زبان کی تعلیم دینا تھا چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر لارڈ ولزلی نے اس کالج کا افتتاح ۴ مئی ۱۸۰۰ء کو کلکتہ میں کیا اور ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کی نگرانی میں تصنیف و تالیف اور ترجمے کا الگ الگ شعبہ قائم کر کے اردو زبان کو عام فہم اور آسان بنانے کی مستحسن کوشش کی گئی۔ اوّل تو اس کالج کے قیام کی غرض و غایت چونکہ سیاسی تھی۔ دوئم اس وقت تک اردو زبان و ادب میں تنقیدی شعور عام طور پر پیدا نہیں ہو سکا تھا۔ اس لئے فورٹ ولیم کالج کے اندر تنقیدی ادب پر کوئی کام نہیں کیا جا سکا۔

اردو ادب میں مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ موصوف نے کلکتے سے الہلال اور البلاغ نکال کر اردو صحافت اور انشاپردازی کے میدان میں جو روشن مثال قائم کی ہے اس کی نظیر آج بھی مشکل ہی سے ملتی ہے۔ بنگال ہی کی انجمن سے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، آغا حشر امرتسری، مولانا شاہ خلیل الرحمٰن بی۔ اے، شائق احمد عثمانی اور ان کے رفقاء میں چراغ حسن حسرت کاشمیری، جمیل مظہری، سلیم اللہ فہمی کے علاوہ بھی قاضی عبدالغفار نے اردو صحافت میں گرانقدر خدمات انجام دیتے ہیں اس طرح اردو صحافت کے معیار کو بلند کرنے میں مغربی بنگال کا زبردست ہاتھ رہا ہے۔

یوں تو شروع ہی سے اردو میں ڈرامے بہت کم تعداد میں لکھے گئے

امانت لکھنوی کا ڈرامہ "اندر سبھا" اور سجاد انصاری کا ڈرامہ "محشر خیال" کافی مقبول خاص و عام ہوا۔ لیکن آغا حشر کاشمیری جیسا باکمال اور عظیم ڈرامہ نگار مغربی بنگال ہی کی سرزمین سے ابھر کر ماہتاب و آفتاب بنا جس کی شہرت و عظمت کا سورج کبھی دھندلا نہیں ہو سکے گا۔ اور مغربی بنگال کی پوزیشن ڈرامہ نگاری کی دنیا میں ہمیشہ تابندہ رہے گی اسی طرح افسانہ نگاری میں ل۔ احمد اکبرآبادی کی تخلیقات مغربی بنگال کی نمائندگی کے لئے اب تک حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ محفلِ شعر و سخن میں علامہ وحشت کلکتوی اور حضرت پرویز شاہدی کو ہندوستان کے کسی بھی صف اول کے شعراء کے مدمقابل بلا کسی جھجک کے کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ اگر کلیم ناطق لکھنوی، آرزو لکھنوی اور علامہ جمیل مظہری کو مغربی بنگال کا شاعر مان لیا جائے تو پھر مغربی بنگال کی عظمت کا پلہ بہت زیادہ گراں ہو جائے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان میں ان گنت کامیاب ترجمے کئے گئے ہیں لیکن اگر نظرِ انصاف سے دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ اردو میں ترجمے کا کام خاص طور سے مغربی بنگال میں زیادہ کیا گیا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی پوری تاریخ اس کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی سید امیر رضا کاظمی نے رابندر ناتھ ٹیگور کے مشہور ناول "جوگا جوگ" کا اردو میں ترجمہ "سنجوگ" کے نام سے کیا ہے۔ جس کی قدر و قیمت کی داد اہلِ نظر دے چکے ہیں۔ سن ۱۹۳۸ء میں سالک لکھنوی نے سب سے پہلے ٹیگور کے مشہور افسانے "ماسٹر موسائی" "تین کنیاں" "گھور پھیرا" وغیرہ کا اردو میں کامیاب ترجمے کر کے اردو داں طبقہ کی توجہ بنگالی زبان کی لطافت و شیرینی کی جانب مبذول کرانے کی کوشش کی ہے۔ اس سے پہلے غالباً ٹیگور کی صرف شہرۂ آفاق کتاب "گیتانجلی" کا ہی اردو میں ترجمہ کیا جا سکا تھا۔ ل۔ احمد اکبرآبادی نے بھی روسی زبان کے کئی افسانے اور تنقیدی مضامین کے اردو میں ترجمے کئے ہیں۔ جن میں زبان کی چاشنی اور اصلیت کا لطف ملتا ہے۔ ابھی حال ہی میں پروفیسر عبدالرؤف نے بھی مشہور امریکی ادیب مارک ٹوین اور والٹ وٹمین کے نثری اور شعری ادب پاروں کو اردو زبان میں بڑی فنکاری اور سلیقہ مندی کے ساتھ منتقل کیا ہے۔ مختصر یہ کہ ترجمے کے میدان میں بھی مغربی بنگال کا درجہ دوسرے مقامات کے مقابلے میں کمتر نہیں کہا جا سکتا ہے۔ مغربی بنگال میں تحقیقی کام کرنے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے جن میں پروفیسر شاہ مقبول احمد صاحب کا نام بطورِ خاص لیا جا سکتا ہے۔ بہ ایں ہمہ اپنے اندر تحقیقی کام کرنے کی زبردست صلاحیت رکھنے کے باوجود اب تک کوئی باضابطہ تصنیف پیش نہیں کر سکے اس سلسلہ میں ان کی تساہلی اور بے نیازانہ طبیعت کو مورد الزام ٹھہرایا جانے کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

مغربی بنگال بہ شمول مشرقی پاکستان، کا مرتبہ تصنیف و تالیف کے لحاظ سے بھی ہر عہد میں بلند رہا ہے اور آج بھی مغربی بنگال سے معلوماتی تصنیفات آئے دن منظرِ عام پر آتی ہی رہتی ہیں۔ جن کی روشنی میں مغربی بنگال کے اندر اردو زبان کی سرگرمیاں اور یہاں کی ادبی تحریکوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اب تک بنگال سے جو قابلِ ذکر کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں ان میں بطورِ خاص چند کے نام یہ ہیں۔ (۱) بنگال میں اردو (وفا راشدی) (۲) مشرقی بنگال میں اردو (اقبال عظیم) (۳) جام نو (تابان القادری) (۴) نساخ سے وحشت تک (سید لطف الرحمٰن) (۵) بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات (شانتی رنجن بھٹاچاریہ) (۶) اردو اور بنگالی (شانتی رنجن بھٹاچاریہ) (۷) انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب (جاوید نہال) (۸) بیسویں صدی مغربی بنگال کے اردو شعراء (اشتاق احمد ایم۔اے) اس کے علاوہ بھی متعدد شعری اور افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ جن کے ذکر کا یہاں پر موقع نہیں سمجھتا۔

حسب مذکور کتابوں کی تاریخی اہمیت سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بھی ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ ان کتابوں سے قبل ہندوستان کے دوسرے خطوں میں بے شمار لازوال اور ناقابلِ فراموش تذکرے لکھے جا چکے تھے۔ اگر بنگال کے تذکرہ نگار غور و فکر سے کام لیتے تو وہ اپنے تذکرہ کو ترقی یافتہ شکل میں پیش کر سکتے تھے لیکن وہ ایسا کرنے میں تقریباً ناکام رہے ہیں۔ کیونکہ ان کے تذکروں میں صحت سند روایتی انداز کے علاوہ تنقیدی شعور کا

نمایاں طور پر دست فقدان نظر آتا ہے۔

مغربی بنگال کے شاعروں اور ادیبوں کی یہ عام شکایت ہے کہ اردو کے نقادوں نے ان کو ہمیشہ جان بوجھ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کی یہ شکایت بالکل ہی غلط بھی نہیں کہی جا سکتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آخر اس کا علاج کیا ہے؟ صرف شکایت کرنے اور اپنی محرومی پر آنسو بہاتے رہنے ہی سے تو یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں جس طرح دوسرے کی خیرات میں زندگی گزارنے والوں کی دنیا کے کسی مہذب سماج میں عزت نہیں ہوتی اسی طرح ادبی دنیا میں بھی دوسروں کے سہارے پر اپنی شخصیت کی تعمیر کا خواب دیکھنا کوئی مہذب فعل اور دانشمندانہ بات نہیں ہو سکتی۔ اگر وحشت کلکتوی اور پرویز شاہدی کو اردو کے نقادوں نے خاطر خواہ طور پر نہیں اچھالا ہے تو اس میں قصور کس کا ہے؟ انگریزی کا مشہور مقولہ ہے "Charity begins at home" مگر اہل مغربی بنگال نے کبھی اس پہلو پر غور کرنے کی زحمت نہیں کی ورنہ ان کو دوسروں کی شکایت کرنے کے بجائے یہ تسلیم کرنا پڑتا کہ ؎

میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

تاریخ اردو کے مطالعہ سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ شروع سے لے کر اب تک مغربی بنگال کی سرزمین سے ہندوستان گیر شہرت کا ایک بھی نقاد پیدا نہیں ہو سکا۔ مغربی بنگال کے اردو ادب کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ اب تک یہاں کے اہل قلم حضرات اس علم و تمدن کی روشنی کے دور میں بھی موجودہ دور کے ابھرتے ہوئے نقاد مثلاً شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر عبدالمغنی۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، کرامت علی کرامت، قمر اعظم ہاشمی وغیرہ کا جواب پیدا کرنے اور ساتھ دینے میں بری طرح ناکام رہے ہیں۔ غرضیکہ مغربی بنگال میں اردو کے نقادوں کا بہت بڑا قحط پڑا ہوا ہے جس کی کئی معقول وجہیں ہیں جن میں سے چند کا ذکر مندرجہ ذیل سطور میں اختصار کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہوں ؎

گر قبول افتد زہے عز و شرف

مغربی بنگال کی سرزمین سے اب تک کسی نقاد کے پیدا نہ ہونے کی اوّل وجہ یہ ہے کہ یہاں کے اہل قلم حضرات اکثر و بیشتر صحافتی دنیا سے منسلک رہے ہیں۔ اور آج بھی جن کی ذات (مثلاً ابراہیم ہوشؔ وغیرہ) سے کچھ تنقید نگاری کی توقع کی جا سکتی ہے وہ صحافت نگاری سے حالات کی ستم ظریفی کے سبب اپنا رشتہ توڑ نہیں سکتے اور یہی وجہ ہے کہ یہاں کے ادب پر ہمیشہ صحافت اور انشا پردازی کا رنگ نمایاں طور پر غالب رہا ہے۔ دوئم یہاں کی فضا پر بنگلہ زبان کا اثر چھایا رہا اور اردو ہمیشہ ثانوی زبان کی حیثیت سے زندہ رہی۔ سوئم مغربی بنگال میں وحشتؔ سے پرویز شاہدیؔ تک کے دور میں کبھی کسی دو عظیم شاعروں کے درمیان آپس میں کوئی ٹکراؤ پیدا نہیں ہو سکا اور نہ ایک ہی وقت میں دو مختلف اور جداگانہ نظریات رکھنے والے شاعر ہی پیدا ہو سکے۔ اس لئے مجموعی طور پر یہاں کی ادبی فضا میں جمود طاری رہا۔ اور تنقیدی شعور کے پروان چڑھنے کی معقول فضا پیدا نہ ہو سکی چوتھی، اہم وجہ یہ ہے کہ مغربی بنگال کے تنقیدی شعور کو نقصان پہونچانے میں کلکتہ کی سب سے قدیم ادبی انجمن "بزم احباب" کا زبردست ہاتھ رہا ہے کیونکہ "بزم احباب" کے اصول کی وجہ سے بزم کا ایک ممبر دوسرے ممبر پر کسی طرح کی کوئی تنقید نہیں کر سکتا۔ اخلاق و مروت اور بھائی چارگی اس انجمن کی زندہ و تابندہ روایت چلی آ رہی ہے۔ بزم احباب کے چند مشاہیر ممبروں کے نام یہ ہیں۔ حکیم محمد صادق رضاؔ، وحشتؔ، حکیم ناطقؔ لکھنوی، مرزا ابو جعفر کشفیؔ۔ پروفیسر عبدالرحیم، پروفیسر محب الحسن خان، ل۔ احمد اکبرآبادی، پروفیسر احمد حسن اشکؔ۔ پرویز شاہدیؔ۔ ضیاؔ عظیم آبادی۔ جمیلؔ مظہری، پروفیسر ریاض احمد۔ مولانا سید احمد اکبرآبادی۔ سید امیر رضا کاظمی، ابراہیم ہوشؔ، سالکؔ لکھنوی وغیرہم اور اردو زبان و ادب کی یہ وہ ہستیاں ہیں جو چاہتیں تو انتقادیات کی دنیا میں کیا کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ مگر ان کا مجلسی مسلک ہمیشہ ان کی راہوں میں چٹان بن کر حائل رہا۔ جس کی وجہ سے یہ حضرات اپنی تنقیدی صلاحیتوں کا جائزہ نہ لے سکے اور نہ کبھی ان کے درمیان کوئی نظریاتی اختلاف پیدا ہو سکا۔ تنقید کے لئے جس طرح کے ماحول کی ضرورت ہوتی

وہ ماحول "بزمِ احباب" کی وجہ سے پیدا ہونا ممکن نہ تھا بہرحال سماجی اور اخلاقی اعتبار سے بزمِ احباب کی عظمت و افادیت سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مگر تنقیدی نقطۂ نگاہ سے تو یہ کہنا پڑے گا

کرم ترا ہے ستم سے بڑھ کر

یہ امر قابلِ مسرت ہے کہ آجکل مغربی بنگال کی نئی پود کلکتہ، مٹیا برج، ہوڑہ، برن پور، آسنسول وغیرہ مقامات پر متعدد انجمنیں بناکر اپنے ذوقِ تنقید کی آنچ کو تیز کرنے کی سعیٔ پیہم کر رہی ہے لیکن ابھی ان کے مستقبل کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا میرے لئے مشکل ہے۔

مغربی بنگال کا اردو ادب زیادہ تر ترکِ وطن کرکے یہاں آنیوالے شاعر و ادیب کے ہاتھوں پروان چڑھا ہے اور آج بھی یہی صورتِ حال ہے یہاں کے بنگالی نسل اردو داں اہلِ قلم کی تعداد ہر زمانے میں انگلیوں پر گننے ہی کے قابل رہی ہے اور باہر سے ترکِ وطن کرکے آنے والے شعراء و ادباء زیادہ تر فکرِ معاش کے چکر میں پھنسے رہنے کی وجہ سے تنقید جیسے کٹھن اور دشوار فن کے لئے وقت کی قربانی نہ دے سکے۔ علاوہ ازیں بنگال میں اردو کو کبھی کسی راجہ، مہاراجہ اور حکومتِ وقت کی سرپرستی حاصل نہیں رہی اس لئے یہاں کبھی کوئی اردو کے مرکز بھی قائم نہ کئے گئے۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اردو زبان کی پرورش فارسی اور عربی کے سایۂ عاطفت میں ہوئی ہے اور اردو نے انگریزی زبان سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ بھارت کی بہت سی قدیم و جدید زبانوں سے کافی فیضیاب ہوئی ہے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ بنگلہ جیسی زندہ زبان سے کبھی کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکی حالانکہ اردو شروع ہی سے بنگال میں بنگلہ زبان کے دوش بدوش سفر کرتی ہوئی آرہی ہے اگر بنگال کا اردو داں طبقہ بنگلہ کے شاعر و ادیب سے اپنا رابطہ قائم رکھتا اور ان کی ادبی انجمنوں میں شریک ہوکر کچھ سیکھنے کی کوشش کرتا تو آج یقیناً مغربی بنگال کے اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ بھی وافر ہو سکتا تھا۔ اردو والوں کی علیحدگی پسندی نے ہمیشہ اور ہر جگہ پر اردو داں کے ساتھ ساتھ اردو زبان کو ناقابلِ تلافی حد تک نقصان پہونچایا ہے

اب ہمارے فنکاروں کو اس بات کی اہمیت کا احساس ہونے لگا ہے۔ اپنے بزرگوں کی غلطیوں کا ازالہ کرنے کے لئے آجکل مغربی بنگال کی نئی نسل کے نئی شاعر اور ادیب شمس الزماں شمس، قیصر شمیم، معین اعجاز، وغیرہ بنگلہ اور ہندی کے مشاہیر فنکاروں سے اپنے گہرے تعلقات پیدا کرنے کی دھن میں مصروفِ عمل دکھائی پڑتے ہیں۔ اگر یہ حضرات اپنے تعلقات کو یونہی پھیلاتے اور استوار کرتے رہے تو بہت ممکن ہے کہ مستقبل میں بنگلہ اور ہندی زبان کے نادر افکار و خیالات مغربی بنگال کے اردو ادب میں بھی حاصل ہو سکیں گے جس سے یقیناً اردو ادب کا فائدہ حاصل ہوگا اور بنگلہ اردو دوستی کے لئے فضا ساز گار ہو سکے گی۔

فن تنقید سیکھنے اور سکھانے کی سب سے عمدہ جگہ کالج اور یونیورسٹیاں ہوا کرتی ہیں۔ کیونکہ وہاں پابندی کے ساتھ اس کے لئے کلاس ہوا کرتے ہیں۔ پڑھنے سیکھنے کا ماحول ہوتا ہے اور خاص طور پر طلباء بھی اعلیٰ درجہ کی سند حاصل کرنے کی لالچ میں ہی تنقید جیسے خشک اور مشکل فن کے سیکھنے میں قدرے دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہیں طلباء کے ساتھ ساتھ اساتذہ کو بھی بطور خاص اس کے لئے محنت و ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ ایک زمانے سے کلکتہ یونیورسٹی اور اردو ایم اے کے کلاس ہو رہے ہیں۔ لیکن اب تک دوسری یونیورسٹی کے مقابلے میں کلکتہ یونیورسٹی ایک بھی ایسا نقاد پیدا نہیں کر سکی جس کا موازنہ کم از کم اردو کے ابتدائی درجہ کے نقادوں سے بھی کیا جا سکے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جب ماں کی کوکھ ہی بانجھ ہو تو بچہ پیدا ہونے کی کیسے امید کی جا سکتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہاں کے اساتذوں کے اندر ایک بھی ایسی ہستی نہیں ہے جس کا مقابلہ احتشام حسین، آلِ احمد

اعجاز حسین۔ ڈاکٹر اختر اورینوی، فراق گورکھپوری۔ ڈاکٹر محمد حسن، پروفیسر اختر قادری، خورشید الاسلام، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ سے تو کرنا خیر چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی بلکہ اردو کے دوئم درجہ کے نقادوں سے بھی موازنہ آسانی کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا ہے جہاں کے اساتذہ کالج کے اوقات کے بعد سیدھا اخبار کے دفتر کی راہ اختیار کرتے ہوں ان کی ذات سے یہ کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ دوسری صبح کو طلبا کے سامنے فکر و فن کے نئے اور پیچیدار پہلوؤں پر بصیرت افروز لکچر دے سکیں گے۔ فن تنقید کے فرائض سے کما حقہ طور پر سبکدوش ہونے کے لئے عالمی ادب پر نگاہ رکھنی بہت ضروری ہے۔ اور قدیم و جدید رجحانات کا بدرجۂ اتم علم رکھنا تو نقاد کے فرائض میں داخل ہیں اور یہ تمام چیزیں بغیر عمیق اور مسلسل مطالعے کے حاصل نہیں ہو سکتی ہیں۔ اسی خیال کے پیش نظر اب حکومت کی جانب سے بھی تعلیمی معیار کو بلند کرنے کی غرض سے اساتذوں کے اوپر چند قسم کی قانونی پابندیاں لگائی جا رہی ہیں۔ اگر یہاں کے اساتذہ حضرات میری تحریر کی تلخی گوارا کرتے ہوئے فن تنقید کی جانب توجہ دے سکیں گے تو مغربی بنگال کی نئی نسل کا تنقیدی شعور بہت حد تک سلجھ سکے گا اور میں سمجھوں گا کہ میری آواز صدا بہ صحرا ثابت نہیں ہوئی۔

گرچہ میرے سامنے حد نظر تک مغربی بنگال کے اردو ادب کے افق پر مایوسی اور ناامیدی کے گھنے بادل چھائے ہوئے ہیں (کیونکہ ابھی حال ہی میں زبان کے نام پر سرحد کے اس پار جو یا اُس پار جو انسانیت سوز اور خونی ڈرامہ کھیلا گیا ہے اسے تاریخ عالم کبھی بھلا نہ سکے گی) لیکن اس حقیقت کا اعتراف کرنا بھی ضروری ہے کہ عہد حاضر میں یہاں بزرگوں میں پروفیسر نیاز احمد نے کئی اہم تنقیدی مضامین لکھے ہیں اور سالک لکھنوی بھی وحشت کلکتوی مطالعاتی۔ اور آرزو لکھنوی کے کلام پر حیات آگیں اور خیال افروز تنقیدی مضامین سپرد قلم کر چکے ہیں جن کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر موصوف پابندی کے ساتھ اس قسم کے مضامین لکھتے رہے تو وہ بہت جلد اردو ادب میں نقاد کی حیثیت سے بھی چمک سکیں گے۔ ان کے علاوہ نوجوانوں میں ظفر اوگانوی، قیصر شمیم، عبدالنان، عبیداللہ بارز، معین اعجاز اور ایم۔ اے نصر وغیرہ کے اندر بھی تنقیدی مضامین لکھنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اگر یہ حضرات بھی ذوق و شوق کے ساتھ تنقید نگاری کی جانب توجہ دے سکیں گے تو مستقبل میں مغربی بنگال کا تنقیدی سرمایہ وافر ہو سکے گا۔ اور یہاں کے شعرا و ادبا کو باہر کے نقادوں کی خیرات پر زندگی گذارنا نہیں ہوگی اور وہ دن دور نہیں جبکہ ہم یہ کہہ سکیں گے ؎

زمانہ ہم کو بھی فنکار کی صف میں جگہ دے گا
ہماری سمت بھی مائل نگاہ نکتہ چیں ہوگی

شاہ حسین

غزلیں

بستی کہاں کھو گئی وہ دل کی
کس شہر پہنچے، بھٹکتے بھٹکتے!؟
گلشن کہاں گلبدن وہ کہاں ہیں!
تارے بھی ڈوبیں چمکتے چمکتے!
یادوں کی خوشبو لپٹ آئی کیوں؟ میں
آٹھا تھا دامن جھٹکتے جھٹکتے!
امرت مجھے دو کہ دو زہر، کچھ دو
گزرے ہر اک پل سسکتے سسکتے!
ہے شاہ کیوں اس قدر خوف طاری
کیوں چل رہے ہو، بہکتے بہکتے!؟

★ ★

شاید بھنور سے نکل ہی چکے تھے
ڈوبے کہاں پھر ابھرتے ابھرتے!؟
سینے میں خنجر کی اک دھار سی ہے.
کاٹے ہے اندر اترتے اترتے!
کل راستوں نے ہمیں ڈس لیا پھر
پھر چوٹ کھائی گزرتے گزرتے!
الجھے ملے کاکل زندگی کیوں!؟
دیکھا انھیں تھا سنورتے سنورتے!
سچ کہہ رہے ہو نکھر آئیں گے پھر
دھندلے یہ منظر نکھرتے نکھرتے!؟

★ ★

ؔ یہ دونوں غزلیں سنسکرت کی بحر میں کہی گئی ہیں۔ سب سے پہلے کرامت علی کرامت نے اپنے مضمون "جدید شاعری وزن و آہنگ کے مسائل" میں اس بحر کی نشاندہی کی ہے۔ وزن ہے۔
تقطیع: فعلن، مفعول، مفعول، فعلن۔ (विद्युन्माला [illegible])

ترلوک آنند
ترجمہ: آزاد گلاٹی

ایک پنجابی کہانی

اک خواب کہانی

رات کو اکثر میں خواب دیکھتا ہوں۔
سوکھا پیڑ ــــ
ننگی عورت ــ
پر کٹا پرندہ ــ
ٹوٹا ہوا گھڑا ــ
میلا پانی ــ
سفید خون ــ
خالی گھر ــ
اُداس چاند ــ
بے حس سورج ــ
مدن / کیوپڈ ــ
اندھیری رات ــ
اکثر رات کو پھر میں چونک جاتا ہوں ــ
چونکتا ہوں ــ اور پھر اندھیرے میں،
چاروں طرف دیکھتا ہوں ــ
اُدھر ننگی عورت ــ
گھسا ہوا گھڑا ــ
مردہ سورج ــ
بیمار کیوپڈ ــ
اک کمرہ

کمرے کی ایک دیوار ــ
دیوار پہ ایک کلینڈر
کلینڈر میں ایک رقاصہ
رقاصہ، جس کا جسم
جسم غائب ہے، اور
اور پڑے ہیں. صرف
صرف اس کے کپڑے ــ
خشک دریا ــ
کیڑے لگے پھول ــ
گھپ اندھیرا ــ
اپنی جانب بڑھتی ہوئی دیواریں ــ
ایک کمرہ
کمرے میں کلینڈر
کلینڈر میں رقاصہ۔
رقاصہ تو ہے لیکن
لیکن اب اس کے کپڑے
کپڑے غائب ہو گئے ہیں۔
میں اکثر ڈر جاتا ہوں ــ

ڈر کے بستر سے اٹھتا ہوں ــ
بتی جلا کر پھر دیکھتا ہوں ــ
تنگ کمرہ ــ
بدبو ــ
نمی ــ
کمرے میں کلینڈر
کلینڈر میں ہے رقاصہ
رقاصہ تو ہے نہیں۔
نہیں، کپڑے بھی نہیں ہیں۔
ہیں تو صرف کچھ پھول
پھول جن کی پتیاں
پتیاں جو بکھر گئی ہیں ــ
میرا بستر ــ
اس پر تازہ خون ــ
خون کے داغ ــ
میرے انگ
اک اک کر کے
الگ الگ
بستر پر
پھولوں کی طرح

بکھرے پڑے ہیں
بکھرے پڑے ہیں

خشک دریا
سمندر بن گیا ہے —
سوکھے پیڑ کی
ایک ٹہنی ہری ہو رہی ہے
ایک ہنسی
بے آواز
گونجتی ہے —
پھر اکثر چیخ چیخ اٹھتا ہوں —
صل میں ڈر جاتا ہوں —
کے بیوی کی طرف دیکھتا ہوں، وہ گہری نیند سو رہی ہے —
خبر، بے خوف —
پھر سونے کی کوشش کرتا ہوں —
خوابی کے عالم میں دیکھتا ہوں —
موسلا دھار بارش —
بیوی اپنے بستر میں نہیں ہے۔
ایک کمرہ
کمرے میں کلینڈر
کلینڈر میں رقاصہ
رقاصہ بالکل برہنہ
برہنہ رقاصہ کا چہرہ
چہرہ ہے میری اپنی بیوی کا —

اور میں اکثر پھر جاگ جاتا ہوں (غصّے میں)
اٹھ کر کلینڈر پھاڑ دیتا ہوں —
بتی بجھا دیتا ہوں —
اور پھر اجنبی چہرے والی بیوی سے بغلگیر ہو کر لیٹ جاتا ہوں —
اور اکثر محسوس کرتا ہوں —
اجنبی چہرے والی کے جسم میں سے
جسم میں سے اجنبی آدمیوں کی بو
بو آتی ہے اور
اور محسوس ہوتے ہیں، وہ رینگتے ہوئے
رینگتے ہوئے نرم نازک کومل پور
کومل پور اجنبی انگلیوں کے۔
اجنبی انگلیوں کے دھیرے دھیرے۔
دھیرے دھیرے، پھر، بیوی، میری بیوی۔
میری بیوی۔ نام لیتی ہے —
اور میں اکثر اٹھ کر بتی جلا دیتا ہوں —
کمرے میں فرش پر سانپ ہی سانپ رینگتے ہیں —
اور میں اکثر سوچتا ہوں —
کل صبح تھانے میں رپورٹ درج کراؤں گا —
میری بیوی کے کپڑے چوری ہو گئے ہیں
اور چور کلینڈر والی رقاصہ ہے —
اور پھر میں بے فکر ہو کر سو جاتا ہوں۔

★ ★

سعادت شمیم

ایک + ایک کا نوحہ

وہ بہت خوش تھا کہ اسے جو کچھ بھی پایا تھا، پا چکا تھا۔ کبھی کبھی خوشیوں سے پاگل ہو جاتا اور بے مطلب قہقہے لگاتا۔ کبھی بات بے بات دوسروں کے آگے سرچڑھی بولیاں بولتا۔ لوگ باگ اس کے اندر اور باہر کی عجیب سی تبدیلی دیکھ رہے تھے۔ کچھ قیاس آرائیاں اس کے مستقبل کے بارے میں بھی ہوا کرتیں ـــ میں نے اسے بارہا سمجھایا کہ دیکھو تمہاری یہ خوشیاں اور بے مطلب قہقہے دوسروں کو غلط فہمیوں میں مبتلا کر رہے ہیں۔

وہ کہتا: "غلط فہمی کی وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے کہ میں جو خوش ہوں وہ غلط نہیں۔"

اور پھر اس کے قہقہے بلند ہوتے رہے۔ اور وقت سنتا رہا۔۔۔۔۔! ایسا ہی ہوا ہے کہ ہمیشہ اونچے قہقہوں کی رسیاں کھینچ لی گئیں ہیں ـــ اور بے بس "میں" حادثی لمحوں کی زد میں آگیا ہے۔"

ایک بھیانک رات کا ذکر ہے۔ جبکہ میں آدھا سویا اور آدھا جگا تھا۔ وہ دھیرے سے اپنے بستر سے اٹھا اور کچھ تلاش کرنے کے بعد کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے نیند نہیں آئی اور میں جاگتا رہا۔۔۔۔۔۔ اور اس وقت جبکہ آدھی رات ادھر اور آدھی رات ادھر تھی وہ دھیرے سے کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے دیکھا وہ کچھ کھویا کھویا سا ہے۔ اسکے سر کے بال الجھے ہوئے تھے۔ جیسے کہیں سے لٹ کر آیا ہو، میں خاموش تھا اور اس کی حرکتوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر ایسا محسوس ہوا کہ اس نے ایک گہری لمبی سانس لی اور اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ ایسا میں نے بارہا دیکھا۔ مگر کبھی بھی اس سے باز پرس نہ کی کہ میں جانتا تھا کہ وہ جہاں بھی جاتا تھا اور جو بھی کرتا ہے وہ اس کا اپنا ذاتی معاملہ ہے ـــ

ایک دن جبکہ وہ حد درجہ اداس تھا کمرے میں داخل ہوا اور میرے قریب بیٹھ گیا۔ مجھ سے اس کی خاموشی دیکھی نہ گئی میں نے پوچھا: "کیا بات ہے۔ بہت خاموش ہو۔؟" تمہارے قہقہوں کا قافلہ کدھر گم ہو گیا ہے ـ؟

اس نے بے اعتنائی برتی اور ویتنام میں ہونے والی جنگ کا قصہ لے بیٹھا۔ بھلا مجھے اس جنگ سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ کہ میں خود اپنے اندر ہونے والی جنگ میں دلچسپی لے رہا تھا۔

میں نے کہا: "کل میرا انٹرویو ٹھیک نہیں ہوا۔ وقت پر سارے جوابات دماغ سے نکل جاتے ہیں۔"

کہنے لگا: "(PRE PAR E) ہو کر جایا کرو ـ" اور پھر وہی بے مطلب قہقہے لگانے لگا۔ جی میں آیا کہ اس کا گلا دبا دوں مگر کچھ سوچ کر خاموش ہو رہا۔ ہنسنے کا زمانہ ہے۔۔۔۔ زمانے کی ہنسی ہے۔۔۔۔ لمحوں کا کیا بھروسہ کہ یہ تو بڑے بیرحم ہیں۔

میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ اس کے اندر قاتلانہ سفاکی بدرجہ اتم موجود ہے۔ قبل بھی وہ تین کو قتل کر چکا تھا اور چوتھا۔۔۔۔!

ایک روز وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا: "مجھے دس روپیوں کی ضرورت ہے کہ میں نے ہفتوں سے کوئی قتل نہیں کیا ـ میری زبان خشک ہو چکی ہے۔"

میں نے اسے دس روپے دیئے جسے لیکر وہ فوراً چلتا ہوا۔ پھر مہینوں اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں خود اپنے ہی مسائل

میں گرفتار تھا۔ کون کس کی خبر گیری کیا کرتا پھرے۔ مگر جلد ہی مجھے احساس ہوا کہ اس کی یہ لعنت اسے الجھنوں میں ڈال دے گی۔

اور میں محتاط ہو گیا۔

تو ایسا ہوا کہ ایک روز وہ میرے قریب بیٹھا فلسفیانہ باتیں کر رہا تھا۔ کہنے لگا "VIRUS" جیسا حقیر کیڑا بھی اکثر انسان کو بے بس اور مجبور کر دیتا ہے۔ اور اس کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے۔"

میں نے توضیح چاہی مگر وہ خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا۔ "گھبراؤ نہیں کہ میں ابھی زندہ ہوں۔ اور جب تک زندہ رہا حیاتیات کے باپ کو للکارتا رہوں گا۔" میں سب کچھ سمجھ گیا کہ اس کی قاتلانہ ذہنیت سے میں بخوبی واقف تھا۔

خیالات کے اندھے سائے بھی کبھی انسان کو کتنا دکھی کر دیتے ہیں۔ نہ تو کوئی غم ہوتا ہے نہ ہی کسی خوشی کی یاد آتی ہے۔ ایسے ہی ایک اداس شام کا ذکر ہے کہ اس کا ایک خط مجھے ملا۔ لکھا تھا "پرندے زخمی ہو چکے ہیں، انھیں کسی سم قاتل یا پھر کسی امرت کی ضرورت ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ تم یہ کام کر سکتے ہو۔"

اس مختصر سے خط کو پڑھ کر میں اس کی حاجت سمجھ گیا۔ مگر میں خود بھی کافی پریشان تھا اس لئے کہ خلائیں مجھے ان دنوں اکثر گھورا کرتی تھیں۔ ان ہی دنوں میں نے محسوس کیا تھا کہ خلاء ایک گوشت خور درندہ ہے جو انسان کو دھیرے دھیرے کھایا کرتا ہے۔ میرا قد انھیں دنوں گھٹنا شروع ہوا تھا۔ اور میں اپنے آپ کو بونا سمجھنے لگا تھا۔"

میں نے سم قاتل کی تلاش بھرے بازاروں سے لے کر سنسان غاروں تک کی۔ مگر سوائے کھونے کے کچھ پا نہ سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ اکثر حالات میں زہر دینے والے بھی بندہ پرور بن جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ زہر کسی کے لئے امرت بن جاتا ہے۔

تو ایسا ہوا کہ چند ہمدردوں نے اس کی ضرورت پوری کر دی۔ اور میرا فرض ادا ہوا۔ مگر ہوا وہی جو سیاہ چادر میں بند ہاتھوں کا مقدر تھا — اور پھر وقت کے سمندر میں سنسناتے ہوئے طوفان کی مانند گزرتے گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔!"

ایک روز وہ بہت گھبرایا ہوا سا بازار میں ملا۔ اس کے چہرے کی رنگت کافی اُڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے وہ راتیں یاد آنے لگیں۔ جن راتوں میں وہ کہیں سے لٹ لٹا کر آیا کرتا تھا اور اس کی رنگت اڑی اڑی سی ہوا کرتی تھی۔ مگر ایک فرق بالکل واضح طور پر میں نے محسوس کیا اور وہ یہ کہ اُن دنوں کی اڑی ہوئی رنگت فتح کے بعد کی ہوا کرتی تھیں اور اب شکست کے بعد کی۔

میں نے کہا "ویت نام میں امریکہ کی جارحیت بڑھتی جا رہی ہے۔"

میری بات کاٹ کر بولا "چھوڑو ان باتوں کو کہ مجھے اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

میں نے کہا "انسان بنیادی طور پر آزاد پیدا ہوا ہے۔ مگر زندگی میں ہر جگہ وہ اپنی خواہشوں کا غلام ہے۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔ تمہارا اشارہ میری طرف ہے۔"

میں نے کہا "یہ ایک عام بات ہے۔"

وہ خاموش رہا اور وقت گزرتا رہا۔ ۔ پل پل ۔ ۔ ۔ لمحہ لمحہ وقت گزرتا رہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر ایسا ہونے لگا کہ وہ آتا اور مجھ سے محض ایک فرض پورا کرنے کی خاطر ملا کرتا۔ پھر ایسا بھی ہونے لگا کہ وہ مجھے اپنا رازدار سمجھتا تھا۔ مجھ سے بہت ساری باتیں چھپانے لگا۔ مگر مجھے اس کی ایک ایک بات کا علم تھا۔ اور چھپایا کرتا تھا — میں نے بھی خاموشی اختیار کر لی تھی۔

ایک روز مجھے ایک ضروری کام سے شہر سے باہر جانا پڑا اور اسی روز وہ نازل ہوا۔ اسے یہ امید تھی کہ میں اپنا پروگرام تبدیل کر دوں گا۔ مگر میں اپنے ارادے میں بالکل (DETERMINED) ہو چکا تھا۔ میں نے اسے اپنے کمرے کی کنجی دی اور سفر کا آغاز کیا۔ وہ رات بھر میرے کمرے میں رہا۔ اور صبح ہوتے چلا گیا۔ میں ایک عرصے بعد جب گھر لوٹا تو میز پر ایک رقعہ پڑا ملا۔ لکھا تھا۔

"آخرکار ہواؤں کا حلقہ تنگ کر کے
انھیں قید کر لیا گیا ہے۔ اور پھڑپھڑاتے ہوئے
زخمی پرندے اب جانکنی کے عالم میں ہیں۔
زندگی میں میں نے بہت کچھ پایا تھا۔ مگر اب
محسوس ہو رہا ہے گویا میری زندگی صرف
کھونے کے لئے ہے۔ آج تک جسے میں حاصل
زندگی سمجھ رہا تھا وہ ایک سراب کے علاوہ
کچھ بھی نہیں۔ میں نے کبھی کچھ نہیں پایا۔
بندے سے لے کر خدا تک فریب ثابت
ہوا ــــ چلو اچھا ہی ہے۔ کچھ پانے کی
تمنا سے نجات مل گئی۔ تمھاری نوازشوں کا
بہت بہت شکریہ کہ تم نے میرے لئے جو کچھ
کیا ہے اسے کیسے بھول سکتا ہوں ۔"
خط پڑھ کر اس کی تحریر اور باتوں کے تضاد کو میں نے
شدت سے محسوس کیا۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ ان دونوں حد
درجہ انتشار کے عالم میں ہے۔ انتشار...... دھند۔
..... دھند کے بعد خلاء...... اور خلاء کے بعد...؟
ہم .... تم .... اور پھر وہی دھند .... اور پھر وہی خلا
.... اور وہی ہمارا تمھارا مقدر .....؟
اب کہنے والے کہتے ہیں اور یہ بات شہر میں پوری طرح
پھیل گئی ہے کہ وہ جس کے بال بے حد بڑھے ہوئے ہیں اور آنکھیں
انگاروں کی طرح سرخ ہیں، میرے چوراہے پر کھڑا ہو کر پہلے
ایک خوفناک قہقہہ لگاتا ہے اور پھر کہتا ہے،
"میرے لئے دعائے خیر کرو کہ میں نے تمھیں VIRUS
دیا ہے .... میرے لئے
دعائے خیر کرو کہ میں نے .... !!
.... اور پھر بے ہوش ہو جاتا ہے ــ

ـــــ × ـــــ

بقیہ انجم نجمی کے خطوط صفحہ ۸ کا :

استاد ذوق نے انتقال سے تین گھنٹے پیشتر یہ شعر
کہتے ہیں آج استاد ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے
مرنے سے آگے آخر اپنا یہ شعر مرزا غالب کے دیدہ نہاد
دم واپسیں بر سر راہ ہے !
عزیزو اب اللہ اللہ ہے !
میرے والد مرحوم اپنی حیاتِ ناپائدار کی آخری سا
میں یہ مصرعہ اکثر دہراتے رہتے تھے۔ ع
ہوئی شام اب ہم چلے اپنے گھر کو !
اللہ ان مرحومین کو بخشے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ
آمین ۔
منشی کرامت علی خاں جو شہیدی
کرتے تھے، ایک فقیرانہ وضع کے آدمی تھے۔ ان
مشہور غزل کا شعر ہے۔ ؎
تمنا ہے کہ وہ اڑ کر ترے روضہ پہ جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا

ـــــــــــ

بعد فریضۂ حج جب وہ مدینہ منورہ میں دا
اور روضۂ مبارک کو دیکھا تو فرط اشتیاق میں
کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور
شعر میں جو پیشین گوئی اور تمنا تھی وہ پوری ہو گئی۔

ـــــــــــ

انھیں کا یہ مقطع بہت مشہور اور
ہے۔ ؎
خدا منہ چوم لیتا ہے شہیدی کس محبت سے
زباں پہ میری جس دم نام آتا ہے محمدؐ کا

ـــــ × ـــــ نجمی۔

سید عارفی

شکستِ ذات

یہ سوچتا ہوں میں تنہائی کے جزیرے میں
تمھارے نام سے کس چیز کو کروں منسوب
قلم، کتاب، حسین ٹائیٹل، نئی تخلیق
جدید فلسفہ، عہدِ قدیم کے اسطور
یہ سارتر، یہ فرائڈ، یہ وینگ، یہ کامیو
ہے جن کے فکر سے روشن علوم کے ایوان
مرے شعور کی روان کا ساتھ دے نہ سکی
دو ایک چائے کی پیالی پہ زندگی کا مدار
دھواں دھواں ہے مری زندگی کا ہر لمحہ
کسے خبر ہے کہ تخلیقِ فن کے لمحوں میں
تمھارے غم میں مری زندگی پہ کیا گزری
بپاسِ عصرِ نو کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر
جدید طرز کے اصنام لے کے آیا ہوں
میں ٹوٹے پھوٹے ہوئے پیکروں کو بہلانے
شکستِ ذات کا پیغام لے کے آیا ہوں

★★

شاغل ادیب (ایم، اے)

ایک نظم

قتل نے
خون نے
ظلم نے
سر اٹھایا بہت
یوں تو ہر دور میں
آدمی
قتل ہوتا رہا
ظلم سہتا رہا
عدل کچلا گیا
اور حق چھن گئے
اور اصولوں کے سینے پہ اترتا رہا
ایک علم جبر کا
ہاں، مگر
[illegible] یک
[illegible] ے، خون کے ظلم کے دور میں
آدمی جاگ اٹھا.
تھرتھرا گیا فلک اور زمین کانپ اٹھی.
پھر اصولوں نے
حق اور انصاف نے
سر کچل ہی دیا.
قتل کا
خون کا
ظلم کا.

شاہدہ صدیقی

غالب کا غم ناساعد حالات کا نتیجہ ہے

علامہ اقبال نے اجڑی ہوئی دہلی میں آرام کرتے ہوئے غالب کا جب ماتم کیا تو گلشن ویمر میں سوئے ہوئے گوئٹے کا خیال آیا۔ مشرق کے اس بے مثال شاعر کی اپنے زمانے میں ایسی ناقدری ہوئی کہ معمولی پڑھے لکھے لوگ اسکے منہ آنے لگے۔ اور زبان و بیان میں غلطیاں ڈھونڈتے رہے رام پور، کلکتہ اور لکھنؤ کے سفر کئے اور نامراد رہے۔ کبھی بہادر شاہ ظفر کی تعریف میں قصیدہ لکھے کبھی ملکہ وکٹوریہ کے اور کبھی تجمل حسین خاں کے عیش کی داد دی۔ بقول خود۔

نجم الدولہ بہادر ـــ ایک قرض دار جوگ سنا رہا ہے
کوٹھی سے شراب۔ گندھی سے گلاب۔ بزاز سے کپڑا۔ میوہ فروش سے آم۔ صراف سے دام۔ سب قرض کیا زندگی اس بڑے شاعر کی گذری تھی۔

بڑے شاعر میر بھی [illegible] ندگی کی [illegible] آسائشوں میں ان کا بھی حصہ بہت کم تھا۔ مگر ان کو آس[illegible] تھی غالب کو تو زندگی اور اس کی راحتوں سے محبت تھی۔ اس کے حاصل کرنے کے لئے انہوں نے کیسے کیسے ہاتھ پیر نہیں مارے تھے اور اس کی محرومی نے انہیں کتنا بے چین نہیں رکھا۔ تمنا رکھتے تھے کہ ایک عالم کے میزبان بن جائیں اور حال یہ تھا کہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے وہ خود در بدر کی بھیک مانگے۔

خیر یہ تو ان کی زندگی پر ایک نگاہ تھی لیکن اگر علامہ اقبال غالب صدی کے اس دور میں ہوتے تو انکو یہ حسرت نہ رہتی کہ غالب ناقدری کا شکار رہے۔ اب گوئٹے پر انکو رشک نہ آتا۔

مولانا حالی نے 'یادگار غالب' لکھی پھر عبدالرحمن بجنوری 'محاسن کلام غالب' لے کر میدان میں آئے۔ اسکے بعد اردو کے بے مثال ادیب الدم غالب سے آشنا ہوئے۔ رشید صاحب کو غالب سے زندگی میں ملنے کی تمنا ہوتی۔ خلیفہ عبدالحکیم شیخ اکرام۔ احتشام حسین۔ یوسف حسین خاں سب نے غالب پر لکھا اور ایکدم غالب علی کلِ غالب ہو گئے۔

غالب کی زندگی۔ غالب کا فلسفہ۔ غالب کا فن سب پر اتنا لکھ دیا گیا ہے کہ اب کوئی نیا زاویہ یا پہلو ڈھونڈھ نکالنا قابو سے باہر ہے۔

غالب کو مولانا حالی نے "حیوان ظریف" کہا ہے پھر بھلا اس حیوان ظریف کے پاس غم کا گذر کیسے ہو سکتا ہے۔ اسلئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ غالب کا غم یقیناً ناساعد حالات کا نتیجہ ہے۔ ان حالات کے بہت کچھ ذمہ دار خود غالب تھے غالب نے اپنا معیار زندگی اتنا بلند کر لیا تھا کہ محدود آمدنی میں وہ حسب منشاء زندگی بسر کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ غالب کو اور بھی بہت سے غم تھے جس میں تھوڑے تو ان کے اپنے لائے ہوئے تھے اور محسوس کئے ہوئے غم تھے اور بہت کچھ آفات ارضی و سماوی کے پیدا کردہ تھے۔

غالب کے غم کو معلوم کرنے کے لئے ان حالات کا
انا ضروری ہے جس کے سبب وہ اس غم والم سے دوچار
ا۔

مرزا غالب مغلیہ دور کے بہترین ترجمان تھے۔ وہ
صوصیات جو مغلوں میں عام تھیں وہی غالب کی شخصیت
بری دماغوں میں نظر آتی ہیں۔

غالب ایک پرآشوب دور میں پیدا ہوئے۔ انھوں
ل حکومت کا زوال اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ غالب
یہ حکومت سے جو وابستگی تھی۔ اس کی بنا پر عہد مغلیہ کا
ال انھوں نے محسوس کیا۔ یہ غم بھی ان کے لئے بڑا شدید
ہیں اس کرب کو انگیز کرنا پڑا۔ اسکی وجہ سے انکی ذاتی
کو مایوسی اور ناکامی کے علاوہ کچھ اور نہ حاصل ہوا۔

اس عظیم الشان عہد کے مٹنے کے بعد ایک نئی حکومت
ما ہو رہا تھا جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے تھے
باعث خیر ہوگی یا باعث شر۔

اسکے علاوہ غالب جس دور میں رہ رہے تھے
ب شکست خوردہ معاشرہ تھا۔ ان نامساعد حالات کی
پر انکی مایوسی اور محرومیاں بڑھ گئیں۔ اس قدیم تہذیب
وال کا بہترین بیان ان کے اس قصیدہ میں ملتا ہے
دکٹوریہ کی تعریف میں کہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب
ام میں ان کی ذاتی زندگی کی محرومی اور ماحول کی مایوسی
عجیب امتزاج ملتا ہے۔ گویا دونوں ایک دوسرے
س طرح مدغم ہو گئے ہیں کہ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ خود
ہیں۔

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

غالب کو اس نظام کی شکست و ریخت کا بھی بہت
اسکے باوجود انھوں نے تضاد قدر کے نظریے کو اپناکر
رہ طبیعت کو بہت کچھ سکون دیدیا تھا۔ وہ کہتے تھے

کہ زندگی میں خوشی وغم لازم وملزوم ہیں۔ وہ خود یہ کہکر اپنے
کو تسکین دیدیتے ہیں کہ

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

حالات نے غالب کو مایوسی اور محرومی کے سوا کچھ
نہ دیا لیکن اس کا مقابلہ انھوں نے نہایت جرأت سے
کیا اور بڑے سے بڑے غم کو انگیز کرکے اسکے ساتھ مصالحت
کرلی۔ وہ شدید مصائب کو بھی جھیل جانے کا سلیقہ سیکھ
گئے تھے۔

تاب لاتے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

زوال آمادہ عہد کے علاوہ غالب کے بہت سے
ایسے غم تھے جو ان کی ذاتی زندگی سے عبارت تھے۔ مرزا
کا بچپن بھی ایسا گذرا تھا جس میں انکو محبت کرنے والی عزیز
ترین ہستیوں کے غم سہنے پڑے۔ یہ ہستیاں ان کے باپ
اور چچا تھے۔ مرزا غالب کا ننہال اور سسرال دونوں بہت
متمول تھے۔ ان کے بچپن کا بیشتر حصہ انکے ننہال میں گذرا
ننہال میں پرورش پانے سے احساس کمتری کا جذبہ پیدا ہو
گیا۔ یہاں کے رئیسانہ ٹھاٹ کی وجہ سے انھوں نے زندگی
کا اعلیٰ معیار بنا لیا تھا جو بعد میں ان کو نہ حاصل ہو سکا۔

اس بلند معیار کو نبھانے کے لئے وہ طرح طرح سے
جدوجہد کرتے رہے۔ اور روپیہ حاصل کرنے کے سارے
وسائل کام میں لاتے رہے۔ انھوں نے آخر دم تک ہار نہ مانی
لیکن پھر بھی انسان تھے۔ اسلئے شکست خوردگی کا احساس
انکو بے چین کر دیتا تھا اور وہ بعض وقت جھنجھلا کر شکوہ کر ہی
بیٹھتے تھے۔ کبھی آسمان کو سارے ظلم وستم کی وجہ سمجھتے تھے
اور طنزیہ انداز میں کہتے۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے

بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

مرزا غالبؔ کو مالی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ان کی ذریعہ آمدنی بہت محدود تھی اور اخراجات ضرورت سے زیادہ اسلئے ان کا مقروض ہونا بھی لازمی تھا۔ قرض کی ادائیگی کے لئے مرزا کو دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑا۔ جو ان کی غیور طبیعت کے قطعی منافی تھا۔ قرض خواہوں سے کسی صورت میں نجات نہیں ملتی تھی۔ ان کے تقاضوں سے الگ تنگ تھے غرضیکہ مرزا کو معاشی و مالی ہر طرح کی پریشانیاں برداشت کرنی پڑیں۔

اسکے بعد پنشن کا ضبط ہونا بھی ایک ستم ہو گیا پنشن کی وصولیابی کے لئے انکو دور دراز کے سفر کرنے پڑے پھر بھی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا۔ اس کی وجہ سے وہ ہزاروں روپیہ کے مقروض ہو گئے۔ مقدمہ کا فیصلہ بھی غالبؔ کے خلاف ہوا۔ اگر عزیزوں کے بارے میں انکی اچھی رائے تھی اور ان سے بہتر توقعات رکھتے تھے لیکن یہاں بھی انکو مایوسی ہوئی۔ اسی طرح ان کے یہاں محرومی کا احساس بڑھتا گیا اسلئے کبھی وہ گھبرا کر موت کی آرزو کرنے لگتے تھے نتیجہ کے طور پر اس طرح کے اشعار ان کے قلم سے نکلنے لگے۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

مرزا غالبؔ کے غموں کے بہت سے محرکات تھے ان کے عزیزوں نے اچھا برتاؤ نہیں کیا اور دھوکہ دیا۔ سب سے بڑا غم چھوٹے بھائی مرزا یوسف کی موت کا تھا ان کا انتقال عین جوانی میں عجیب و غریب حالات میں ہوا یہ غم مرزا کے لئے انتہائی شدید تھا۔ اور اسی وجہ سے وہ ترک دنیا کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ ان کے یہ اشعار کیفیت کا اظہار کرتے ہیں۔

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

غالبؔ کی زندگی کا بڑا المیہ یہ بھی تھا کہ ان کی اولاد نہیں تھی۔ عارفؔ کو انھوں نے اپنا بیٹا سمجھا تھا اسی محبت و شفقت سے ان کو پالا تھا۔ لیکن وہ عالم جوانی میں داغ مفارقت دے گئے یہ غم بڑا جانگسل ہوا اور مرزا کو اس سے روحانی کرب و اذیت سے پڑا۔ جس کا اظہار انھوں نے ایک مرثیہ کی شکل میں کیا

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت میں ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

اسکے علاوہ غالب کی ایک مرثیہ نما غزل بھی ہے یہ مرثیہ انھوں نے اپنی محبوبہ کی یاد میں لکھا تھا محبوبہ کا ذکر بھی انھوں نے اکثر خطوط میں کیا ہے۔ اس کا غم بھی بہت گہرا تھا۔ کیونکہ اس مرثیہ کے لفظ لفظ اثر کا اظہار ہوتا ہے۔

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے

غالبؔ کو اپنے خاندان اور پیشہ سپہگری پر ناز تھا۔ اسی نسلی برتری کی وجہ سے ان میں انانیت پیدا ہو گیا۔ اپنی خاندانی عظمت اور بڑائی کے آگے ہیچ سمجھتے تھے اور بڑے فخر سے کہتے۔

"سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری"

مگر جب قمار بازی کے جرم میں مرزا کو گرفتار کیا گیا انکو بہت صدمہ ہوا۔ انکو اپنی عزت اور وقار کے سارے ان مسمار ہوتے نظر آتے۔ حالانکہ گرفتاری کی یہ مدت بہت مختصر سی تھی مگر غالب کی عزت نفس کو اس سے کاری ضرب لگی۔ انھوں نے مفتنہ کو ایک خط میں اپنی توہین کا حال بڑی افسردگی اور درد سے لکھا ہے۔

"سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا۔ رئیس
زادوں میں گنا جاتا تھا اب بدنام ہو گیا ہوں
اور ایک بڑا دھبہ لگ گیا ہے کسی ریاست میں
دخل کر نہیں سکتا مگر ہاں استاد یا پیر یا مداح
بن کر راہ و رسم پیدا کروں۔

غالب کو اپنی ناقدری کا بہت احساس تھا۔ اس کا در زیادہ ملال تھا کہ ان کا مقابلہ ایسے لوگوں سے کیا جاتا ہے جو کسی صورت سے ان کی ہمسری کے لائق نہیں ان کی پذیرائی ایسی کہ وہ چاہتے تھے۔ اس دور میں نہ ہو سکی۔ اس بات کا انکو بہت قلق تھا۔ اپنے ہم وطنوں سے شکایت بھی کرتے تھے یہاں تک کہ وہ اپنے دیار میں بیکسی کے خوف سے مرنا بھی نہیں چاہتے۔

مجھکو دیار غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم
کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں

شہرت اور ناموری کی خواہش ان کو ہمیشہ رہی لیکن غم سے دوچار رہے۔

از بس کہ سکھاتا ہے غم ضبط کے انداز
جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی تھا

بہادر شاہ ظفر کے دربار میں ذوق کا سر آنکھوں پر بٹھایا جانا ان کو بہت شاق گذرتا تھا۔ مرزا کی خواہش تھی کہ بادشاہ کے سارے لطف و کرم بس ان کے لئے مخصوص ہوں کیوں کہ ذوق کو وہ اپنے مقابلے میں گردانتے ہی نہیں تھے۔ اور اس کی وہ دوسروں سے توقع کرتے تھے کہ سب ان کی سخن فہمی کو مانیں۔

قسمت کی ستم ظریفیوں کے وہ ہمیشہ شکار رہے ۱۸۵۷ء کے غدر میں پنشن اور قلعے کی تنخواہ دونوں بند ہو گئی۔ قیمتی مال و اسباب جس جگہ رکھا تھا وہ بھی لٹ گیا۔

ان الجھنوں نے ان کو بڑا پریشان رکھا۔ پھر بھی ان کی شخصیت کی جو سب سے نمایاں چیز "انا" تھی اسکی وجہ سے انھوں نے صبر آزما حالات کا مقابلہ بڑی پامردی اور دلیری سے کیا۔ وہ اپنی اس "انا" کی بدولت اپنے علاوہ دوسروں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے بعض اوقات وہ اپنے عمل سے خود بیزار نظر آنے لگتے ہیں۔

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہ گذر کو میں
دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

غالب پے درپے غموں کی وجہ سے زندگی سے بیزار ہو جاتے ہیں قسمت کی ستم ظریفی سے خائف اور اللہ میاں سے شکایت کرنے لگتے ہیں۔ ایک عجیب بیچارگی حسرت و افسردگی کا احساس ہونے لگتا ہے خود کہنے پہ مجبور ہوتے ہیں۔

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پہ نہیں آتی

غالب سب کو خوش دیکھنے کی دیرینہ تمنا اپنے

دل میں رکھتے تھے۔ حد یہ کہ وہ اس شہر میں رہنا تک پسند نہیں کرتے جہاں ان کو کوئی بھوکا ننگا نظر آئے۔ جس شخص کے دل میں دوسروں کا درد اتنا ہو وہ بھلا کیوں کر آسودہ خوش یا مطمئن رہ سکتا ہے۔ غم دوراں کی فکر میں وہ ہمیشہ گھلا کرتے تھے۔

غالب اپنی ازدواجی زندگی سے خوش و مطمئن نہ تھے شادی کو ہمیشہ حبس دوام اور بیوی کو پھانسی کے پھندے اور طوق و بیڑی سے تشبیہہ دیتے۔

ایک پرہیزگار بیوی سے وہ قطعی مطمئن نہ تھے بلکہ ان کو ہمیشہ کسی شوخ و شنگ کی تلاش تھی جو ان کے دل کو ایک میٹھی خلش سے بھر دے۔ ہر ادا۔ ہر انداز ان کے سکون دل کو ڈھانے کے لئے ہو۔

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے
ایک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

ظاہر ہے یہ اشعار غالب کی لذت پرستی کی دلیل ہیں۔ یہ ہیولیٰ ان کا بنایا ہوا تھا۔ مگر اس بھرپور مجازیت کو اس عشق آتش نفس کی تلاش ختم کر دیتی ہے جس کی صدا ان کے لئے جلوۂ برق فنا ہے۔

. . . .

غالب زندگی بھر غم و الم میں مبتلا رہے ہر طرح کی مایوسیاں ان کو سہنی پڑیں زمانے کے ظلم و ستم، رقیبانہ چشمکیں اقتصادی بدحالی۔ آخر وہ بھی ایک انسان تھے کوئی پتھر نہیں اس لئے بے اختیار کہہ دیتے تھے۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

لیکن غالب اپنے آپ کو تسکین بھی دے لیتے:

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

بعض اوقات ان ناساعد حالات میں وہ رو رو کر گذارتے اور اللہ میاں کو بھی نہیں بخشتے تھے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اللہ میاں کے بارے میں ان کے دل میں شبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہیں بھی یا نہیں جو ان کو اتنے غم کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

غالب کے ارمانوں اور خواہشوں کی بھی کوئی حد نہ تھی۔ قدرت نے ان کو نہ جانے کتنا ارمان بھرا دل دیا تھا۔ ظاہر ہے سب کی تکمیل ہونی تو ناممکن تھی جس کی وجہ سے غالب کی غمگینی بڑھتی جاتی تھی۔ خود کہتے ہیں

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ان کی افسردگی میں ایک چبھن ایک جلن تھی

آتشِ دوزخ میں وہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی جلا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

جاتا ہوں داغِ حسرت ہستی لئے ہوئے
ہوں شمع کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

غالب کو اپنے غم و الم کا مداوا ہوتا نظر نہ آتا تھا کوئی ایسا نہیں ملتا تھا جو ان کے غموں کو دور کرتا اس لئے وہ طنزیہ لہجہ میں شکایت کرتے ہیں۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی

میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب

کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

وہ موت کو اپنے غموں کا علاج سمجھتے ہیں ؎

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

پھر بھی وہ ان پر آشوب حالات میں بھی اپنی بلند حوصلگی کا ثبوت دیتے رہے۔

یہ نعش بے کفن اسد خستہ جاں کی ہے

حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا

غم دوراں کے ساتھ غم جاناں بھی غالب کی زندگی کے ساتھ تھا۔ غالب ایک جذباتی انسان تھے۔ جن کی فطرت میں محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس کے ساتھ ہی ان کو اپنی انفرادیت کا بڑا احساس تھا۔ وہ میر کی طرح دور سے جلووں کے قائل نہ تھے بلکہ حسن کا قرب چاہتے تھے۔ محبوب کی بے اعتنائی اور غیرت اس کی رسم و راہ ان کے لئے بڑی تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے اور تو وہ کچھ کر نہ سکتے تھے۔ ہاں اپنے طنز کے تیروں کی بارش ضرور کرتے۔

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر سے ملنے میں رسوائی

بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

غالب محبوب کی ہر ہر ادا پر نثار ہوتے ہیں وہ اس کی بے نیازی اور بے تعلقی کو بھی ایک ادائے دلربانہ سمجھتے ہیں۔ لیکن محبوب کبھی ان کے ساتھ وفا نہیں کرتا۔ اسلئے وہ نہایت سادگی سے کہتے ہیں

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے

بے نیازی تری عادت ہی سہی

لیکن ہر معاملے میں مایوسی اور ناکامی نے ان کو بہت دل گرفتہ کر دیا تھا۔ حالات و زمانہ ان کے لئے انتہائی ناسازگار ثابت ہوئے۔ اس کے لئے وہ اپنی قسمت کو ذمہ دار ٹھہرانے لگے۔ اب ان پر محبوب کی عنایتوں اور نوازشوں کا بھی اثر نہیں ہوتا تھا۔ کیوں کہ محبوب کی خصوصیت بھی اب ان کے غم کا مداوا نہیں کر سکتی تھی۔ اتنے سارے غموں کے سامنے محبوب کی ان سے الفت بہت کم درجہ رکھتی تھی اور وہ انتہائی حسرت و افسردگی کے ساتھ کہتے ہیں۔

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ

اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

تری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں

ترے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

غالب غم کی انتہا میں سب کچھ کہہ تو جاتے ہیں۔ لیکن بعد میں ان کو اس کا احساس ہوتا ہے اور وہ معذرت کرنے لگتے ہیں۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اس مقام پر پہونچ کر بھی وہ اپنے دل میں حسرت تمیز رکھتے ہیں یہ غالب جیسے حوصلہ مند آدمی کا کام ہے۔ وہ نفسیات انسانی کے بڑے نباض ہیں کہتے ہیں ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

غالب غم کا اظہار بڑی ہم آہنگی سے کرتے ہیں۔

لگے دہے میں جب اتنے زہر غم تب دیکھئے کیا ہو

ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

غم کی انتہا میں وہ دنیا کو تھیٹر اور بچوں کا تماشہ سمجھنے لگتے ہیں۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

ہوتا ہے شب و روز تماشہ میرے آگے

غالب یہ بھی جانتے ہیں کہ دنیا میں ان سے زیادہ الم رسیدہ لوگ ہیں۔ اور اس طرح ان کو صبر آجاتا ہے خود اپنے آپ کو یہ کہکر تسلی دے لیتے ہیں۔

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ تیغ ستم نکلے

ان تمام باتوں کے باوجود یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ غالب کا سارا غم ناساعد حالات کا پیدا کردہ تھا ورنہ فطری طور پر وہ انتہائی رجائی واقع ہوئے تھے۔ شدید سے شدید غم کی وہ پروا نہ کرتے تھے۔ حد یہ کہ تعزیت کے موقع پر بھی وہ اپنے فطری انداز سے باز نہ آتے۔

حالی نے ان کو "حیوان ظریف" کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ کیوں کہ خود غالب کے اشعار سے ان کی اس افتاد طبع کا اظہار جا بجا ہوتا ہے۔ مثلاً ان کے یہ اشعار

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

میں نے کہا کہ "بزم ناز" غیر سے چاہیے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھکو اٹھا دیا کہ یوں

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کی رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

غالب کے یہ اشعار ان کی شوخی و ظرافت کو ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن باوجود وہ اپنی فطری شوخی و ظرافت کے باد مخالف کے جھونکوں کا شکار رہے۔ اور ناساعد حالات نے ان کے غموں کو اور جلا بخشی۔

شمس الدین شمیم

کہانی

پھاوڑے کی بیٹی

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو سری نگر)

آج اسے ہم نہیں چھوڑیں گے ..... نہیں چھوڑیں گے۔

"یہ ہمارے جھاڑو اور پھاوڑے روز روز کوڑا کرکٹ میں کیوں چھپا دیتا ہے۔؟"

"کتوں کا سالا"

اس نے تو ہماری ناک میں دم کر رکھا ہے۔

"آخر گگر میر اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے؟"

"بنیا لوگوں کو ستائے اور باپ تک جوں تک نہ رینگے"

ہفتے میں دو یا ایک بار محلے کے تمام خاکروب گگر میر کے مکان پر حملہ بول کر موٹی موٹی گالیاں دینے لگتے۔ کیونکہ گگر میر کا شریر بیٹا ظہور اس محلے میں رہنے والے خاکروبوں کے جھاڑو اور پھاوڑے ایک ویران احاطے کے کوڑا کرکٹ میں چھپا دیتا اور انھیں تنگ کرتا جس کی وجہ سے تمام خاکروب ٹوٹے پھاوڑے اور لاٹھیوں سے لیس ہو کر زبردست ہنگامہ کھڑا کر دیتے۔ اگر کبھی کبھار علاقے کا جمعدار نیل کھنٹھ خاکروبوں کو روکتا تو خاکروب اسے تنکے کی طرح دور پھینک دیتے اور زبردست ہنگامہ شروع کرتے۔ ہنگامے کا تماشہ قرب وجوار کے محلے والے بھی دیکھتے تھے۔ لیکن یہ ہنگامے کریم کی بیٹی نوری کے لئے قیامت بن جاتا۔ ہنگامے کے وقت اس کی حالت پاگلوں جیسی ہو جاتی۔ اس کے ابری سیب جیسے رخساروں پر آنسو ڈھلک کر رہ جاتے۔ وہ بے چین سی ہو جاتی اس کے تن و توش میں اسی طرح ارتعاش پیدا ہو جاتا جس طرح ایک خاموش جھیل میں کنکر پھینکنے سے ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ایک عجیب سی لڑکی تھی۔ بیحد حسین۔ گونگے ہونٹ سیاہ موٹی موٹی آنکھیں۔ متوازن جسم، نکھرا ہوا رنگ، مخروطی ہاتھ پاؤں اور بے حد شرمیلی۔ کسی کی طرف دیکھتے ہی چہرے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں تھر تھرانے لگتیں جس سے اس کا حسن اور نکھر جاتا۔ ہر شخص کو یہی احساس ہوتا تھا کہ نوری بھولے سے خاکروب کے گھر میں پیدا ہوئی ہے۔ وہ ایک ہیرا ہے۔ جو کیچڑ میں پھنس چکا تھا۔ محلے میں جتنے بھی خاکروب رہتے تھے ان سب کے بچے بے علم تھے۔ لیکن نوری کو پڑھنے سے دلچسپی تھی۔

ان کے لڑکے دن بھر گردن کے گرد سرخ سکارف باندھے منہ میں پان سگریٹ دبائے آوارہ گردی کرتے اور لڑکیاں دن بھر سولہ سنگھار سے اپنا دل بہلایا کرتیں۔ ان کے پاس وقت کی کوئی قید نہیں، کوئی قیمت نہیں۔ وہ نہ کسی کا احترام کرتے۔ اور نہ عزت۔ انھیں اپنے مستقبل کا کوئی خیال نہیں، کوئی غم نہیں تھا۔ نوری ان سب سے بالکل الگ تھلگ تھی۔ بچپن سے ہی تعلیم حاصل کرنے کا ذوق و شوق تھا۔ حالانکہ اس کی ماں زونی نے اس وقت دمے کی بیماری سے مر چکی تھی۔ جب نوری صرف چار سال کی تھی۔

زندگی کے پلڑے برابر کرنے اور اس کے نشیب و فراز سے مقابلہ کرنے کے لئے زونی بھی ایک سکول میں چپراسی کا کام کر کے اپنے خاوند کا ہاتھ بٹاتی۔ وہ نوری کو پڑھانا چاہتی تھی۔ لیکن وہ زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکی۔ اس نے نوری کو اجلی اجلی وردی پہنے اور کاندھے پر کتابوں کا چھوٹا سا بستہ لٹکائے ہوئے کبھی بھی سکول جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ اسی ارمان کو دل میں لئے

آخری ہچکی لیتے وقت کریم شیخ سے بولی تھیں۔
نوری کو پڑھا لکھا کر ہیڈ استانی بنانا!

یہ بات کریم شیخ کے ذہن کے پردے پر منقش ہوگئی اور اور اس نے صفائی کا کام کرنے کے علاوہ محلے کے نکڑ پر جوتوں کی مرمت شروع کردی۔ اور کافی جدوجہد اور محنت مزدوری کرکے نوری کو پڑھاتا رہا۔ نوری کی اعلیٰ ذہانت، تدبر، سلیقہ شعاری، فہمیدگی اور قابلیت پر سب حیران تھے۔ محلے کے تمام طبقوں کی لڑکیوں کا کردار ایک افق تھا اور خود نوری کا کردار چاند تھا۔ اگرچہ لوگوں کی زبان پر اس کی قابلیت، تعلیم، شرافت اور عالی ظرفی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اسے گندی نالی کا ایک حقیر کیڑا تصور کرتے تھے۔ اسے وہ جوہر سمجھتے تھے۔ جو گندے پانی سے بھرا ہوتا ہے۔ جب نوری نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور کالج میں داخلہ لیا۔ تو پہلے ہی دن کالج کے احاطے میں لڑکیوں کے طنز بھرے فقرے اس کے کانوں میں زہر گھولنے لگے تھے۔

لڑکیو! اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ صفائی ستھرائی کا کام اب ہوتا رہے گا۔!

ارے پروین سنو تو۔ اسینڈلوں اور چپلوں کی مرمت بھی ہوا کرے گی۔!

ہوسٹل بھی صاف ستھرا ہوا کرے گا۔!"

یہ فقرے کسنے کے بعد طالبات نے ہذیانی قہقہے بلند کئے تھے۔ پہلا طنزیہ فقرہ نوری کے محلے کی ایک طالبہ زلفی نے کسا تھا جو سید خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ زلفی کبھی راکھی اور کبھی ہیما مالنی کے انداز سے چلتی تھی۔ اور اکثر سینما گھروں کا طواف کیا کرتی تھی۔

زلفی کا فقرہ نوری کے دھڑکتے ہوئے دل میں ایک تیز رفتار تیر بن کر چبھ گیا اور ایک تلاطم سا اٹھ گیا جو بعد میں دھیرے دھیرے اس کے سارے بدن میں زہر بن کر پھیل گیا۔ وہ کانپنے لگی۔ اس کے عنابی رنگ کے گونگے ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ لیکن دیوار کا سہارا لے کر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور طعنوں کے تیر ہر وقت سہتی رہی اور خاموش رہی۔

خاکروبوں کی لڑائی کے وقت اس کے کان بجتے۔ گارے کی بوسیدہ جھونپڑی کے ایک کونے میں سہم کر اس کے سامنے لامحدود تاریکیاں ہی تاریکیاں۔ فرط احساس سے اس کے گونگے ہونٹوں پر خراشیں جیسے دھوپ میں سکھائی جانے والی مچھلیوں پر پڑ جاتیں۔ اس کا وجود لرز جاتا اور ذہن کے آبگینوں میں کھلبلی مچ جاتی۔ جونہی اس کا باپ کریم شیخ دیگر خاکروب لڑائی جھگڑے میں حصہ لینے کے لئے اپنے کاندھے پر رکھ کر گارے کی جھونپڑی سے باہر آتا۔ تو نوری بلک بلک اٹھتی۔ اور کہتی ——

بابا تم مت جاؤ — لوگ کیا کہیں گے؟ لڑائی جھگڑا اچھی بات نہیں — میں چاہتی ہوں تمام خاکروب بچے پڑھیں لکھیں — لیکن تم لوگ سمجھتے نہیں —

تمہیں میری قسم اگر تم بھی لڑائی جھگڑے میں رہو گے۔ تو جانتے ہو — کیا ہوگا؟

ایک دن میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی۔ بابا مجھ میں برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ بابا تم مت — یہ کہتے کہتے اس کی موٹی موٹی سیاہ آنکھوں میں سرخ ڈورے پھیل جاتے اور کریم شیخ پچاوڑا کونے میں رکھ کر نوری کو سنبھالتا اور دلاسہ دیتا۔ اور لڑائی میں شرکت نہ کرنے کا وعدہ کرتا۔

نوری کو کبھی کسی نے جھونپڑی کے باہر دھوپ میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ کبھی بھی اپنی یک منزلہ جھونپڑی کا پٹ کھول کر باہر نہیں دیکھتی۔ وہ محلے کی دوسری بہو بیٹیوں کی طرح دھوپ میں اپنے مکمل سیاہ بال کھلے نہیں چھوڑتی۔ کوئی عورت اس کے پاس آتی تو اس کی پلکیں بار بار جھک جاتیں۔ اور ایک حسین و جمیل عورت اس کا کتابی چہرہ دیکھنے میں محو ہو جاتی

ساتھ ہی اسے نوری کے پھاوڑے، جھاڑو اور جوتے یاد آجاتے اور اس کی نظروں میں پھر نوری کا کتابی چہرہ بھدا، بدصورت اور منحوس دکھائی دیتا۔ کالج جاتے آتے محلے کے من چلے اور اوباش نوجوان اس پر فقرے کستے اور اکثر کہا کرتے تھے۔!

ارے بھائی نور صاحب! اب پڑھنا وڑھنا چھوڑ دو۔ بہتر یہی ہے مونسپلٹی جوائن کر دو۔ ہاں یار نوری صاحبہ کو جمعدار بنا دیا جائے گا۔"

نوری یہ سن کر آہ تک نہ کرتی۔ بلکہ خاموشی سے کالج جاتی اور وہاں سے واپس آکر جھونپڑی کے اندر گھس کر کتابوں کا مطالعہ سے اپنا دل بہلاتی۔!

ایک بار جب اسے یہ محسوس ہوا کہ اس کا باپ کریم شیخ اب زیادہ کام نہیں کر سکتا۔ وہ اب بالکل لاغر اور بوڑھا ہو چکا ہے۔ تو اس نے محلے کی چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا لیکن یہ سلسلہ صرف چند دن تک ہی جاری رہا کیونکہ ان بچیوں کے والدین نے کہا۔" ایک نیچ ذات کی لڑکی ہماری بچیوں کو کیا درس دے سکتی ہے!"

یہ ہماری بے عزتی ہے"

ہم بچیوں کو کوڑا کرکٹ میں نہیں پھینکیں گے"

نوری کیچڑ ہے۔ اور اس کا مقام کوڑا کرکٹ ہے"

جب یہ باتیں نوری نے سنیں۔ تو ایک بار پھر اس کے جذبات کچل گئے۔ اسے اپنا وجود اور ہستی گندی نالی کے کیچڑ سے بھی زیادہ بدتر دکھائی دیا۔ وہ اپنے کانٹوں بھرے ماضی کی راہ گزر حال کی پیچیدگیوں اور مستقبل کی تاریکیوں کو کوسنے لگی۔ بعض اوقات وہ شدت غم سے تنگ آکر اپنی ہستی اور وجود کو مٹانے پر تیار ہو جاتی۔ لیکن ضمیر اسے ایسا کرنے سے روکتا۔ کبھی وہ کتابوں سے مساوات برادری اور اخوت سے متعلق مضامین پڑھ کر حیران رہ جاتی۔ اور گھنٹوں سوچتی رہتی کہ جب کتابوں میں مساوات لکھا ہے۔ قرآن شریف نے مساوات کا درس دیا ہے۔ تو پھر لوگ اور سماج کیوں مجھے نیچ سمجھتی ہے؟ میرے لئے سماج میں کیوں کوئی جگہ نہیں ہے۔

نوری کے بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد کریم شیخ ایک روز جب شام کو گھر آیا۔ تو اس نے جوتوں کی مرمت کے سامان کا ڈبہ پھاوڑا ایک کونے میں ڈال دیا اور پھر جھونپڑی کی بیچ بستر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں نوری اس کے قریب آئی۔ اور پاؤں دبانے لگی۔ کریم شیخ نے تھوڑا سا آرام کیا اور پھر نوری کے سر پہ ہاتھ پھیر کر بولا۔

بیٹا اب تم نے خوب پڑھا۔ اب میں مرنے سے پہلے تمہاری شادی دیکھنا چاہتا ہوں۔ بس اب اس بڑھاپے میں صرف یہی ایک ارمان ہے۔ آرزو ہے، تمنا ہے" جانتی ہو۔ تمہاری شادی کس کے ساتھ ہو رہی ہے؟

کریم شیخ کا یہ جملہ سن کر نوری شرم کے مارے بے حال ہو گئی۔ بار حیا سے اس کے رخسار سرخ ہو گئے۔ اور سارا بدن پسینے سے شرابور ہو گیا۔ وہ دوسرے کمرے میں شرم کے مارے بھاگ جاتی۔ لیکن جھونپڑی کا دوسرا کوئی کمرہ نہ تھا۔ بس یہی ایک کمرہ جو ان کی کائنات تھی۔

"جانتی ہو بیٹا۔ تمہاری شادی کس کے ساتھ ہو رہی ہے۔ وہ ہے ناصر شیخ کا بیٹا۔ علیا،" وہ کل ہی نوکر لگا ہے۔ ایک دفتر میں۔ موٹی تنخواہ ملے گی۔ صفائی کا کام کرتا ہے۔ اور وہاں سے فارغ ہو کر بڑے چوک کے نکڑ پر جوتوں کی مرمت کے عوض خوب پیسے کماتا ہے۔

"علیا، دفتر میں نوکر"

"صفائی کا کام"

"بے علم"

"بڑے چوک میں جوتوں کی مرمت"

یہ سن کر نوری گونگی ہو گئی۔ صرف اس کی موٹی موٹی سیاہ آنکھوں نے احتجاج کیا۔ پلکیں پانی سے لبریز ہو گئیں اور اس کے قطرے رخساروں پر پھیل کر سمٹ جاتی ٹپ ٹپ گر پڑے۔ اسے یاد آیا کہ علیا سے کالج جاتے

وقت بڑے چوک میں ڈھول بجا کر کہتا تھا — !

نوری اتنی بے رخی کیوں؟ ایک دن ضرور دل کی رانی بنا دوں گا"

"میں تمھیں اپنا کر تمھاری ساری کتابوں کو جلا دوں گا"

"ارے میری گلنار! ذرا ایک بار میری طرف تو دیکھ"

"کتابوں نے تمھیں مغرور بنا دیا ہے"

نوری چپ چاپ چلی جاتی اور دل ہی دل میں اس کم عقل جلیا کو کوستی رہتی — !

اس کی بات جب اس نے سنی تو ایک انقلاب سا آگیا۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہتا رہا۔ لیکن وہ گونگی بنی رہی۔ اس کے پاس احتجاج کا کوئی راستہ نہ تھا۔ لیکن اس روز کے بعد کریم شیخ نے نوری کے ساتھ کبھی بھی شادی کا کوئی ذکر تک نہیں کیا۔ بلکہ وہ اس بہت بڑے سوال کو ذہن کے اندر ٹالتا رہا۔ کبھی کبھی اس کے ذہن میں سوالوں کا کہرام مچ جاتا۔ لوگوں کی باتیں گونجنے لگتیں — !"

"نوری سیانی ہو گئی"

خاکروب برادری تمھیں طعنہ دے گی۔

بیٹی کی عمر بیس سال ہونے والی ہے۔

"کم بخت بیٹی کو گھر میں رکھا ہے۔

بے غیرت اس کی شادی نہیں کرتا۔

لیکن ان ساری باتوں کے باوجود کریم شیخ نوری کی شادی کا معاملہ ٹالتا رہا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ نوری کے لئے کوئی تعلیم یافتہ اپنی ہی برادری میں ملے۔ لیکن کوئی نہیں ملا۔ اپنی برادری سے باہر اگر کسی کے سامنے نوری کی شادی کا ذکر کیا تو لوگوں نے ہنسی اڑائی۔ مذاق سمجھا۔ طعنے دیئے — !

کریم تم اپنی اوقات بھول رہے ہو!

ہم تو خالص چمار ہیں اور تمھاری دوڑ گندی نالی تک۔

نوری کو کسی خاکروب کے پلے باندھ دو۔ اسی میں تمھارا بھلا ہے۔

اس صورت حال کو دیکھ کر کریم شیخ یہ سوال ٹالتا رہا، ٹالتا رہا اور یہی سوال اسکے جسم میں زہر بنتا گیا اور انگ انگ میں پھیلنے لگا۔

اس واقعہ کے پورے چار سال گزرنے کے بعد جب کریم شیخ زبردست بیمار ہوا اور اس کی زندگی کا درخت خزاں رسیدہ ہو گیا۔ تو اس نے نوری کو اپنے قریب لا کر دھیمی آواز میں کہا۔

بیٹا تم جانتی ہو۔ سماج اور دنیا کی نظروں میں ہماری حقیقت گندی نالی کے ایک کیڑے سے بھی بدتر ہے۔

میرا دادا بھی بھاوڑے کا بیٹا تھا۔

میرا باپ بھی بھاوڑے کا بیٹا تھا۔

میں بھی بھاوڑے کا بیٹا ہوں۔

اور جانتی ہو — تم بھی بھاوڑے کی بیٹی ہو۔ میں جانتی ہوں۔

تم نے جلیا سے کیوں شادی نہیں کی۔ وہ بے علم۔ جاہل اور پست خیالات کا آدمی ہے۔ وہ تمھاری تعلیم سے حقارت کرتا ہے تمھارے ساتھ کوئی بھی پڑھا لکھا نوجوان شادی کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس لئے میری ایک نصیحت یاد رکھو۔ تمھاری جوانی اب ڈھل چکی ہے۔ اس جھونپڑی کی چاردیواری میں رہو اور تمام خاکروبوں کی بچیوں اور بچوں کو پڑھاؤ۔ انھیں تربیت دو۔ تہذیب کا احساس دلاؤ — راستہ دکھاؤ — انہیں جہالت کے گھور اندھیرے سے باہر نکال۔ اگر ہمارا خواب پورا نہیں ہوا تو ہماری ذات کی نئی نسل کا خواب ضرور پورا ہو جائے گا۔ اس نئی نسل کیلئے ایک نئی صبح طلوع ہوگئی۔ نئی صبح طلوع ہو گی۔

کریم شیخ کی نصیحت سنکر نوری نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا تھا

ہاں بابا میں تمھاری نصیحت پہ ضرور عمل کروں گی۔

اور آج جبکہ نوری کے سر کے بال روئی کے گالے لگ رہے ہیں اور اسکا کتابی چہرہ ان گنت جھریوں کا نشیمن بن چکا ہے وہ ابھی بھی کنواری ہے۔ لیکن اسکے محلے کے تمام خاکروبوں کے بچے سکولوں اور کالجوں میں پڑھ رہے ہیں جن کو دیکھ کر نوری کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ جاتے ہیں۔ اور وہ اپنی فتح پر اطمینان کا سانس لیتی ہے۔ ★ ★

شفق سہسرامی

قافلے غباروں کے

انجم! تم میرے خیالوں سے چلے کیوں نہیں جاتے۔ کیوں یاد آتے ہو، کیوں خوابوں میں آکر پریشان کرتے ہو، کیوں سورج کی پہلی کرن کے ساتھ میرے تصور میں جاگتے ہو اور میں تمھیں اپنے سینے سے لگائے گھر کے کاموں میں مشغول ہو جاتی ہوں، امی کہتی ہیں گھر میں نوکرانی کے ہوتے تمھیں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے بہو، لیکن میں اس خوف سے کام میں مشغول رہنا چاہتی ہوں کہ کہیں کوئی میرے چہرے سے میرے دل میں چھپے چور کو نہ جان لے۔ جب میں خوش رہنا چاہتی ہوں تو تمہاری یاد مجھے ہر گھڑی اداس کئے رہتی ہے۔ اب اس نئی زندگی میں تو مجھے چین سے رہنے دو جس طرح ایک پجارن کو وقت پر خود بخود پوجا کا خیال آجاتا ہے اور وہ پھولوں کی تھالی لے کر مندر کے لئے روانہ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ثاقب کے کالج جانے کے بعد میں کمرہ بند کر کے تمھاری تصویر نکالتی ہوں، اس کی پوجا کرتی ہوں، اس پر آنسوؤں کی مالا چڑھاتی ہوں۔

لیکن میں ایک فرشتہ صفت انسان کو دھوکا دے رہی ہوں انجم، وہ کتنے اچھے ہیں، مجھے کتنا چاہتے ہیں بتا نہیں سکتی، سمجھو دنیا کا کوئی مرد اپنی بیوی کو اتنا نہیں چاہ سکتا۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے اُن کے قدموں میں جان دے دوں مجھے زندہ رہنے کا اس لئے حق نہیں کہ ایک دیوتا سمان پتی کی موجودگی میں ایک غیر مرد کی پوجا کرتی ہوں۔ یہ پوجا ہی سہی لیکن دنیا والوں کی نظروں میں پاپ ہے، گناہ ہے۔

خفا ہو گئے نگلے! میں نے تمھیں غیر کیوں کہہ دیا۔ ہم دل سے لاکھ ایک ہوں لیکن سماج کی نظروں میں تو غیر ہی ہیں نا؟ کئی بار میں نے سوچا، تمھاری تصویر پھاڑ ڈالوں، شاید اس طرح تمھیں بھول سکوں۔ لیکن تمھارے چہرے پر نظر پڑتے ہی میرا عزم پگھل جاتا ہے اور میں تصویر پر اپنا ہونٹ رکھ کر آنکھیں بند کر لیتی ہوں۔

ثاقب تمھارے بارے میں اکثر کہتے ہیں۔ انجم جمالی نے دو سالوں سے لکھنا شروع کیا ہے، لیکن اتنی مختصر مدت میں اپنا مقام بنا لیا، اُن کا سحر انگیز اندازِ بیان اور افسانوں پر چھائی ہوئی حقیقت ہی ان کی شہرت کا سبب ہے۔ شاید انھیں زمانے نے بہت ستایا ہے۔

میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ میں گھبرائی ہوئی نظروں سے اُن کی طرف دیکھ کر پوچھتی ہوں۔ یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ ہر فنکار کا اپنا اندازِ فکر ہوتا ہے اور اسی کے متعلق وہ اپنا اظہارِ خیال کرتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ ہر تخلیق کے

بھی فن کار خود کسی نہ کسی روپ میں ضرور موجود رہتا ہے، ثاقب سمجھاتے ہیں اور میرا دل چاہتا ہے وہ تمھارے متعلق بولتے جائیں، تعریف کرتے جائیں۔

پھر انجم جمالی کی کہانیوں کے ہیرو ہیروئن ایک ہی ہیں اور واقعات بھی ایک ہی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتے ہیں کچھ بھی ہو اُن کے افسانے دل کو چھو لیتے ہیں۔

اور میں مسرت سے جھوم جھوم جاتی ہوں۔ ثاقب کو کیا پتہ کہ دو سال پہلے تم ایک معمولی فن کار تھے۔ میں نے ہی تمھارا قلمی نام انجم جمالی تجویز کیا تھا اور آج تم بڑے فن کار بن گئے ہو، ثاقب کو یقین ہے کہ تم اپنی کہانیاں لکھتے ہو اور تمھیں ہیروئن سے بھی ہمدردی ہے۔ لیکن وہ کیا جانیں کہ وہ بدنصیب ہیروئن میں ہی ہوں۔ جو کھلے عام اپنی محبت کا اعتراف بھی نہیں کر سکتی، تمھارا نام بھی لیتے ڈر لگتا ہے، تمھیں وہ ساری باتیں یاد ہیں اور انھیں تم کہانیوں میں ڈھال دیتے ہو، کیا تم جانتے ہو کہ میں تمھاری کہانیاں پڑھتی ہوں؟ ضرور جانتے ہو گے کیونکہ ادب سے میری دلچسپی ہی ہماری محبت کا محرک بنی تھی، میں تمھارے یہاں سے پڑھنے کے لئے رسالے اور ناول منگواتی تھی اور پھر یہی رسالے ہمیں ایک حسین موڑ پہ لے آئے، میں تمھاری محبت کے سہارے انجان راستوں پر بھاگتی رہی، فضا میں پرواز کرتی رہی، لیکن اب جب کہ میرے پنکھ ٹوٹ چکے ہیں، تم مجھ پر رحم کرو انجم کہانیاں مت لکھو، تمھاری کہانیاں پڑھ کر میں پاگل سی ہو جاتی ہوں، ہفتوں اپنا سدھ بدھ نہیں رہتا۔ میری اس تبدیلی پر ثاقب پریشان ہو جاتے ہیں۔ کئی بار انھوں نے کہا بھی۔

اگر گھر والوں کی یاد آ رہی ہو تو چلی جاؤ۔ گھر والوں سے مل کر دل بہل جائے گا۔

وہ سمجھتے ہیں گھر جا کر میرا دل بہل جائے گا اور میں سمجھتی ہوں وہاں میں پاگل ہو جاؤں گی۔ جب تمھاری آواز سنوں گی تب تمھارا سامنا ہو گا جب تم گنگناؤ گے ـــہ

کتنی بے نور ہے چاند کی چاندنی کتنی پھیکی ہیں تاروں کی رعنائیاں ڈوبتا جا رہا ہے اجالے کا دل، بڑھتی جاتی ہیں ظلمت کی گہرائیاں تو کیا میں خود پر قابو رکھ سکوں گی؟ تمھارے شانے پر سر رکھ کر کھو جاؤں

پہلی بار جب تم نے یہ غزل گنگنائی تھی میں اپنے کمرے میں سونے کی کوشش کر رہی تھی، تمھاری آواز نے بے چین کر دیا، آسمان پر چاند کھل رہا تھا۔ موتیا اور بیلوں کے پھولوں نے فضا میں رس گھول دیا تھا۔ میں بے خودی میں تمھارے پاس پہنچ گئی۔

تمھاری آنکھیں بند تھیں، تمھارے ہونٹ ہل رہے تھے لفظوں کا سیال بہہ رہا تھا اور میں اُس میں بہی جا رہی تھی دل کی انجمن میں رنگ برنگے کنول کھل رہے تھے، کیف و سرور کے پیمانے چھلک رہے تھے۔

تم نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور میرے گرد بازو کر دئیے۔ تمھارے ہونٹ جھکے اور ساز و آواز ایک دوسرے میں گم ہو گئے۔

مجھے بھی ایک ایک بات یاد ہے انجم، سچ پوچھو تو اب یادوں کا سہارا ہے ورنہ اس ویران دل میں سکون کی ایک کلی نہیں۔ میں گھر آنے سے ڈرتی ہوں، میں خود پر قابو نہ رکھ سکوں، تم جادوگر ہو، تمھاری باتوں میں جادو ہے۔ تم میرے حواس پر چھا جاتے ہو۔ جو چاہتے ہو وہی ہوتا ہے میں تمھاری کوئی بات نہیں ٹال سکتی۔ اگر میں گھر آ گئی تو بھٹک جاؤں گی انجم، تم مجھے کہیں کا نہ رہنے دو گے، یہی سوچ کر میں نے اُن سے کہہ دیا میں گھر نہیں جاؤں گی، آپ سے زیادہ محبت گھر پر نہیں مل سکتی یہاں سے زیادہ سکون تو جنت میں بھی نہیں مل سکتا اور اُنھوں نے میری پیشانی چوم لی تھی۔ تم خوش رہا کرو آسو، میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتا۔

گھر میں مہمان آنے والے ہیں، شہلا کی شادی ہو رہی ہے۔ اگر کسی دن پہنچ نہ سکوں تو ناراض نہ ہو جانا، سنا ہے شہلا کا ہونے والا شوہر بہت خوبصورت ہے، بینک ملازم ہے اُس کے صرف ایک ماں تھی جس کا انتقال ہو

ہے اب مجھے جانے کی اجازت دو، بڑے ضدی ہو تم، کبھی خود سے اجازت نہ دی، ہمیشہ خوشامد کرتی تھی۔ جانے دو اگر امی نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا۔ اب امی کا ڈر تو نہیں سماج کا ڈر ہے۔ اس نے تصویر چوم لی۔

جب وہ کمرے سے نکلی تو آنگن میں بچوں کا شور تھا مہمان عورتیں باتوں میں مصروف تھیں۔ اس لئے وہ شہلا کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ شہلا بستر پر لیٹی ناول پڑھ رہی تھی۔ آسیہ کو دیکھ کر اُٹھ بیٹھی۔

دن میں کمرہ بند کرکے پوجا تو نہیں کر رہی تھیں بھابی! اُس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ میں کئی بار گئی، لیکن آپ کا دروازہ بند تھا۔

پوجا — وہ سہم گئی، ہاں پوجا ہی کر رہی تھی۔ تم کیا پڑھ رہی ہو؟

ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو شادی سے پہلے ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی لیکن شادی اس سے نہ ہو سکی، مگر شادی کے بعد بھی وہ اُسے بھول نہ سکی، اور جب جدائی کی آگ ناقابل برداشت ہو گئی تو جانتی ہیں اُس نے کیا کیا.... اُس نے رُک کر سوالیہ انداز میں آسیہ کو دیکھا۔

آسیہ کا دل دھک دھک کرنے لگا، چہرے پر پسینے کی بوندیں جھلکنے لگیں، وہ کچھ کہہ نہ سکی تو شہلا پھر بولی۔ ایک طرف فرض تھا دوسری طرف محبت۔ ایک طرف سکون تھا دوسری طرف بے چینی، ایک طرف آگ تھی دوسری طرف شبنم، اس کشمکش سے چھٹکارا پانے کے لئے اُس نے چند لمحے کی جلن قبول کر کے ہمیشہ کا سکون پا لیا اور.....

نہیں.... نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ کبھی نہیں ہوگا۔ خواہ میں مر ہی کیوں نہ جاؤں .... میں.... میں.... اور پھر جیسے وہ ہوش میں آ گئی۔ شہلا اُسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے شہلا، میں نہ جانے کیا بک گئی۔ میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔ وہ اپنے کمرے میں چلی آئی لیکن اُس کے دل میں ہیجان برپا ہو گیا تھا۔ اُس کے کانوں میں بار بار شہلا کا جملہ گونج رہا تھا۔

اس نے چند لمحے کی جلن قبول کر کے ہمیشہ کا سکون پا لیا۔ ہمیشہ کا سکون پا لیا۔ ہمیشہ کا سکون .....

پھر ثاقب کے قدموں کی چاپ پر اُس نے خود کو سنبھالا۔ اُنگلی کی کنگھی سے بکھرے بالوں کو جلدی جلدی جلدی درست کیا، چہرے پر زبردستی مسکراہٹ پیدا کی اور اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

ثاقب کمرے میں داخل ہوئے لیکن وہ بہت مضمحل سے تھے۔ ہاتھ کا رسالہ میز پر رکھ کر چپ چاپ بیٹھ گئے۔

کیا بات ہے؟ آپ پریشان سے کیوں ہیں؟ آسیہ کا دل دھڑکنے لگا۔

آج مجھے ذہنی صدمہ پہنچا ہے آسو۔ نہ جانے کیوں مجھے احساس جرم ہو رہا ہے، خدا جانے یہ بے چینی کیوں ہے؟

آخر ہوا کیا؟ اس کی گھبراہٹ بڑھتی گئی۔

انجم جمالی کا ایک افسانہ چھپا ہے افسانے کے ساتھ اُن کا خط بھی ہے، انھوں نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ اب تک وہ اپنی ہی کہانی لکھتے رہے تھے اور آج وہ اُسی لڑکی کی چوڑیاں کھا کر خودکشی ....

آسیہ نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی، صوفہ کا سہارا لیا لیکن اُس کے جسم کی طاقت زائل ہو چکی تھی، اُسے دور سے ثاقب کی آواز آتی محسوس ہو رہی تھی جو اُسے پکار رہے تھے۔ پھر اُس کا ذہن اتھاہ تاریکی میں ڈوب گیا۔

جب ہوش آیا تو ڈاکٹر اُسے دیکھ رہا تھا۔ ثاقب گھبرائے ہوئے اس کے سرہانے کھڑے تھے، گھر کے لوگ بدحواسی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے، اُسے ہوش میں دیکھ کر سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ جب وہ کمرے میں

تھا پھوڑ دی گئی تو بے اختیار اُس کی آنکھوں سے آنسو
نکل پڑے۔

یہ تم نے کیا کیا انجم مجھے ایسی سزا کیوں دی۔ اب
میں زندہ کیسے رہوں گی، مجھے اس کا یقین تھا کہ ایک دن تم
بھی شادی کرکے اپنی دنیا بسا لوگے۔ تمھاری ویران زندگی میں
بہار آجائے گی۔ لیکن تم نے خودکشی کرلی، اب یہ خیال مجھے ستاتا
ہے کہ میں قاتل ہوں۔ میں بے وفا ہوں، اور تم آخر وقت
تک وفادار رہے۔ تم نے محبت کی لاج رکھ لی اور آخری
وقت بھی میری ہی چوڑیاں کھا کر خودکشی کرلی۔

کتاب چھینا جھپٹی میں میری چوڑیاں ٹوٹ گئی تھیں،
میں نے جب انھیں چن کر پھینکنا چاہا تو تم نے میرے ہاتھ سے
لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ یہ نشانی میرے پاس رہنے دو۔

تم بھی عجیب آدمی ہو۔ نشانی بھی لی تو ٹوٹی ہوئی چوڑیاں،
کوئی بڑی چیز مانگو انجم، زندگی سے بھی بڑی۔

میرے لئے یہ چوڑیاں ہی بہت اہم ہیں میری زندگی۔
تم ان کی اہمیت سے ناواقف ہو۔

دیوانے ہو تم بالکل۔ میں نے تمھارے شانے پہ
سر رکھ دیا تھا۔

اور ہم دونوں اس سے بے خبر تھے کہ امّی یہ سب
دیکھ رہی ہیں۔

پھر ہمارے درمیان ایک آہنی دیوار کھینچ دی گئی۔
امی نے مجھے ڈانٹا۔

ابھی تمھیں اچھے بُرے کا ہوش نہیں ہے۔ انجم اور
تمھارا کوئی میل نہیں۔ کان کھول کر سُن لو، تمھاری شادی
اس نکھٹو سے نہیں ہوسکتی اور آج کے بعد تم اس دہلیز سے
قدم نہیں نکالوگی۔

اور پھر میں تمھاری ایک جھلک کو ترس گئی۔ روتی رہتی
تھی اور آج بھی رو رہی ہوں لیکن اب میں زندہ رہنا نہیں
چاہتی، یہ کیسے بھول سکتی ہوں کہ میں تمھاری قاتل ہوں۔

میں نے تمھارا خون کیا ہے، میں خونی ہوں خونی۔

آسیہ کی گرتی ہوئی صحت سے سب پریشان
ثاقب نے کہا۔ شہلا کی شادی کا دن ٹھہرا دینا چاہئے
اُس نے مخالفت کی، آپ بیکار پریشان ہیں، میں بہ
اچھی بھلی تو ہوں، سچ مچ، دیکھئے مسکرا بھی رہی ہوں
کام ہونا ہے ہو جائے تو بہتر ہے۔ وقت کو کون جو
اضطراب ہو جائے۔

اس کی ضد سے مجبور ہو کر شادی کی تیاری ہو
لیکن وہ اچھی ہونے کے بجائے مرجھاتی گئی، گالوں پہ زرد
آنکھیں زندگی کی چمک سے محروم ہو گئیں۔ مسکرانے
کرتی تو ہونٹ تنفر آمیز انداز میں سکڑ جاتے۔

جب شہلا کی برات آئی وہ تمام دن شہلا کے پاس
بیٹھی اُس کا چہرہ دیکھتی رہی، ثاقب کو باہر سے بلواتی،
وہ آجاتے اُس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہتا۔ عجیب
سے دیکھتی رہ جاتی۔ دن اسی طرح گذر گیا اور شہنا
بجنے لگیں، آتش بازیاں چھوٹیں تو جیسے وہ سوتے سے
جاگ پڑی۔

اتنے دنوں بعد ثاقب نے پہلی بار اُس کے چہرے پر
حقیقی مسکراہٹ دیکھی، آنکھوں میں زندگی سے بھر
سلیقے کا لباس اور میک اَپ۔ تتلی کی طرح گھوم
پھر رہی تھی، ایک بار ثاقب جب کسی کام سے آئے
اُس نے لوگوں کی نظریں بچا کر انھیں چوم لیا اور
وہ حیرت زدہ سے اُسے دیکھتے رہ گئے۔ جب دولہا کو رخصت
جانے لگی تو اُس نے ایک لفافہ دولہا کی طرف بڑھا
نئی زندگی مبارک ہو انجم! تمھاری ایک
میرے پاس تھی، اب اسے شہلا کو دے دو کہ
رکھے ——!!

انتخاب کلام

اقبال ماہر

یہ شہر ہے بپھرے ہوئے طوفان کی زد پر
ہر گھر یہاں مٹی کے گھروندے کی طرح ہے
سترنگ قبا اس کو دکھائی نہیں دیتی
سورج کا مسافر کسی اندھے کی طرح ہے
ہر دور میں ہر چیز بدلتی رہی لیکن
اک دردِ محبت ہے جو پہلے کی طرح ہے
پابندیٔ گفتار پہ یہ جذبۂ اظہار
پر بستہ و مجروح پرندے کی طرح ہے

سیف سہسوانی پوری

تہذیب کے چہرے ہیں چھپے گرد کی تہہ میں
ہر فتنہ بیاں کا ابھی انجانا لگے ہے
بیٹھا ہوں عقیدت کی جبیں اپنی جھکائے
ہر سنگِ سجود اپنا صنم خانہ لگے ہے

قدیر چشتی للت پوری

یہ زندگی ہے وہ صورت کہ جو دکھائی نہ دے
وہ اک صدا ہے جو نزدیک سے سنائی نہ دے
ابھی تو دو ہی قدم میرا ان کا ساتھ رہا
ابھی سے منزلِ ہستی ہو جدائی نہ دے

چندر پرکاش جوہر بجنوری

اے کاش کوئی ایسی بھی اک شمع جلا دے
اس دور کی جو تیرہ فضائی کو مٹا دے
ہر دل میں ہیں شائستہ آدابِ محبت
لیکن مجھے دنیا میں یہ توفیق خدا دے

تو ہین رہائی مجھے منظور نہیں ہے
ورنہ درِ زنداں سے چمن دور نہیں ہے
حالِ دلِ برباد پہ دو اشک بہا لوں
جوہر مجھے آج اتنا بھی مقدور نہیں ہے

طرفہ قریشی

کس کا غم، کیسی خوشی، اک خواب بے بنیاد تھا
آج سب کچھ بھول بیٹھے کل جو ہم کو یاد تھا
اپنی آہِ صبح گاہی تھی سپاسِ آرائشِ درد
اپنا ہر اشکِ الم صورت گرِ فریاد تھا

عبدالمتین نیاز

کچھ سوچ خلاؤں کی نہ سیاروں کا غم ہے
آفاق مرا دائرۂ فکر و قلم ہے
بے باک نہ ہو معترضِ وقت سے کہہ دو
تنقید کا قد آج بھی تخلیق سے کم ہے

نہ فرد کا نہ فقط ذات کا فساد ہے
مرے شعور و فکر میں کل زمانہ ہے

مجرم محمد آبادی

جنوں کہتا ہے میرے دم سے اک آستاں تک ہے
نہ جانے سلسلۂ کب سے ہے الفت کا کہاں تک ہے
پہنچ سکتا نہیں منزل پہ اپنے پاؤں سے چل کر
نظر جس شخص کی محدود گردِ کارواں تک ہے

آزاد گورداسپوری

آئے نہ جب فصلِ نمو — کیوں گل نہ ہوں بے رنگ و بو
آئینہ رکھ دو روبرو — پھر حسن کی ہو گفتگو
جو چاک دامن کے سیے — وہ کیوں کریں فکرِ رفو
رنگینیٔ غم کے لئے — اشکوں میں شامل ہے لہو

مہدی پرتاپ گڑھی

کسی چمن میں ٹھہرتے نہیں صبا کی طرح
گذر چلے ہیں زمانے سے ہم ہوا کی طرح
ہزار شمرِ جفاؤں پہ ہیں کمر بستہ
یہ دور ہم پہ مسلط ہے کربلا کی طرح
سروں پہ درد کا سورج، زمیں پہ خوف کی ریت
ہمارے عہد کا ہر روز ہے جزا کی طرح
بہت دنوں سے ہے خود اپنی جستجو مجھ کو
بکھر گیا ہوں فضاؤں میں اک صدا کی طرح
ہوا لگی نہیں شاید تمھیں زمانے کی
ابھی ہو تم کسی معصوم سی دعا کی طرح
مہک اٹھا مرے سارے وجود کا صحرا
تم آگئے ہو مرے پاس جب صبا کی طرح

مفتوں کوٹوی

ہر شے میں جس کو حسن کا منظر دکھائی دے
ذرّے میں اس کو مہرِ منوّر دکھائی دے
وہ بھی ہیں جن کو سارا سمندر ہے مشتِ خاک
وہ بھی ہیں جن کو قطرہ سمندر دکھائی دے
شبنم ہو یا ہو اشک، ہر اک کا مقام ہے
ہر قطرہ لازمی نہیں گوہر دکھائی دے

عابد عزیزی

شہروں کی خاک چھان کے اب سوچتا ہوں میں
کیوں چاند کی تلاش میں کھویا ہوا رہا
روئے وہ آسماں کو برسنے دو یہ گھٹا
مدت ہوئی کہ اس کا بہت دل دکھا رہا

بدنام نظر

گھر سے جو نکلا وہ افکار میں ڈوبا نکلا
شہر سمٹی ہوئی تنہائی کا صحرا نکلا
اجنبی جان کے جس شہر میں آیا تھا
وہ مرے پچھلے جنم ہی کا شناسا نکلا
ندیاں اُڑ گئیں دریا کے دہن سوکھ گئے
موسمِ ابر بھی اس سال کا پیاسا نکلا

قمر سنبھلی

وفا کا لفظ کسی بھی زباں سے ہو ادا
مجھے تو صرف تمھارا کہا ہوا سا لگے
جدھر بھی دیکھئے بے چہرگی کا منظر ہے
اب آئینہ بھی تو کچھ جھوٹ بولتا سا لگے
شناخت کس کو کریں شہر میں کہ ہر چہرا
غبارِ درد و الم سے اٹا ہوا سا لگے

خیالِ دوست کی سویا ہوں تان کر چادر
چلے گا اب نہ حوادث کی دھوپ کا جادو
یہ آڑی ترچھی لکیریں نہیں ہیں کاغذ پہ
مرے قلم نے انڈیلا ہے بوند بوند لہو

خان ارمان

پھر اس کی یاد، مرات کلیجہ کھرچ گئی
یا مرا ہرا ہرا سا تمنا کا گھاؤ ہے
میں، اک سلوک ناز ہی ٹھہرا حریف جاں
کہتے ہیں جس کو حسن، فقط اک رکھاؤ ہے
یہ بھی بجا کہ تو ہی نہیں مرکز نگاہ
یہ بھی درست ہے کہ تجھی سے لگاؤ ہے

ساحل احمد

اگتے سورج کا پوجنا مت چھوڑ
چڑھتے سورج کا ہے زمانہ دیکھ
شبنم کو تلخیوں سے بھر دوں گا
اب مرا عزم جارحانہ دیکھ
میرے کمرے کی روشنی میں آ
دھوپ سورج کی غائبانہ دیکھ

عالم بیرہ پوری

غم حیات کا تلخ آب پی رہے ہیں مگر
سسک سسک کے چھلکتے ہیں دل کے پیمانے
خدا کے نام کو جو بیچ دے سر بازار
اسی کا ناز اٹھاتے خدا کو شرم ہے

بدر حیدر آبادی

مسکرائی جو کلی، کوند پڑی ہے بجلی
آشیانے کو بھڑکنا پڑا خمیازۂ گل
نکہت باد بہاری تو ذرا اتنا بتلا
تو نے چھیڑا تھا کہ خود وا ہوا دروازۂ گل

حبیب ہاشمی

ہر شب غم کی سحر ہو یہ ضروری ہے مگر
ہر سحر رشک قمر ہو یہ ضروری تو نہیں
تھک کے بیٹھا ہوں بہت دیر سے جس جادۂ سمت
تیری ہی راہ گذر ہو یہ ضروری تو نہیں

عبدالوہاب صدا

دل دھڑکنے لگتا ہے، دیکھتے ہی طوفان کا
لے کے جب بھی عزم نو کوئی موج بڑھتی ہے

حسن بشیر

زباں سے لفظ جو بولا گیا تھا
کئی کانٹوں میں وہ تولا گیا تھا
کسے معلوم تھا میں کھل اٹھوں گا
مجھے کیچڑ میں جب گھولا گیا تھا

صبا نقوی

اپنا غم یاد رہا، اُن کی خوشی بھول گئے
یاد رکھنے کی تھی جو بات، وہی بھول گئے
وحشت دل کا بھرم کھلتے ہی سب دیوانے
طائر عقل کی بے بال و پری بھول گئے

محبوب انور

اب کے برس بہنا دو میرے دست و پا میں پھر زنجیر
سنتے ہیں زنداں کی سلاخیں یاد ہیں میری دلگیر
سپنوں میں کل رات جو اترا طیارہ یادوں سے بھرا
درد سے اب تک چیخ رہا ہے میرے بدن کا ہر شہتیر

قمر صدیقی

لوگ کہتے ہیں کہ جینے کی دعا دی جائے
کیا ضروری ہے کہ مجھ کو یہ سزا دی جائے
وہ تو کعبہ میں ملا اور نہ صنم خانے میں
آؤ اب اس کو در دل پہ صدا دی جائے

تسلیم انجم

ذہن کے شیشے سنگسار ہو گئے
حادثے ایسے بار بار ہو گئے
جسم گیتی کے سارے ملبوسات
قدر ماضی تھے، تار تار ہو گئے

گھر میں خود آگ لگا دی جائے
پھر گلے کو صدا دی جائے
انجم اس عہدِ ستم کوشی میں
آؤ کچھ دادِ وفا دی جائے

محسن جلگانوی

پاس جتنا آئے وہ بٹتا گئے
سایہ سایہ اس کا قد گھٹتا گئے
مجھ کو ڈس لے لفظ کی ناگن کوئی
زہر میرے کرب کا گھٹتا گئے

شاداں گوالیاری

پہنچ سکا نہ حسن تک کبھی خرد کا قافلہ
لگے فریبِ راہبر، گئے تیود کارواں
نہ ہے شکوکِ باہمی تسلسل رہی ہے کائنات
نہ جانے کیسی آگ ہے اِدھر دھواں اُدھر دھواں
تری نگاہِ جستجو ادھر اُدھر اُلجھ گئی
وگرنہ اے تلاشِ دل جبیں تھی خود بھی آستاں

جالب وطنی

معلوم نہیں جس کو پتہ اپنی گپھا کا
کیا رستہ بتائے گا مجھے غارِ حرا کا
یل کھاتی رہیں یوں ہی اگر غم کی ہوائیں
شیرازہ بکھر جائے گا اک روز انا کا
تحلیل ہوئی جب بھی سمندر میں خموشی
موہوم سا اک نقش اُبھر آیا صدا کا
رنگین ورق لے گیا چہرے سے اڑا کر
جھونکا تھا بہت شوخ زمانے کی ہوا کا
اس طرح نہ لے وقت تو جالب کی تلاشی
انجان مسافر ہے ابھی دشتِ فنا کا

دیتا ہے شکست مجھے اپنی چال سے
شطرنج کھیلتا ہے فلک اس خیال سے
سنگِ طلب نہ پھینک تعلق کا پیڑ ہے
اُڑ جائے گا پرندہ خوش رنگ ڈال سے
نازک سی اک صلیب پہ جالب وہ گھونسلہ
ویران ہے میرے دل کی طرح چند سال سے

ضمیر خاں ضمیر

بتاؤں دورِ ترقی نے کیا دیا مجھ کو
کہ غم میں کر دیا تا عمر مبتلا مجھ کو
مرے وقار کا تیشہ ہے زنگ آلودہ
یہ آج اپنے کیے کی ملی سزا مجھ کو
اداسیوں کا یہ جنگل بڑا گھنیرا ہے
خوشی کا چاند اُگانا ہے اب نیا مجھ کو

مظفر النساء ناز

ہتھیلیوں پہ بنائے تھے نقش جو تم نے
بہت ہی چاہا مگر میں انھیں مٹا نہ سکی
کچھ ایسا لگتا ہے آنسو مرے مقدر میں
ہجومِ عیش تھا لیکن میں مسکرا نہ سکی۔ ★

بزمِ شاخسار

سید علی رضا حسینی ـــ کانپور

بہت دنوں کے بعد شاخسار ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴ ایک ساتھ پرچون ایک صاحب کے توسط سے دیکھنے کو ملا۔ "میرا صفحہ" بہت پسند آیا۔ غزل اور اینٹی غزل کی بحث بڑی دلچسپ ہے۔ مگر آپ کا محاکمہ خود اتنا مدلل، مستحکم اور معقول ہے کہ وہ سب زیادہ پسند آیا نیز صنفِ غزل کا مقدر خود بڑا مضبوط مقدر ہے کتنی جاندار صنف ہے کہ اتنے حملوں کے بعد بھی زندہ ہے۔ حالی سے لیکر آج تک یہ غریب فنکاروں اور نقادوں کے حملے کا شکار رہی ہے۔ مگر ہر حملہ کے بعد ایک نئی قوت اور توانائی لیکر نکلی۔ اردو ادب کو فارسی کے بعد جتنا اس صنف نے متاثر کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی اور صنف نے متاثر نہ کیا ہوگا۔ تنقید اور تجربے بھی جتنے اس غریب پر ہوئے ہیں نظم کو چھوڑ کر کسی دوسری صنفِ سخن پر نہ ہوئے ہوں گے۔ انتہا یہ ہے کہ غالب بھی اس کے حملہ آوروں میں شامل تھے۔ مگر ان کے کام کی چیز یا تو ان کے خطوط ہیں یا پھر "طرفِ تنگنائے غزل" اور انھیں دو چیزوں سے ان کا نام زندہ ہے۔ زندگی کا یہ بھی عجب مذاق ہے کہ جو چیز کسی کے لئے "بیرنگ شفت" کا درجہ رکھے وہی مشاعروں میں پیش کی جائے۔ اور اسی سے پیسے کمائے جائیں۔ میں نے جدید شاعروں میں سے کسی کو مشاعروں میں اینٹی غزل پیش کرتے نہیں دیکھا۔ غزل کی مقبولیت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اب مشاعرے نہ مشاعرے رہ گئے ہیں اور نہ وہ دوسری اصنافِ سخن کو اپنے دامن میں جگہ دیتے ہیں۔ وہ مشاعرے اور صرف مشاعرے بن کر رہ گئے ہیں اور [illegible] ہے تو روائتی غزل اس لئے کہ اس میں رس، نغمگی، کیف، گہرائی۔ اور گیرائی ہے۔ بات اینٹی غزل سے شروع ہوکر کہیں سے کہیں پہونچ گئی۔ اس خوف سے کہ مراسلہ، مقالہ نہ بن جائے ختم کرتا ہوں، شمارہ بہ حیثیت مجموعی پسند آیا۔ محسن زیدی اور نامی انصاری صاحبان کی غزلیں پسند آئیں۔

حرمت الاکرام صاحب کی نظم بہت اچھی ہے۔ آپ کا مقالہ "مولویانہ تنقید" پسند آیا مگر تھوڑا ذاتی سا ہو گیا ہے۔ کاش جو اصول آپ نے مرتب کئے تھے ان کی بنیاد پر اگر کچھ اور لوگوں کو بھی شامل کر لیتے تو معلوم نہیں کتنے چہرے اس آئینہ میں دکھلائی دے جاتے۔ افسانوں کو ابھی پڑھ نہیں سکا ضیا حسینی صاحب کا طنزیہ "جوتے کا سفر" بہت اچھا مضمون ہے۔ یہ میرے کالج کی بزمِ ادب کے ایک جلسہ میں پڑھا گیا تھا جس کی صدارت بھی ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب نے کی تھی۔ اس جلسہ میں بھی یہ طنزیہ بہت پسند کیا گیا تھا۔ امید ہے کہ قارئین شاخسار بھی اسے پسند کریں گے۔

شاخسار کو بہت دن بعد دیکھنے کا موقع ملا۔ امجد نجمی صاحب کی ادارت اور آپ کا گرانقدر یہ رسالہ خوب سے خوب تر، کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ چشم بد سے خدا محفوظ رکھے آجکل تو اردو کے رسالوں کے بارے میں یہی خبر [illegible] لگتی رہتی ہے کہ ملک سے اتنے خوبصورت اردو رسالہ کا نکلنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ "میرا صفحہ" رسالہ کی جان ہے۔

"خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ"

سالک لکھنوی۔ کلکتہ

آداب عرض ہے۔ شاخسار کا مشترک شمارہ ۱۳تا۱۴
الحمد للہ! کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔؟ آپ یاد فرما لیتے ہیں۔ میں بارِ احسان سے اور زیرِ بار ہو جاتا ہوں۔!

آپ کے مرتب کردہ "حضرت احمد نجمی کے خطوط" نظر نواز ہوئے۔ بہت دلچسپ، سبق آموز اور معلومات افزا ہیں۔ میں ان کی بلند مقام شاعری سے واقف ہوں۔ اور ان کی ہستی کو محترم و مغتنم سمجھتا ہوں۔ یہ خطوط ان کے تصوف و اسلامیات سے شغف و وابستگی اور فارسی شعر و ادب پر گہری نظر کی غمازی بھی کرتے ہیں۔

لیکن دو خطوں نے مجھے کسی قدر الجھن میں ڈال دیا۔

۵ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو جو خط لکھا ہے (ص ۱۳) اس میں حضرت نجمی نے ناسخ لکھنوی کی اپنے شاگرد برق لکھنوی پر ایک اصلاح پیش کی ہے۔ برق کا شعر ہے۔ ؎

"اس گل نے ایک رات جو پہنا تو بس گیا
بوئے گلاب آتی ہے موتی کے ہار سے

ناسخ کی اصلاح ہے۔ ؎

"بو موتیے کی آتی ہے موتی کے ہار سے!"

میرے خیال میں شعر اصلاح سے قبل زیادہ معنی خیز اور چست تھا۔ توضیح اصلاح بزبان ناسخ جو پیش کی گئی ہے وہ تو بالکل سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ ناسخ اور ان کے بعد تک کے دورِ شاعری میں لکھنوی شعراء رعایتِ لفظی و ایہام کا بری طرح شکار رہے۔ اور اسی طرح کو بلندیٔ فکر و فن سمجھتے تھے۔ اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ناسخ کی اصلاح کو دیکھا جائے تو محسوس ہوگا۔ کہ اصلاح نے نہ صرف شعر کے معنی بدل ڈالے بلکہ اسے بے معنی کر ڈالا۔

شاعر (برق لکھنوی) معشوق کو استعارتاً گل یعنی گلاب سے تشبیہ دیتا ہے۔ اور صرف اتنا کہنا چاہتا ہے کہ معشوق یا محبوب نے ایک شب موتیوں کا ہار پہنا تو اس ہار سے بھی گلاب کی خوشبو آنے لگی۔

"جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد!"

ناسخ خدا جانے موتیے کے پھول اور گلاب کے ہار کہاں سے لے آئے۔ جو اصلاح دیتے ہوئے فرما گئے کہ — "گلاب کے ہار منڈر یا مٹھ کے پجاری پہنتے ہیں شرفا نہیں پہنتے"

ایک اور بات جو کھٹکتی ہے وہ یہ کہ لکھنؤ اور اطراف کے مٹھ مندر کے پجاری نہ پہلے کبھی گلاب کے ہار پہنتے اور نہ آج پہنتے ہیں۔ پجاری اور مہنت گیندے کے ہار پہنتے ہیں اور دیوی دیوتاؤں کی مورتوں پر چڑھاتے بھی ہیں۔ گلاب کے پھولوں کے ہار رواج انگریزی تہذیب کے سر چڑھنے کے بعد ہوا جس کا نظارہ آج بھی ہر جلسہ میں دیکھا جاتا ہے۔

سچ ہے بڑوں کی چوک بھی بڑی ہی ہوتی ہے۔

دوسرا خط ۱۱ نومبر ۱۹۶۴ء کا ہے (ص ۱۶) اس میں ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد ایک انگریز کا ذکر ہے جو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی کی کسی مجلس وعظ میں شریک ہوا۔ مجھے بصد ادب صرف اتنا عرض کرنا ہے ... حضرت شاہ عبدالعزیز کا وصال ۱۸۲۴ء کی جنگِ آزادی سے چونتیس سال قبل ۱۲۳۹ھ میں ہو چکا تھا اسلئے ۱۸۵۷ء مطابق ۱۲۷۳ھ میں یا اس کے بعد حضرت شاہ عبدالعزیز کی کسی مجلس وعظ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ممکن ہے یہ واقعہ ۱۸۲۳ء کے لگ بھگ پیش آیا ہو جبکہ شاہ عبدالعزیز کا فیض جاری تھا اور حضرت سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی وہ تحریک جہاد آزادی جاری تھی جس کی انگریز حکومت کو رشہ بدنام کرتی تھی اور جس میں شمولیت بیدار شاعر مومنؔ کو بھی تھا

[illegible] بھی [illegible] نصیب

یہ [illegible] نصیب!

(مومن دہلوی)

— ۲ —

فیاض گوالیاری ـــــــ گوالیار

آپ نے شمارہ ۲۳-۲۲-۲۱ کو ایک گلدستے کے روپ میں بہت اچھا سجایا ہے۔ مضامین نظم و نثر چیدہ چیدہ اور غزلیں دلآویز ہیں اس شمارے میں آپ نے انتی شاعری اور انتی غزل کی بحث خوب چھیڑی ہے آپ نے جن شاعروں اور نقادوں سے اس سلسلے میں پوچھا ہے کہ ان میں سے نمبر چار کی رائے فی الواقعی بہت متوازن اور معقول ہے۔ ان کی تنقید صالح اور پروقار ہے۔ میری نظر میں جدید غزل خیالات اور تجربات کو سنجیدگی اور جسارت سے اظہار کا نام ہے تو انتی غزل (جیسنر) ہزل کی چھپی دبی شکل ہے۔ جدید غزل کی طرف رجحانات بیسویں صدی کے اوائل ہی سے پائے جاتے رہے ہیں۔ وہ لوگ اسے جدت خیال اور جدت ادا کا نام دیتے تھے۔ آج کے جدید شاعر اسے بغاوت کا روپ دیتے ہیں۔ اور بسا اوقات یہ بھی نظر انداز کر دیتے ہیں کہ غزل کا لازمی جزو کیف و تاثر ہے ایسی کھردری اور سپاٹ قسم کی شاعری .... جس میں نہ کیف ہو نہ تاثیر ایک کھوٹا سکہ ہے۔ جو زیادہ دن نہیں چل سکتا۔ انتی شاعری اور انتی غزل، کے الفاظ کی ایجاد، ہندی زبان میں اگو تیا۔ اور آگیانی قسم کے الفاظ کی ایجاد کے بعد ہوئی ہے جنکا میں کو تیا کے پہلے حرف (آ) "اُ" لگا دینے سے ایک بانکپن کے ساتھ کو تیا کی پرانی روش سے انحراف کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ان اللہ کے بعد کہ ان جیسا کوئی لفظ اظہار انحراف کے لئے اردو میں نہیں ملا۔ بے غزلہ ناغزل کہتے بھی گھبرائے اور غیر غزل بھی، اس چیز کا نام رکھنا مناسب نظر آیا جسے ہم خود کی غزل کا متوازی [illegible] پایا گیا۔ اس کا جواب پیدا کیا اور کہیں۔ اس قبیل کی انتی غزل کسی دلکشی حد تک منفی جذبہ ہی پیدا کرتی ہے یا کسی "کو کاٹی" : قسم کی حقیقت کا مظہر ہے [illegible] آپ نے اس کی اہمیت۔ میں بڈھا ہوں میری بیوی جوان ہے میری بندوق میں گولی کہاں ہے، یا میری بندوق لوہے کی [illegible] ہے۔ سے زیادہ قرار نہیں دی۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔

نصر قریشی ـــــــ الہ آباد

شاخسار کا تازہ شمارہ (۲۳،۲۲،۲۱) موصول ہوا۔ اس مرتبہ تو پرچہ اتنا صاف ستھرا اور دلآویز ہے کہ سابقہ شماروں سے مختلف ہی نہیں بلکہ صالح ترین ادبی نظریات کا آئینہ دار بھی ہے۔ آج کے جانے پہچانے قلمکاروں کے علاوہ ادبی کینوس پر ابھرنے والے نئے خاکے بھی پیش کرتے ہیں۔ شاخسار، آہنیں حصار توڑتا نظر آتا ہے اور ایک مخصوص، محدود حلقے کا مرکز نشر و اشاعت نہیں ہے۔ کم از کم ایسے جرائد با صلاحیت فنکاروں کے سچے احساس کمتری کے اندھے غاروں سے نکلنے میں معاون ہوتے ہیں۔ ورنہ بنر شعر و ادب پر کالے شبدوں [illegible] ہی مبلغ نظر آتے ہیں اور سند خلافت بانٹتے پھر رہے ہیں۔ ان کا یہ بھی نظریہ ہے کہ جب تک ہم توجہ نہیں دیں گے اور اپنے نشر میں شامل نہیں کریں گے یا چند مخصوص جرائد کی خیرات نہیں دیں گے کسی کا شہر ادب میں در آنا ناممکن ہے۔ حالانکہ بھرپور آواز یہی سناٹوں کا طلسم توڑنے میں [illegible] کاموں [illegible] اہل ادب سے بے لوث سپردگی اور [illegible] ہے۔ یہ وہ ان تو سامعنا اور آپ ہی کا حصہ ہے ورنہ [illegible] پانے کے باوجود "آہم"، اندھی و شادیں میں بھٹکتا [illegible] اور کھادے کا بیوگ، تیاگ جلد ہی بھگتو بادی [illegible] لگتا ہے۔

ملک کے دل و دماغ میں بیٹھے پھٹے باقی فنکاروں

کی خصوصیت " شاخسار کی مقبولیت کا آئینہ دار ہے اور خصوصی مطالعوں کے سلسلے میں دیگر صوبوں کے فنکاروں کی تخلیقات نمایاں انداز میں پیش کرنے میں بھی مثالی ہے میرے خیال میں خصوصی مطالعے میں پیش ہونے والے فنکار "میں کا تعارف" خود بھی پیش کریں تو قارئین ان کے نظریۂ شاعری اور وابستگی کے راز سے بھی واقف ہوسکیں گے۔ اس سے یہ بھی فائدہ ہوگا کہ اپنا بیانِ بلاغت نظام دینے کے بعد موقع پرست دل بدلی کرنے پر فوراً پہچان لئے جائیں گے اور ان کی تحریر کا آئینہ اصلی چہرہ ہمیشہ سامنے پیش کرتا رہے گا۔

شعری و نثری مشمولات ترتیب و تزئین کا حسین امتزاج پیش کرتی ہیں۔ پرچہ مجموعی طور پر بہت پسند آیا۔

ہر ایک شعر

دوستو مملکتِ غم کا کوئی اور نہ چھور
اسمیں خورشید کبھی کا ہے کو ڈوبا ہوگا

سید حرمت الاکرام

* *

"جہاں تک آپ کی غزلوں کا سوال ہے وہ جدت و قدامت کے درمیان ایک ایسا نقطۂ مفاہمت ہے جس کی مثال آپ کے معاصرین میں کم ملتی ہے۔ بعض اشعار تو ہم بوڑھوں کے لئے بھی قابلِ رشک ہیں۔"

(علامہ جمیل مظہری)

"آپ کے کلام کی خصوصیت اس کا نہایت پرخلوص، تہذیب یافتہ لب و لہجہ ہے۔ جس میں ڈھل کر سنگین سے سنگین موضوع میں دلآویزی اور بانکپن پیدا ہوتا ہے۔ آپ ہندوستانی کلچر کی بہترین روایت سے منسلک ہیں اور اس وابستگی کا حسن آپ کے پورے کلام کو منور کر رہا ہے۔"

(بلراج کومل)

اردو زبان کا منفرد علمی وادبی جریدہ

ماہنامہ

شاخسار

مئی سنہ ۱۹۷۳ء

اشاعت کا نواں سال

شمارہ ۔۔ ۴۸

مدیر اعلیٰ :۔ امجد نجمی

(صلاح کار)

سید حرمت الاکرام

سید اولاد اصغر رضوی

احمد حسین آزاد

معاون :۔ مالک لکھنوی

قیمت :۔ ۷۵ پیسے

زر سالانہ :۔ ۹ روپے

پتہ

بخشی بازار کٹک نمبر ۱ (اڑیسہ)

مطبوعہ

سرفراز قومی پریس لکھنؤ

ترتیب

فرقت صاحب

(ضیاء حسینی)

آخر اردو والوں کو کیا سوجھی ہے۔

نہ بیمار ہوتے ہیں، نہ عزیز و اقارب پر تیمارداری کا بوجھ ڈالتے ہیں۔ نہ احباب کو عیادت کے لئے بلاتے ہیں۔ نہ اخبار و جرائد میں خبر علالت چھپواتے ہیں اور نوٹس دیئے بغیر دھیرے سے کھسک لیتے ہیں۔

خاموشی سے کھسکتے رہنا کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔

فرقت بھائی! احتشام صاحب کی المناک موت سے ہمارے دل چور چور تھے۔ کہ آپ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔

آپ کا اس طرح بہ عجلت داغ مفارقت دینا کچھ جچا نہیں زندگی اور موت میں کچھ تو مطابقت ہونی چاہیئے۔ آپ نے زندگی اس طرح بسر کی کہ کسی دن چین سے نہ بیٹھے اور ہمیشہ ہنگامے برپا کرتے ہی رہے۔ اور مرے اس طرح کہ آہٹ بھی نہ ہوئی۔ عزیزوں، دوستوں اور عقیدت مندوں سے دور عین عالم سفر میں موت کے گھاٹ اندھیرے میں چھپ گئے۔

مرنا برحق ہے۔ لیکن آپ ٹھنڈے دلوں اس حقیقت کو تسلیم نہ کرتے تو آپ کا کیا بگڑ جاتا۔ درست ہے آپ حقیقت پسند تھے۔ لیکن آپ اس گھڑی کو بمصلحت ٹال جاتے تو آپکی حقیقت پسندی کو کوئی خاص ضرب نہ لگتی۔ صاف بات یہ ہے کہ آپ زندگی میں نہ موقع محل دیکھتے تھے اور نہ مصلحتیں پیش نظر رکھتے تھے بلا کے منہ پھٹ تھے۔

اگر آپ بات منہ سے نکالنے سے پہلے اس کے نتائج پر غور کر لیا کرتے اور مصلحتوں کو پیش نظر رکھتے تو آپ بیمار اور معطل زندگی کو اپنے کاندھوں پر لئے دم آخر تک شہر شہر قریہ قریہ مشاعروں میں نہ جاتے اور نہ آپ مرنے کی اس قدر عجلت کرتے۔

آپ اپنی ڈائری میں پتہ ٹھکانا لکھ کر ابدی نیند سو گئے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ موت کو گلے لگانے کے لئے تیار تھے اور اب آپ کے اس عمل پر پوری طرح غور کرنے سے یہ بات سامنے آگئی ہے کہ اس اچانک روانگی کی سازش میں آپ خود بھی شامل تھے۔

ادھر آپ کو اپنی زندگی سے کوئی لگاؤ نہیں رہ گیا تھا اور آپ ہر دن موت کو آواز دیا کرتے تھے۔ میرے محترم، اس صورت حال کے آپ خود ہی ذمہ دار تھے۔ بات یہ ہے کہ آپ نے ڈھنگ سے زندگی گزارنے کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔ ذرا سی بات دل کو لگی جھٹ سے ایک طنزیہ لکھ مارا اور اس دوگنا خط بھی۔ کھری کھری سنانا جیسے آپ کی عادت بن گئی تھی۔ آپ کے چند مخلص دوست ان شعلہ فشان تخلیقات کو برابر اپنے جرائد میں جگہ دیتے رہے۔ اگر یہ ایڈیٹر بھی بے نیاز ہو جاتے تو بندہ نواز! آپ ایک ایک سطر چھپوانے کو ترس جاتے۔"

یہ آپ کی کون سی حرکت تھی کہ جدیدیوں کا ڈنکا دنیائے ادب میں بج رہا تھا اور آپ نے ان کے بخیئے ادھیڑنے شروع

کردئیے۔ وقت کے تقاضوں سے منہ پھیر لیا۔ کوئی دانش مندی نہ تھی۔ اس موقع پر ہمیں اعتراض کر لینے دیجئے کہ آپ جدید ذہن رکھنے والے ذکی و فہم احساس اور باشعور ادیب تھے اور آپ کسی کونے سے روایتی نہ تھے پھر آپ خواہ مخواہ جدیدیت سے کیوں الجھ پڑے۔؟ اور اس بات پر غور نہ کیا کہ طوفان آیا ہے، ریلے میں خس و خاشاک بہہ جائیں گے اور آخر میں صاف شفاف پانی رہ جائے گا۔ لیکن مشکل یہ ہے چین سے بیٹھنا آپ نے سیکھا نہ تھا۔

آ ابیل! مجھے مار یہ ہمیشہ آپ کا عمل رہا۔ چھوڑیئے ادب کے معاملے کو، آپ ان لیڈروں کو بھی نشانۂ طنز بنا لیتے تھے۔ جن کی ذرا سی جنبش قلم سے آپ کی زندگی سنور سکتی تھی۔ لیکن آپ نے اس اہم بات پر تو کبھی غور ہی نہیں کیا۔ اور وہی بات کرتے رہے جو آپ کی زندگی کو زیادہ سے زیادہ کڑوی کسیلی بناتی رہی۔

اس میں شبہ نہیں کہ آپ مستحق تھے آپ نے اپنی زندگی کا طویل زمانہ لکھنے پڑھنے میں گزارا تھا۔ نثر و نظم دونوں پر آپ کو پورا پورا قابو تھا۔ آپ ایسی باتیں لکھتے تھے جو دل میں کھب کر رہ جاتی تھیں۔ آپ کی نثری، اور شعری دونوں تخالیق میں بلا کی جان ہوتی تھی اور قاری کی نگاہیں ایک ایک لفظ پر ٹھہرتی ہوئی آگے بڑھتی تھیں اور آخر میں اسے مائل غور و فکر بھی کرتی تھیں۔ لیکن یہ ڈھیر سارے او صاف نکھری ستھری زندگی بنانے کے لئے کافی نہیں ہوتے۔ آپ ان پر تکیہ کئے ہوئے بیٹھے رہے۔ اور سدا کھانستے رہے۔ اور ہانپتے رہے۔ گستاخی معاف! آپ انٹی ڈوز لینے کے عادی بن گئے تھے۔ تندرست دتو انا کیسے ہوتے۔؟

پھر بھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ کو انعام سے نوازا نہیں گیا۔ ابھی حال میں اردو اکاڈمی سے آپ کو پندرہ سو روپے دینے کا اعلان کیا گیا تھا۔ یہ رقم آپ کے کچھ مسائل کو تو ضرور حل کر سکتی تھی۔ لیکن آپ نے اس رقم کو بھی کانٹا سمجھتے ہوئے ہاتھ نہیں لگانا چاہا اور دنیا سے منہ موڑ لیا۔

غرض کچھ بھی ہو، آپ کے اچانک مرجانے سے اردو دنیا میں صف ماتم بچھ گئی۔ ایڈیٹر کے دلوں کو دھکا لگا اور انھیں آپ کی یاد ہر ماہ ستائے گی اور جب کبھی خصوصی شمارے کو منظر عام پر لانے کی بات چلے گی تب خاص طور پر آپ کی کمی محسوس ہو گی۔ قارئین کی آنکھیں نم ہیں اور اب وہ آپ کی پرانی تحریروں کو آنکھوں سے لگائے بیٹھے ہیں۔ رسائل نوحہ کناں ہیں کہ اب ایسا تیز و طرار لکھنے والا کہاں میسر آئے گا۔؟

ٹھیک ہے کوئی جگہ خالی نہیں رہتی۔ ازل سے آنے جانے کا سلسلہ جاری ہے جب کوئی جگہ خالی ہوتی ہے تو کوئی دوسرا بڑھ کر اس جگہ کو گھیر لیتا ہے۔

پھر بھی فرقت بھائی! آپ رہ رہ کے یاد آئیں گے اور طنز میں ڈوبی ہوئی آپ کی منفرد آواز ہمارے اذہان میں برابر گونجتی رہے گی۔ ایسی خبر نگاہوں سے گذری ہے کہ کاکوری کلچرل سوسائٹی نے آپ کی شایان شان یادگار منانے کا عزم صمم کر لیا ہے۔ یہ یہ... تو آپ کی اس غلطی سے ہوئی کہ آپ کاکوروی لکھا کرتے تھے۔ حالانکہ آپ تو پوری اردو دنیا کے تھے۔ اردو آپ کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ اردو کاز کے لئے آپ آوازیں بلند کرتے تھے۔ اردو رسائل و جرائد کی تحفظ و بقا کے لئے ہمیشہ آپ بے چین رہتے تھے۔

لہٰذا اردو جہاں جہاں بولی، پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔ وہاں آپ کی یاد تازہ رہے گی۔

کون کہتا ہے آپ مر گئے، فرقت بھائی!
آپ کبھی نہیں مر سکتے۔

★★

حرمت الاکرام

داغِ دل جلائے چلو

ہوا ہے تیز، کوئی شمع جل نہیں پاتی
فسونِ تیرہ شبی اور ہو گیا گہرا
بھٹک رہی ہے فضاؤں کے پیچ و خم میں صبا
خلاؤں میں یہ ستاروں کے ٹمٹماتے ہوئے
دلوں میں اپنی تنک تابیوں کا زخم لئے
لرز رہے ہیں، یہ رات کتنی قاتل ہے!

سیاہیوں کی یہ زنجیر کیسے پگھلے گی؟
تجلیوں کی حرارت کہاں سے لائیں ہم؟
متاعِ اہلِ تمنّا ہے صرف دیدۂ نم؟
علاجِ تیرہ شبی آنسوؤں سے کیا ہوگا!
تمہیں بتاؤ کہ ان جگنوؤں سے کیا ہوگا!
سیاہیوں کی یہ زنجیر کیسے پگھلے گی؟

چمک کے ساتھ حرارت بھی چاہیئے ہم کو؟
یہ رات، اپنے لئے صرف ایک رات نہیں!
یہ رات: ایک زمانہ ہے ایک مدت ہے
یہ ایک وقفۂ غم، وقفۂ اذیت ہے؟
یہ کتنی صدیوں کا اک سلسلۂ تلخ و گراں
یہ صرف نور کی کرنوں سے ٹوٹنے کا کہاں!
سیاہیوں کی یہ زنجیر آگ چاہتی ہے
مگر یہ آگ، یہ شعلہ کہاں سے لائیں ہم
مسافرانِ وفا! داغِ دل کرو روشن
کہ داغِ دل میں تجلّی بھی ہے حرارت بھی
قدم بڑھائے چلو، داغِ دل جلائے چلو
ہوا کے شوخ تھپیڑوں کی چوٹ کھائے چلو

★★

فضا ابن فیضی

غزل

اسے ملا نہ کوئی زاویہ مفصل سا
مرے قلم کا ہے خاکہ تمام مجمل سا

ہزار طرزِ ادا ہے سجل سا کومل سا
ترے بغیر ہے ہر شعر نا مکمل سا

اسے سمیٹو تو شاید مجھے بھی پا جاؤ
مرے وجود پہ وہ چھا گیا ہے بادل سا

نہیں ہوں گرد کہ موجِ ہوا اڑا لے جائے
زمیں کے سینے سے لپٹا ہوا ہوں دلدل سا

جو ہم سفر تھے وہی ملے ساتھ چھوڑ گئے
اکیلا شہر میں پھرتا ہے وقت پاگل سا

وہ میرے پاس کوئی خواب لیکے کیوں آئے
خود اسکی آنکھوں میں ہیں جاگتا ہوں کاجل سا

خرابِ لذتِ کام و دہن نہیں ہم لوگ
چکھو تو ذائقہ آگہی ہے حنظل سا

سب اپنا اپنا جنازہ اٹھائے پھرتے ہیں
ہر آدمی ہے بجائے خود ایک مقتل سا

دروغِ مصلحت آمیز اختیار کرو
کہ آج ہے یہی اک قول، قولِ فیصل سا

ترے خیال کے پرتو سے میرے چہرے پر
لپک رہا ہے کوئی شعلہ، سرخ آنچل سا

ہمارے عہد میں کوئی بھی شب گزیدہ نہیں
ہر ایک شخص یہاں جل رہا ہے مشعل سا

بہت دنوں سے تھی سوکھی ہوئی یہ جوئے شعور
تم غزل سے ہر اک ذہن اب ہے جل تھل سا

فضاؔ کو جانو نہ بے برگ و بار تم اتنا
خود اپنی ذات میں پھیلا ہوا ہے جنگل سا

★★

روفق دکنی سیمابی

اپنے مرکز کی طرف...

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز ہے وقت
حسن کا ذکر ہی کیا، عشق بھی پر تولے ہے
شہد میں کاہش و ذرا ہے، کہ سم گھولے ہے
وقت دن رات میں ڈھلتا ہے گزرنے کیلئے
یہی فطرت کا بھی منشا ہے نہ ہو استحکام
زندگی کا رہے دو دن سے زیادہ نہ قیام
کوس رحلت کے لئے گوش بر آواز ہے وقت
وقت ساکت نہیں، پل بھر بھی نہیں جس کو قرار
دعوت درس عمل دے کے گذر جاتا ہے۔
سرنگوں جاتا ہے یہ سبز سپہر جاتا ہے۔
انگلیاں نبضِ زمانہ کے چلن پر جس کی
یہ گراں خوابیٔ عالم کو جگا دیتا ہے
ہست اور نیست کے پردے بھی اٹھا دیتا ہے
زیست کو مرگ سے تعبیر کرے ہے ہر بار
شامِ انجام نہ یہ صبح کا آغاز ہے وقت
اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز ہے وقت

★ ★

نازش پرتاپگڈھی

میں نے سمجھا۔

آتے جاتے ہوئے لمحات میں پائل باجے
آتی جاتی ہوئی ہر سانس میں گھنگرو چھنکے
بنتی مٹتی ہوئی تصویر خیالی۔ جیسے۔
کوئی سچ مچ ابھی زینت دہِ آغوش ہوا!

۔ وقت کو دردنے مٹھی میں پکڑنا چاہا!!
گیت بنتا ہوں مگر میرے لئے ساز کہاں
یہ تصوّر ہے، کوئی صاحب اعجاز کہاں
آتے جاتے ہوئے لمحات پہ قابو کس کا؟

★★

بمل کرشن اشکؔ

غزل

اجڑا دیار اور یہ بے کار کی تلاش
معیار کا جنوں کبھی معیار کی تلاش

گلیوں میں ہے رواج خرید و فروخت کا
مندر میں بیٹھ کر ہے پرستار کی تلاش

کرسی ملے گی، کرسی پہ رکھنے کو کچھ تو ہو
سر لے کے بیٹھ جائے گی دیوار کی تلاش

ہر شخص ہے بکاؤ تمہاری طرح یہاں
کس شہر میں کرو ہو خریدار کی تلاش

یوں سوچتا رہا تو کوئی نس ہی پھٹ نہ جائے
سر کے لئے کرو کسی دیوار کی تلاش

سائے کا قرب اور تعلق کی جستجو!!
آئینہ اور یار طرحدار کی تلاش!

خالی نہیں ہے دار کوئی شہر وقت میں
کرتے پھریں ہیں لمحے گنہگار کی تلاش

اے اشکؔ دونوں شغل فراغت کے شغل ہیں
ساغر کی جستجو ہو کہ رخسار کی تلاش!

**

مرتب:- کرامت علی کرامتؔ

امجد نجمیؔ کے خطوط

عبداللطیف عارفؔ کے نام

— ۱ —

۱۵ مارچ ۶۶ء

تو خود ان کو لکھ عریضہ نہ کر انتظار اکبرؔ
انھیں کیا غرض ہے ایسی کہ ترا مزاج پوچھیں

مولانا صاحب صباح الخیر!

زلفِ محبوب کا تصوّر اس کی تمام صفات و تشبیہات کے ساتھ ہمارے شعر و ادب میں ایک ایسا حسین و جمیل مرقع ہے کہ اس طرّۂ طرار کو خم در خم بھی کہا جا سکتا ہے اور بلاؤں کا عالم بھی۔ اس میں صبحِ عشرت بھی پنہاں ہے اور اس میں شامِ غم بھی، یہ کمند و زنجیر بھی ہے۔ یہ پیچیدہ و گرہگیر بھی۔ یہ طویل و دراز بھی ہے۔ اس میں حسن کا راز بھی ہے۔ یہ رسن و دام بھی ہے یہ میم اور لام بھی۔ یہ عقرب جرارہ بھی ہے، یہ عنبر سارا بھی، یہ دوتا بھی ہے۔ رسا بھی اور چلیپا بھی۔ یہ کافر ہندو بھی ہے یہ مشکبو بھی، یہ سنبل و ریحان بھی ہے۔ یہ رشتۂ جان بھی اور پریشان بھی،

غرض اس عنوانِ دلچسپ پر ہمارے شعرا نے وہ وہ معنی آفرینیاں کی ہیں کہ باید و شاید، فارسی شعرا کی چند کاوشیں ملاحظہ ہوں :-

؎ نہ زلف است اینکہ بر گردِ رخِ دلدار می گردد
سپہ مار است پنداری کہ در گلزار می گردد
(مراعات النظیر)

؎ زلفِ او را رشتۂ جاں گفتم و گشتم خجل!
زانکہ ایں معنی چو زلفش پیش پا افتادہ است
(تجاہلِ عارفانہ)

؎ زلف بر رخسار و کاکل در قفا افتادہ است
مرغِ دل را پیش و پس دام بلا افتادہ است
(حسنِ تعلیل)

؎ گفتم روم کہ چشمت مائل بخواب ناز است
بکشاد زلف و گفتا بنشیں کہ شب دراز است
(مشاکلہ یا مدلل)

؎ دلِ دیوانہ بہ زنجیر نمی آید باز
حلقۂ از خم آں طرّۂ طرّار بیار
(رعایت)

اب ذرا شعرائے اردو کی معنی آفرینیاں بھی دیکھئے۔ سہ

؎ پریشاں ہوں تو سنبل اور جو بل کھائیں تو کالے
تمھارے گیسوں کے ڈھنگ دنیا سے نرالے

؎ خیالِ زلف دوتا میں نصیرؔ پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر
(سہلِ ممتنع)

؎ خط بڑھا زلفیں بڑھیں کاکل بڑھے گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے
(سحرِ حلال)

سہ کس نے بھیگی ہوئی زلفوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کے آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی
(سحر ہلال)

یہ سب بھی لیکن مرزا غالب کے اس شعر کا جواب نہیں یہ سحر ہے اعجاز ہے جادو ہے۔ سہ

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں!

دیکھا آپ نے؟ نہ صنعت ہے نہ استعارہ نہ تشبیہ نہ کچھ نہ کچھ۔ لیکن پھر بھی حقیقت، جوش اور سادگی سے لبریز ہے یہ خیال۔ فارسی میں کوئی شعر اس قماش کا میری نظر سے نہیں گذرا۔ سہ

مومن نہ بود غالب و کافر نتواں گفت!

ہاں علامہ نیاز فتحپوری کا یہ شعر بھی خوب ہے۔ سہ

سہ اف رے وہ ہلکا سا اور ٹھنڈا اسائم جو بعد غسل
سوکھ جانے پر تیرے بالوں میں پایا جائے ہے

اب اسی موضوع پر فارسی اور اردو شاعروں کی ایک ایک برجستہ کلامی بھی سن لیجئے۔

فیضی اور عرفی ایک دن باغ میں ٹہل رہے تھے۔ موسم سہانا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ باغ میں کسی قدر فاصلے پر ایک حسین دوشیزہ پر اچانک ان دونوں کی نظر پڑی جس کی زلفیں ہوا سے ادھر ادھر بل کھا رہی تھیں۔ یہ دلکش سماں دیکھ کر فیضی نے برجستہ کہا۔ سہ

اے صبا آں زلف را بر چہرۂ زیبا مزن!

عرفی نے فوراً مصرعۂ ثانی لگایا۔ سہ

آنچہ بے رخصت نہ جا بر داشتی بر جاش نہ!

ذرا دیکھا صاحب۔ "بر جاش" کا ضمیر متصل کس بے ساختگی کے ساتھ بیٹھا ہے۔!

لاہور کے ہفتہ وار "انتخاب لاجواب" میں چالیس سال پیشتر یہ لطیفہ پڑھا تھا کہ ایک روز شام کے وقت آتش اور ناسخ سیر کو نکلے۔ شام اودھ مشہور ہی ہے۔ دیکھا کہ ایک جگہ طوائف کا ناچ ہو رہا ہے۔ طوائف بھی طویل القامت۔ دیکھتے ہی آتش نے مزاحاً کہا۔ سہ

طول شب فرقت سے بھی دو ہاتھ بڑی ہے

طوائف کے کانوں میں بھی اس کی بھنک پڑی اس نے پوچھا۔ کیا کہا؟ ناسخ نے فوراً مصرعۂ اولیٰ کو دہراتے ہوئے پورا شعر اس طرح ادا کر دیا۔ سہ

طول شب فرقت سے بھی دو ہاتھ بڑی ہے
وہ زلف مسلسل جو ترے رخ پہ پڑی ہے ۔ وہ زلف جو جھڑکے مزہ

دیکھا آپ نے ہجو کو کسی طرح مدح میں اور تقبیح کو کس طرح حسن میں بدل دیا گیا۔

اس پر خلیفہ ہارون الرشید کے درباری شاعر ابو نواس کا وہ شعر یاد آ جاتا ہے۔ جو اس نے خلیفہ کی لونڈی خالصہ کی ہجو میں کہا تھا۔ سہ

لقد ضاع شعری علی بابکم
کما ضاع عقد علی خالصہ
(ضاع (عَ))

نجمی۔

۲۷ مارچ ۱۹۶۶ء

اگر بخدمت آں یار من رسی اے باد
سلام من برسانی کہ من دعا گفتم

مولوی صاحب سلامت۔

مزاج اقدس؟ دنیا کی ہر زبان میں شعر گوئی کے دو طریقے رائج ہیں۔ ایک تو غور و خوض اور سوچ سمجھ کر شعر کہنا، دوسرا زیادہ سوچے بغیر فی الفور شعر کہنا۔ پہلے طریقے کو اصطلاح عروض میں رویّہ کہتے ہیں اور دوسرے کو بدیہہ۔ اور بدیہہ گوئی فی نفسہ ذرا مشکل چیز ہے۔ جب تک شاعر کو داخلی اور خارجی حالات، علم کائنات اور شعور زندگی پر اچھی طرح عبور حاصل نہ ہو اس کی بدیہہ گوئی کامیاب نہ ہو گی۔ شاعر کی نگا

جس قدر وسیع و رس ہوگی، اصول فن سے وہ جتنا واقف ہوگا اس کی برجستہ کلامی اسی قدر موزوں اور برمحل ہوگی۔ یہ بات اکثر کثرت مطالعہ، مشق و مہارت سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ اور سچ پوچھئے تو یہ بھی طبیعت کی ایک اپج اور قوت متخیلہ کا ایک کرشمہ ہوتا ہے بسا اوقات ایک عامی بھی ارتجالاً کچھ کہہ لیتا ہے۔ فارسی سے قطع نظر ہمارے اردو ادب میں بھی اس کی کسی طرح کمی نہیں ہے۔

ذیل میں دو چار مثالیں درج ہیں۔ پڑھئے اور لطف اٹھائیے اور دعائے خیر سے بندے کو یاد فرمائیے۔

(۱) لکھنؤ کے بعض امراء نے ایک دفعہ مرزا رفیع السودا سے امتحاناً اس مصرعہ پر مصرعہ لگانے کی فرمائش کی۔ مصرع

اے سنگ نازکی میں تو کامل نہ ہو سکا

سودا نے فوراً مصرعہ لگایا۔ مصرع

شیشہ گداز ہو کے بنا دل نہ ہو سکا

پتھر گداز ہوا تو زیادہ سے زیادہ شیشہ ہی بنے گا جو البتہ نازک تو ہے مگر دل کی نزاکت اس میں کہاں سے آئے گی؟ شاعر کی یہ تیز رس نگاہ قابل داد ہے۔

(۲) ایک دفعہ نواب آصف الدولہ بہادر والئ اودھ نے یہ مصرعہ کہا۔ مصرع

وہ کون ہے جو یار کی لادے خبر مجھے؟

اور اعلان کیا کہ جو اس مصرعہ پر مصرعہ لگائے گا اسکو ایک ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔ چنانچہ ایک شہدے نے فی البدیہہ مصرعہ ذیل لگا کر ایک ہزار روپیہ جیب میں ڈالتا ہوا چلتا بنا۔ مصرع

اے سیل اشک تو ہی بہادے اُدھر مجھے!

(۳) ایک مرتبہ ایک صاحب نے داغ کے سامنے ایک تصویر پیش کی جس میں ایک نازنین جانے کا قصد کر رہی ہے۔ اس کا عاشق ایک ہاتھ سے اس کا دامن پکڑے ہوئے ہے اور ایک ہاتھ سے اپنے دل کو سنبھال رہا ہے اور کہا کہ اس کیفیت کو آپ اپنے کسی شعر میں ظاہر فرمائیے۔ داغ نے کسی قدر تامل کے بعد کہا۔ سہ

ہاتھ نکلے دونوں اپنے کام کے
دل کو تھاما ان کا دامن تھام کے

(۴) ایک دفعہ کا ذکر مغرب زدہ جنٹل مین اکبر الٰہ آبادی کے پاس پہنچے اور کہنے لگے کہ حضرت آپ کے کلام کا کافی غور سے میں نے مطالعہ کیا ہے۔ آپ نے نئی روشنی اور موجودہ تہذیب کی ہر چیز پر کچھ نہ کچھ کہا ہے لیکن پاؤ روٹی پر آپ کا کوئی شعر میری نظر سے نہیں گزرا اکبر نے فی الفور کہا۔ سہ

مسیح چرخ چہارم پہ اپنی امت سے
ہیں پاؤ روٹی کی مانند منہ چھپائے ہوئے

دیکھا آپ نے کتنی چبھتی ہوئی پھبتی ہے۔

(۵) ۱۹۲۴ء کا واقعہ ہے کہ انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کا سالانہ جلسہ تھا۔ علامہ اقبال جلسے کے صدر تھے۔۔۔ ۔۔۔ جلسہ میں کسی خوش الحان نعت خوان نے رضا صاحب کی ایک نظم شروع کی جس کا مطلع تھا۔ مصرع

رضائے خدا ہے رضائے محمدؐ

نظم کے اختتام پر علامہ مرحوم اپنی صدارتی تقریر کے لئے اٹھے اور ارتجالاً یہ دو شعر ارشاد فرمائے۔ سہ

تماشا تو دیکھو کہ دوزخ کی آتش
لگائے خدا اور بجھائے محمدؐ!
تعجب تو یہ ہے کہ فردوس اعلیٰ
بنائے خدا اور بسائے محمدؐ!

زیادہ کیا عرض کیا جائے۔ مصرع

من و دامن پاک آل رسولؐ!

مجنی

مارہرہ [illegible]!

زمانے بحث و علم و درس تدریس
کہ باشد نقش انسان را کمائے
زمانے شعر و شطرنج و حکایت
کہ گردد رنج خاطر را ملائے

محب دلی۔

السلام علیکم۔ مزاجِ مبارک!!

علم محاضرات یعنی حاضر جوابی اور لطیفہ گوئی ہماری معاشری اور ادبی زندگی کا ایک حسنِ لازوال ہے۔ جس طرح اچھا شعر ہمارے دل و دماغ کو متاثر کرکے ہمیں لطف اندوز ہونے کا موقع عطا کرتا ہے۔ اسی طرح بات چیت یا بحث و مباحثہ کے وقت کوئی چست جملہ یا پرلطف فقرہ بڑا مزہ دے جاتا ہے۔ حاضر جوابی مجلس احباب میں گرما گرمی پیدا کرتی ہے اس سے متکلم کی شوخیٔ طبع اور زندہ دلی کا ثبوت ملتا ہے۔ البتہ ہنسی مذاق یا پھبتی یا طنز و ظرافت از قسم سوقیانہ نہ ہو۔ بلکہ سنجیدہ متین اور ٹھوس ہو یہ چیز ایک شاعر، ادیب، مقرر اور عالم کے لئے بہت ضروری ہے۔ یہ سامعین پر ایک انبساطی کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ ہمارا اردو ادب ایسے لطائف و ظرافت سے بھرا پڑا ہے۔ ذیل میں دو چار مثالیں دیتا ہوں۔ پڑھئے اور لطف اٹھائیے۔

(۱) ایک روز مرزا غالب کے تلمیذ رشید میر مہدی مجروح، ان کے پاس بیٹھے تھے اور مرزا پلنگ پر پڑے ہوئے کراہ رہے تھے۔ میر مہدی پاؤں دابنے لگے۔ مرزا نے کہا بھئی تو سید زادہ ہے، مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے؟۔ انھوں نے نہ مانا اور کہا اگر آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اجرت دیدیجئے گا۔ مرزا نے کہا ہاں اس کا مضائقہ نہیں۔ جب وہ پیر داب چکے انھوں نے اجرت طلب کی۔ مرزا نے کہا۔ بھیا اجرت کیسی؟ تم نے ہمارے پاؤں دابے، میں نے تمہارے پیسے دابے۔ حساب برابر ہوگیا۔

(۲) میر انیس کو ایک امیر نے مدعو کیا۔ کھانے کے بعد آم آئے احباب جمع تھے۔ ان میں ایک حکیم صاحب بھی تھے۔ ایک صاحب نے پوچھا۔ کیوں جناب حکیم صاحب آم کھانا کیسا ہے؟ حکیم صاحب نے جواب دیا کہ آم کا مزاج حار ہے اور آجکل فصل بھی گرم ہے۔ پانی کھل کر نہیں برسا۔ اس لئے احتیاط مناسب ہے۔ لیکن حکیم صاحب نے جب دیکھا کہ اچھے اچھے آم صرفِ کلام ہوئے جاتے ہیں تو چند آم چن چن کر ایک قاب میں علاحدہ رکھ لئے تاکہ پوری دلجمعی سے سیر ہو کر کھائیں۔ ان صاحب نے کہا کہ حکیم صاحب ہمیں تو آپ منع کر رہے ہیں اور اپنے لئے یہ سامان!

حکیم صاحب بولنے نہ پائے تھے کہ میر انیس نے فوراً کہا "فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمت"۔

(حکیم کا کام حکمت سے خالی نہیں۔ ضرب المثل)

(۳) علامہ شبلی نعمانی کے لائق جانشین مولانا سید سلیمان ندوی کو جب کسی مسئلے کے اختلاف پر چند کٹھ ملاؤں نے کفر کا فتویٰ دیا تو سید سلیمان ندوی نے اس آیت کو دہرایا۔

(وما کفر سلیمان ولٰکن الشیاطین کفروا)

(سلیمان نے نہیں بلکہ شیاطین نے کفر کیا۔)

(۴) مرزا آتش ایک دفعہ مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے کہ ان کے ایک شاگرد مستجاب خاں خلق ان سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ ان کو نماز پڑھتے دیکھ کر واپس چلے گئے۔ آتش نے سلام پھیرنے کے بعد انہیں بلوا بھیجا۔ وہ آئے تو کہنے لگے۔ واپس جانے کی کیا ضرورت تھی؟ انھوں نے کہا آپ نماز پڑھ رہے تھے۔

آتش نے جواب دیا میں نماز ہی تو پڑھ رہا تھا لاحول تو نہیں پڑھ رہا تھا کہ آپ بھاگے۔ دیکھا آپ نے کیسا چست فقرہ تھا!"

(۵) اقبال کی عمر گیارہ بارہ سال کی تھی۔ اسکول میں تعلیم پاتے تھے۔ ایک روز اسکول پہنچنے میں ان کو دیر ہو گئی۔ کلاس ٹیچر نے دیر کا سبب دریافت کیا تو اقبال نے بے ساختہ جواب دیا: "اقبال دیر میں آتا ہے۔"
اسی کو کہتے ہیں ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ بارہ سال کی عمر اور یہ جواب!"

(۶) مرزا داغ کے جانشین حضرت مولانا احسن مارہروی مرحوم کا بھی ایک لطیفہ سن لیجئے۔ مارہرے میں ایک خاندان ہے جس کے افراد کے نام لفظ الٰہی پر ختم ہوتے ہیں مثلاً واد الٰہی، نور الٰہی، رفعت الٰہی وغیرہ وغیرہ۔ اسی خاندان کے ایک شخص مولانا سے بہت عقیدت رکھتے تھے اور جب کبھی ان کے لڑکا ہوتا تو مولانا مرحوم سے نام رکھواتے۔ اس طرح سات آٹھ لڑکے ہوئے اور سب کے نام مولانا مرحوم ہی نے رکھے۔ اتفاق سے ایک دفعہ مولانا کسی فکر میں بیٹھے تھے۔ وہ حضرت آئے بولے کہ کل شب کو میرے ہاں لڑکا ہوا ہے اسکا نام رکھ دیجئے۔ مولانا نے فرمایا کہ میں اس وقت دوسرے خیال میں ہوں۔ اطمینان سے سوچ کر نام رکھ دوں گا۔ مگر وہ حضرت مولانا کے سر ہو گئے کہ نہیں اسی وقت نام رکھ دیجئے۔ بہت ٹالا جب وہ نہ ٹلے تو مولانا نے کہا کہ یار تمھارے روز بچے ہوتے ہیں میں کہاں تک الٰہی کے قافیہ پر نام رکھوں۔ اچھا جاؤ اس بچے کا نام رکھ لو "بس الٰہی"۔
دیکھا آپ نے متانت اور سنجیدگی میں بھی کتنی شوخی اور زندہ دلی ہے!"

زندگی زندہ دلی کا نام ہے!
مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

(۷) یادش بخیر۔ اردو کا جواں مرگ شاعر اسرار الحق مجاز بھی بڑا حاضر جواب اور شوخ طبع تھا۔ اس کے بہت سے چٹکلے ہمارے اردو ادب میں مشہور ہیں۔
ایک دفعہ فراق گورکھپوری مجاز سے اپنی نواسی کا تعارف کراتے ہوئے بولے "یار یہ لڑکی بڑی شریر ہے مجھے حرامزادہ کہتی ہے۔" مجاز نے برجستہ جواب دیا:
"مردم شناس معلوم ہوتی ہے۔"

نجمی

۲۲ اپریل ۱۹۶۶ء۔

داستانِ عہدِ گل را بشنو از مرغ چمن
زانکہ آشفتہ تر گفتہ این افسانہ را

جناب من۔

سلام مسنون۔ دیارِ مغرب کے رہنے والے دیارِ مشرق کے رہنے والوں کو کسی نہ کسی طرح برابر متہم اور بدنام کرتے آئے ہیں۔ اور اب بھی کر رہے ہیں۔ خصوصاً اس آل ڈاروِن نے اسلامی سلطنت اور مسلمان حکمرانوں کو عیش پرست، غفلت شعار، متعصب، ریاکار ناانصاف اور ظالم کہہ کر من گھڑت واقعات اور جھوٹے قصوں سے جس طرح تاریخ کے صفحات کو سیاہ کیا ہے، وہ باخبر اصحاب سے پوشیدہ نہیں۔"

جہانگیر بادہ خوار تھا۔ یہ کسے نہیں معلوم! اس نے اپنی خود نوشت سوانح حیات "تزک جہانگیری" میں اس کا کھلم کھلا اعتراف کیا ہے۔ لیکن اس کی مے نوشی اور عیش کوشی کبھی بھی کاروبارِ سلطنت میں حارج یا مخل نہیں ہوئی۔ وہ حکومت کی کلیات و جزئیات سے اسی طرح واقف تھا جس طرح ایک باخبر بادشاہ کو ہونا چاہئے۔ اس ضمن میں تاریخ ہند کا ایک واقعہ سنئے جو دلچسپی سے خالی نہیں۔
اس کے (جہانگیر کے) دشمنوں نے شاہ ایران کو خفیہ طور پر لکھ بھیجا کہ جہانگیر دائم الخمر ہے۔ اور سلطنت کے کاروبار سے بالکل بے خبر ہے۔ اسی وقت اگر آپ ہندوستان پر فوج کشی کر دیں تو یہاں کا تخت و تاج بے جدال و قتال آسانی کے ساتھ آپ کے ہاتھ آجائے گا۔ یہ دعوت نامہ پاکر شاہ ایران نے اپنے سفیر کو حالات

کی تفتیش و تحقیق کے لئے یہاں بھیجا۔ جہانگیر نے دربار میں خندہ پیشانی کے ساتھ سفیر کا خیر مقدم کیا اور حکم دیا کہ دو فربہ بکرے ذبح کئے جائیں اور عجائب خانے سے دو شیر لائیں جائیں۔ فوراً حکم کی تعمیل ہوئی۔ گوشت کے الگ الگ دو ڈھیر لگا دئیے گئے اور شیروں کو پنجرے سے کھول دیا گیا وہ غراتے ہوئے گوشت کی طرف لپکے۔ ان میں سے جو شیر زیادہ بھوکا تھا وہ اپنا حصہ جلدی جلدی ختم کر کے دوسرے شیر کی خوراک کی طرف بڑھا۔ یہ دیکھ کر جہانگیر آگ بگولا ہو گیا۔ اور اپنی مسند سے اٹھ کر اس شیر کی طرف بڑھا۔ اس کے کان اینٹھ کر ایسا ایک طمانچہ رسید کیا کہ یہ ”جنگل کا بادشاہ“) ہندوستان کے بادشاہ کے ہاتھ کا تھپڑ کھا کر تیور گیا اور سہم کر اپنی جگہ پر واپس چلا گیا۔ جہانگیر بھی اپنی مسند جا براجا۔ جب دوسرا شیر اپنی خوراک ختم کر چکا تو بادشاہ نے دونوں کو چمکارا۔ شیر دوڑ کر فرطِ محبت سے بادشاہ کے قدموں پر پالتو کتوں کی طرح لوٹنے لگے۔ جہانگیر نے دونوں کی پیٹھ تھپکی اور پنجرے کی طرف اشارہ کیا۔ اس (RING MASTER) بادشاہ کا اشارہ پا کر شیر پنجرے میں جا گھسے۔ پنجرے ہٹا لئے گئے۔ جہانگیر نے سفیر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”جاؤ تم اپنے بادشاہ کو ہماری غفلت کی حکومت کا حال لکھ بھیجو“۔ سفیر محترم کا زہرہ آب تھا۔ تسلیم و کورنش ادا کر کے وہ بھی دربار سے باہر آیا۔ اور شاہِ ایران کو اس واقعہ کا پورا حال لکھ بھیجا۔ جس کے آخری دو جملے یہ تھے۔

”خبردار بھولے سے بھی اس طرف کا رخ نہ کرنا۔ جہانگیر حکومت نہیں خدائی کر رہا ہے۔“

اللہ اکبر۔ دیکھا آپ نے؟!

حقیقت یہ ہے کہ ان خرافات نشینانِ پاک طینت میں کوئی بات ضرور ایسی تھی کہ جس کے چلتے بخت، وقت اور اقبال سایے کی طرح ان کے ساتھ ساتھ تھے۔

علامہ شبلی کا مقطع کیا خوب ہے۔ ؎

شبلی خراب کردۂ چشم خراب اوست
تو در گماں کہ مستی او از شراب بود!

منجی

★ ★

سید علی رضا حسینی

غزل

"میں کون ہوں اے ہم نفساں، سوختہ جاں ہوں" (میرؔ)

ذات پر اپنی عجب طرح کا پردا ہوں میں
ہے جو مصلوب سرِ دار وہ عیسیٰ ہوں میں

میری لیلیٰ طلبی لذتِ غم جاں سے ہے
مائلِ سنگ جو سر ہو وہی سودا ہوں میں

ہاتھ میں میرے کلیمی کا ہنر تھا لیکن
کشتۂ وقت ہوں، فرعون کا مارا ہوں میں

ہجر اور وصل ہے کیا؟ لذتِ غم، ذوقِ نظر
ہجر اور وصل سے ہر روز گذرتا ہوں میں

تشنگی اب بھی وہی، کرب و بلا اب بھی وہی
شمر کا ظرف سلامت، ابھی پیاسا ہوں میں

یاد آتا ہے کہ تھی ذات مری رونقِ بزم
اب تو افسردگیٔ زیست کا شکوا ہوں میں

رند مشرب ہوں مرا ظرف وسیع النظری
ساحلِ نیل و فرات و لبِ گنگا ہوں میں

وسعتِ قلب و نظر تھی کہ سمندر بکنار
اب تو سمٹا ہوا، سہما ہوا قطرہ ہوں میں

مختصر قصۂ غم، عمرِ گزشتہ کی قسم
خار بن کر دلِ صیاد میں کھٹکا ہوں میں

میرے اشعار میں خوں گشتہ امیدوں کا لہو
دل کی بس ایک کہانی ہے سناتا ہوں میں

یارو تکلیف کرو، ایک ذرا پوچھ تو جاؤ
یعنی کس حال میں ہوں کب سے بلبلا ہوں میں

آبلہ سا ہوں، ذرا ٹھیس لگی پھوٹ بہا
درد و غم، رنج و الم کیا ہیں؟ سراپا ہوں میں

میرے نغمات میں آباد ہے دل کی دنیا
نوحۂ دوش کبھی، نغمۂ فردا ہوں میں

اب بھی ہنستا ہوں کہ احباب کا دل ٹوٹ نہ جائے
خود فریبی کی قسم آج بھی سچا ہوں میں

میرؔ کا شیوۂ گفتار بھلا کس کی مجال
میرؔ کی طرح سے اکثر چمن آرا ہوں میں

یاسیت خوب نہیں اتنی حسینی صاحب
خلوتِ غم میں کہیں آپ کہ تنہا ہوں میں

★★

عثمان عارفؔ نقشبندی۔ ایم.پی

غزل

دل ہے خوددار بہت اتنا ستاتا ہے مجھے
تیرا احساس بھی کیوں ہاتھ لگاتا ہے مجھے

سرخرو، ایک ہی دم، ایک ہی دن میں ہو جائے
روز وہ جذبہ جو سولی پہ چڑھاتا ہے مجھے

روشنی میں بھی نظر کچھ نہیں آتا اکثر
یا اندھیرا بھی نئی راہ دکھاتا ہے مجھے

بھیڑ میں ایک زمانہ کی گھرا ہوں لیکن
اپنی تنہائی کا احساس ستاتا ہے مجھے

میری ہستی میں ہیں گم ہستیاں کتنی آخر
وقت ہر روز نیا چہرہ دکھاتا ہے مجھے

زندہ لاشوں کے گلے پھولوں سے بھر جوائے
گل کی توہین کا احساس رلاتا ہے مجھے

آہ! اک جوتشی کہتا تھا کہ وہ شوخ تو اب
اپنی قسمت کیلئے ہاتھ دکھاتا ہے مجھے

کتنی صدیوں میں خدا جانے وہ اچھا ہوگا
بھوک کا روگ جو صدیوں سے ستاتا ہے مجھے

آہ! وہ عہدِ گذشتہ کا سنہرا موقع
غم کی دنیا میں بھی آواز لگاتا ہے مجھے

کیا توقع ہو مجھے پیاس بجھے گی عارفؔ
جب سمندر یہاں پیاسا نظر آتا ہے مجھے

★ ★

ڈاکٹر حسینی شمشاد

مخدوم کی ترقی پسندانہ انفرادیت

ادب و فن میں اجتماعی تاریخیت اور انفرادی عصریت کا مظاہرہ ہونا ناگزیر ہے۔ تاریخ ادبیات کے مطالعہ سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ ادب و فن میں فنکار کے انفرادی شعور احساس و جذبہ، تجربہ و مشاہدہ اور تخیلی وجدان کی عکاسی ہوتی رہی ہے۔ چونکہ فرد کی شعوری سطح سے ذہنی اور نسلی تجربات کے نقوش مفقود نہیں ہو سکتے اس لئے فطری طور پر جیسے جیسے معاشرہ تغیرات سے گذرتا ہے اور جوں جوں تبدیلیوں کے امکانات پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں ادب و فن میں لمحہ بہ لمحہ منزل بہ منزل انکی جلوہ گری ہوتی رہتی ہے۔ یہ ایک مفروضہ نہیں کلیہ ہے کہ انسان اور اس کا معاشرہ ہر لمحہ نئی صورت حال کا مقابلہ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرہ کی بہت سی قدریں مسترد اور مردہ ہو جاتی ہیں۔ اور ان کی جگہ پر نئی قدریں نمودار ہو جاتی ہیں۔ البتہ کچھ ایسی قدریں بھی ہیں جو دائمیت سے آشنا ہیں اور جن کے اندر ایک تحریکی تصورات اور فکری تحریک موجزن ہوتی ہے۔ ادب و فن انھیں غیر فانی قدروں سے وابستہ ہے اور اس کے ذریعہ نئی حیاتی قدریں منظر عام پر آتی ہیں۔

بیسویں صدی کے کم و بیش اوائل میں ہندوستان میں ترقی پسندانہ تحریک منظر عام پر آئی۔ غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ترقی پسندی وقت کے اہم ایک مطالبہ کی حیثیت رکھتی تھی اور پوری روائتی سماج کی خامیوں اور لعنتوں کے رد عمل میں اس نے اپنے مزاج کی تشکیل اس نہج پر کی تھی کہ برسوں سے قائم جمود و تعطل اور استحصالی رویہ کی توڑ کی جا سکے۔ چنانچہ شروع میں ترقی پسندی کے نیم رومانی باغیانہ میلان نے لوگوں کو بے ساختہ اپنی طرف متوجہ کیا اور آپ ہی آپ اسکا ایک حلقہ بننے لگا۔ اس کی غالباً ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی عوام دوستی اور جمہوریت پسندی ادب و فن کے لئے نسبتاً نئی چیز تھی۔ ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں نے اپنے زور قلم کے جوہر کو دکھلانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ ادب کی مقصدیت اور شاعروں کی افادیت کی اعلانیہ تبلیغ کی گئی۔ اور فنکاروں نے منصوبہ بند طریقے پر اپنی تخلیقات پیش کی۔ ترقی پسند تحریک کے ہنگامے و حشر کے دنوں میں چند ہی فنکار ایسے تھے۔ جنہوں نے اپنے دامن فن کو سطحیت، رسمیت، کھوکھلی نعرہ بازی اور ہنگامہ پسندی سے بچائے رکھا۔ آج جب ہم ادب میں ترقی پسند تحریک کے کارناموں کا جائزہ لیتے ہیں تو شدت سے اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ اس تحریک نے اپنی انقلاب پسندی کے نتیجے میں اپنی اہمیت اور وقار کو مجروح کر دیا۔ شعر و شاعری میں فیض، سردار، جوش، مجاز، ساحر، نیاز حیدر وغیرہ کے نام اکثر و بیشتر لئے جاتے ہیں۔ لیکن فیض ہی ایک مستثنیٰ ہیں جنہوں نے فن شاعری کو غلط مقصدیت کی نذر نہیں ہونے دیا۔

فیض کے مزاج میں کلاسیکی قدروں اور ترقی پسندانہ مطالبوں کا جو خوبصورت امتزاج اور ہم آہنگ رچاؤ ملتا ہے

• دوسروں کو نصیب نہیں۔ فیض کی اسی خصوصیت کی وجہ سے ان کی شاعرانہ شخصیت روشن ہوتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی ان کی شاعری عنفوان شباب اور طوفان شباب کی شاعری نہیں۔ اس کے اندر سنجیدگی، متانت، لبھر پا اور فکری عناصر بھی موجود ہیں۔ فیض ہی کے انداز سخن کے پیش نظر مخدوم محی الدین نے اپنی راہ سخن نکالی۔ فیض اور مخدوم میں شخصیت کے اعتبار سے، اور عملی طور پر بھی بہت سی مشترک خوبیاں نظر آتی ہیں۔ فیض ترقی پسند تحریک کے پرجوش ہمنوا تھے اور مخدوم بھی فیض ہی کی طرح مخدوم نے بھی جیل کی سزا کاٹی۔ مخدوم، فیض ہی روش پر گامزن رہے۔ اور کبھی انھوں نے شاعری کو وسیلہ تبلیغ بنانے کی قصداً تگ و تاز نہیں کی۔

یوں تو ترقی پسند تحریک میں جو لوگ بھی شامل تھے وہ کسی نہ کسی اعتبار سے اس تحریک کے سرگرم کارکنوں میں تھے۔ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ واضح طور پہ یہاں دو گروپ تھا۔ ایک تو وہ جو نوخیز عمر تھا اور عنفوان شباب کی نفسیات کا شکار۔ اس گروپ سے وابستہ لوگ ترقی پسند تحریک کی اوپری سطح پر تا عمر ہاتھ پیر مارتے رہے۔ دوسرا طبقہ ان لوگوں کا تھا جنہوں نے اس تحریک کے فلسفہ کو قبول کیا تھا۔ اور معاشرتی نظام میں ترقی پسندی کو لانا چاہتے تھے اور اسی طرح طبقاتی کشمکش کے دوران جو تعمیری شورشیں برپا ہوئیں ان سے براہ راست وابستہ ہوتے ہوئے بھی انھوں نے کبھی اس کی حمایت تبلیغی انداز میں نہیں کی۔ مخدوم کا تعلق اسی گروپ سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مخدوم کی شاعری میں نقطۂ نظر کی گہرائی ملتی ہے۔ ان کے یہاں فکری عناصر بھی ہیں اور فلسفیانہ تہ داری ہے۔ ایک مخلص ترقی پسند کی حیثیت سے وہ معاشرتی نظام حیات میں انقلاب کے خواہاں تو ہیں لیکن وہ اس حقیقت کا ادراک بھی کر چکے ہیں کہ باغیانہ اور طفلانہ حرکتوں یا سرگرمیوں سے یہ انقلاب رونما نہیں ہو سکتا۔ پرانے نظام کی ساخت میں تبدیلی لانی ہے اور یہ کام اتنا اہم ہے کہ اس کے لئے پوری سنجیدگی اور ضبط کے ساتھ سرگرم عمل ہونا پڑے گا۔

یہ بات دلچسپ ہے کہ مخدوم نے بھی اپنی شاعری کی ابتدا رومانیت ہی سے کی تھی۔ کچھ ہی دنوں بعد سیاسی مسائل کے شعور معاشرتی بدنظمی، طبقہ وارانہ انتشار اور اقتصادی نابرابری سے پیدا ہونے والے حالات نے انھیں متاثر کیا اور بتدریج اردو شاعری اپنی راہ بدل کر اپنے مزاج کی تشکیل کرے گی وہ کچھ اور شاعروں کی طرح نہ راتوں رات ترقی پسند شاعر ہو گئے اور نہ پیدائشی طور پر ترقی پسند شاعر چونکہ وہ خود ایک اوسط گھرانے سے وابستہ تھے اور زندگی کی دشوار گزار راہوں اور آزمائشوں سے ان کا تعلق تھا اس لئے اپنے فطری مطالبہ کے تحت انھوں نے ترقی پسندیت اختیار کی اور پھر اس طرح عملاً اس میں شریک ہوئے کہ آج تلنگانہ تحریک کا تذکرہ ہو اور ان کا نام نہ آئے۔ حیرت کی بات یہ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء تک وہ پوری سرگرمی اور خلوص کے ساتھ مستعد عمل رہے۔ ان کا نصب العین مصالحت پسند نہیں تھا ایک واضح نقطۂ نظر رکھنے کی وجہ ان کی شاعری افادی اہمیت اظہر من الشمس کے مصداق ہے۔ "جہان نو" دو بندوں کی ایک مختصر سی نظم ہے جس میں ان کے نقطۂ نظر کی بھرپور عکاسی ہوئی ہے۔ نظم کا پہلا بند جذبۂ دعوت انقلاب سے معمور ہے۔ شاعر کہتا ہے۔ ؎

نغمے شرر فشاں ہوں، اٹھا آتشیں رباب
مضراب بے خودی سے بجا ساز انقلاب
معمار عہد نو ہو ترا دست پر شباب
باطل کی گردنوں پہ چمک ذوالفقار بن

تبدیلی کی یہ خواہش انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ باطل کی طاقتیں پوشیدہ نہیں لیکن ان طاقتوں سے برسر پیکار ہونے کے لئے قوت اعتماد کا ہونا ضروری ہے۔ نظم کا دوسرا بند جہان نو کے خواب کا تعبیری نقش تیار کرتا ہے۔ ؎

ایسا جہاں جس کا اچھوتا نظام ہو
ایسا جہاں جس کا اخوت پیام ہو
ایسا جہاں جس کی نئی صبح و شام ہو
ایسا جہاں تو کا تو پروردگار بن

یعنی یہ نیا معاشرہ ایسا ہو کہ جس میں انصاف، رواداری، اور مساوات کا دار و دورہ ہو۔ شاعر اس جہاں کے نئے نظام کو اچھوتا کہنے پر مجبور اس لیے ہے کہ یہ اوصاف موجودہ معاشرہ میں موجود نہیں۔ اس کی خواہش یہ ہے کہ انسان کو معاشرتی مصائب و آلام سے نجات ہو اور مجموعی طور پر اس کی زندگی سکون سے بھرپور اور استحصال سے محفوظ ہو، "مشرق" میں شاعر نے معاشرتی مصائب و آلام کا نقشہ وضاحت سے پیش کیا ہے۔ یہ معاشرہ وہ ہے جس میں جہالت، فاقہ کشی، دریوزہ گری اور طرح طرح کے امراض موجود ہیں۔ روایت کی غلامی نے جس کے دست و بازو کو شل کر دیا ہے۔ یہ معاشرہ وہ ہے جس میں انسانیت کی بے گور و کفن لاش خون میں لتھڑی ہوئی پڑی ہے مگر شاعر اس مرگ بے قیامت کے باوجود حالات سے مایوس نہیں ہے۔ وہ جذباتی انداز میں سرخ سویرے کا تبلیغی نعرہ نہیں لگاتا بلکہ اس کی پرامید نگاہیں انسان کے اپنے کردار کا جائزہ لیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جس کی کوششوں سے ایک نئی دنیا بنے گی اور جن میں ایک صاحب کردار آدم انگڑائیاں لیتا نظر آئے گا۔ جس کی شخصیت میں دل آویز خطوط اور دل ربا اوصاف ہوں گے۔ شاعر کی یہ امید اس کی ایک دوسری نظم "دھواں" میں اور کھل کر سامنے آتی ہے۔ ؎

جنتیں خاک پہ جس رات اتر آئی تھیں۔
بدلیاں رحمت یزداں کی جہاں چھائی تھیں
عشرت و عیش کی جس جا کہ فراوانی تھی
جس جگہ جلوہ فگن روح جہاں بانی تھی
ہاں وہیں میرے دل زار نے یہ بھی دیکھا
ہاں مری چشم گنہ گار نے یہ بھی دیکھا

خون دہقان میں امارت کے سفینے تھے رواں
ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دھواں

بظاہر امارت و ثروت کے سفینے محنت کشوں کے خون میں رواں دکھلائی دیتے ہیں۔ اور عدل کی میت کا دھواں اٹھتا نظر آتا ہے لیکن یہاں نفی میں اثبات کا پہلو حاوی ہے۔ اعتماد اور ایقان کا یہ مرحلہ وہ ہے جس کی بھرپور وضاحت نظم "حویلی" میں ملتی ہے۔ یہ حویلی جو ایک فرسودہ سماج ہے۔ سماج کی اس بوسیدہ حویلی کی دیواریں متزلزل ہو چکی ہیں۔ اس کے تاریک تنگ کونوں میں استحصال پسند عناصر پناہ گزیں ہیں۔ اس کی ایک ایک اینٹ اس کی فرسودگی، بوسیدگی، اور کہنگی کی گواہی دے رہی ہے۔ وہ وقت آ گیا ہے کہ اس کے در و دیوار منہدم ہوں گی۔ اور اس کے ملبے سے ایک نیا خوبصورت اور آرام دہ قصر عوام بر آمد ہوگا۔ شاعر کی یہ بشارت اسی کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے۔ ؎

اے جواں سال جہاں، جان جہان زندگی۔
ساربان زندگی، روح روان زندگی
جس کے خون گرم سے بزم چراغاں زندگی
جس کے فردوسی تنفس سے گلستان زندگی
بجلیاں جس کی کنیزیں، زلزلے جس کے سفیر
جس کا دل خیبر شکن، جس کی نظر ارجن کا تیر
آ ان ہی کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں
آ، ان ہی کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں

لیکن عوامی آزادی کا یہ پرچم اسی وقت لہرائے گا جب بچوں کی بے قراری اور تمنا کی اپنے اثرات کا حلقہ وسیع تر کر۔ جب تک حیات بخش ترانے اسیر طلسم رہیں گے۔ جب تک اپنی غفلتوں میں پڑے ہوں گے اور جب تک انسان روایتی توہمات کے غلام بنے ہوں گے یہ تبدیلی عملی جامہ نہ پہن سکے۔ "مستقبل" میں شاعر نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ تعمیر کے خوشگوار خواب کو پیش کیا ہے۔ اس نے مستقبل کی تعمیر

جدوجہد شروع ہو چکی ہے۔ اندھیرے چھٹنے لگے ہیں اور ذہن و دل سے کائیاں مٹنے لگی ہیں۔ یہ مستقبل وہ ہے جس میں مساوات کا سفینہ سرگرم خرام ہے اور جس کے لئے نوجوانوں نے بہت سی قربانیاں دی ہیں۔ مستقبل کی یہ آہٹ آپ بھی سنیئے۔ ؎

اڑاتا ہوا پرچم زندگانی
سناتا ہوا عہد نو کی کہانی
جلو میں ظفر مندیاں شادمانی

چلا آرہا ہے، چلا آرہا ہے
چلا آرہا ہے، چلا آرہا ہے

سفینہ مساوات کا کھے رہا ہے
جوانوں سے قربانیاں لے رہا ہے
غلاموں کو آزادیاں دے رہا ہے

چلا آرہا ہے، چلا آرہا ہے
چلا آرہا ہے، چلا آرہا ہے

مخدوم کی نظمیں "قید" اور "چارہ گر" کا میں خصوصیت سے ذکر کرنا چاہوں گا۔ قید ایک آزاد نظم ہے۔ جس کے تین حصے ہیں۔ شاعر نے بڑی خوش اسلوبی، فنکاری اور اثر انگیزی کیساتھ اپنے تجربہ فن کو پیش کیا ہے۔ قید خانہ کی یہ رات بڑی خاموش اور تنہا ہے لیکن اس سناٹے میں بھی شہر کے سینہ میں انگڑائیاں لیتی ہوئی شورش رہ رہ کر چونکاتی ہے۔ انسانوں کی بھیڑ، محروم تشنہ کام اور مطمئن شاہراہوں میں مچل رہی ہے اس کے قدم مصروف ہیں اس کے اوقات تنگ ہیں۔ لیکن اس کے ماتھے پر تردد کے نقوش نمایاں ہیں اس کے کاندھے پر ماضی کا غم اور مستقبل کے اندیشے سوار ہیں۔ ان گنت لوگ اپنے اپنے وجود کی جلتی ہوئی لاشوں کو ڈھو رہے ہیں۔ یہ سب حالات اور مسائل کے شکار ہیں۔ لیکن کون جانے کب ان کی خوابیدہ انا جاگ پڑے اور یہ سب ایک زبردست انقلاب کا سبب بن جائیں۔ شاعر نے تیسرے بند میں اپنے دل کی گہرائی سے نکلی، ہوئی آواز کو اس طرح ملفوظ کیا ہے۔ ؎

سالہا سال کی افسردہ و مجبور امنگ
طوق و زنجیر سے لپٹی ہوئی سو جاتی ہے
کروٹیں لینے میں زنجیر کی جھنکار کا شور
خواب میں زیست کی شورش کا پتہ دیتا ہے

مجھ کو غم ہے کہ میرا گنج گرانمایۂ عمر
نذرِ زنداں ہوا
نذرِ آزادیٔ زندانِ وطن کیوں نہ ہوا

اسے اس کا غم نہیں کہ اس کی قوت حیات نذرِ زنداں ہوگئی اسے فکر اس کی ہے کہ موجودہ معاشرے کی آرائش اور نئے نظام حیات کی تشکیل میں وہ کس طرح مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ "چارہ گر" ایک نظم ہے جس نے عوامی مقبولیت بھی حاصل کی ہے۔ اس کے رومانی مزاج کی وجہ سے اسکی طلسمانی کیفیت اور بڑھ جاتی ہے۔ اس کی قبولیت عام اس حقیقت کی سند ہے کہ مخدوم کی شاعری میں عوام پسند مزاج کی مکمل ترجمانی ہوتی ہے۔ آزاد نظم ہونے کے باوجود اس کے تمام فقرے اتنے نپے تلے ہیں کہ خوش سلیقگی کے ساتھ ان کی ادائیگی بجائے خود نغمہ و ترنم کا سبب بن جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ مخدوم رکھ رکھاؤ کے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں روایتوں کے احترام کا جذبہ بھی ہے اور فکر و فن کے نئے اسلوب و آہنگ کی دریافت کا میلان بھی۔ ان کی شاعری میں عصری سوز و گداز اور بصیرت و مسرت کے ساتھ ساتھ وہ ناآسودگیاں اور محرومیاں بھی ملتی ہیں جن سے ہم سب دوچار ہیں۔ مخدوم کی نظموں کی ساخت بالعموم جامع اور بہتہ دار ہوتی ہے۔ لفظوں کے استعمال کی کفایت ان کی ایک اہم صفت ہے۔ ترکیبوں کی تراش خراش اور مصرعوں کے دروبست پر بھی وہ فنکارانہ قدرت رکھتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ روایتی الفاظ و تراکیب میں بھی نئے جہان معنی کو افق تا افق پھیلاتے ہیں اور ان کی مدد سے سلسلۂ خیالات اور تلازمات کا ایک نہایت مربوط مکمل نظام بنا دیتے ہیں۔ سادگی، بے تکلفی، برجستگی، سلاست صفائی اور پاکیزگی انکے شاعری لفظیات کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ اسی وجہ سے انکی نظموں میں تکمیل کا شعور

مصوّر سبزواری

غزلیں

شامِ زوال ایک عجب سانحہ بھی تھی
انٹونی کی شکست کلوپیٹرا بھی تھی

جو قہقہے لگاتی تھی لاشوں کی راکھ پر
برباد بستیوں میں اک ایسی بلا بھی تھی

جاتے ہی اس کے ٹوٹ کے بجلی گری کہیں
وہ بے صدا نگاہ ترستی گھٹا بھی تھی

مصروفِ انتقام تھا ہر محبسِ مکاں
باہر کھڑی گلی میں فصیلِ ہوا بھی تھی

شاید تجھے بھی ہوگا شبِ رائگاں کا غم
ہر موجِ جسم و جاں کی بھنور سے جدا بھی تھی

کیا انکشافِ ذات خود اظہارِ وفا
خود میری ذات حق میں مرے بیوفا بھی تھی

مل کر بھی مطمئن وہ مصوّر نہیں لگا
شاید اسے تلاش ہمارے سوا بھی تھی

آندھی تھی تو تھک کے میں دھرتی پہ آ رہا
میں نے تمام ٹوٹتے پتوں کا دکھ سہا

اب رنجِ بے کنار کے دھاروں میں بہہ چلو
سیلِ بلا سے کٹ گئی دیوارِ قہقہہ

بستی سے کون چھپ کے یہاں پر ہوا تھا غرق؟
دریا نے خشک ہو کے دیا جس کا خوں بہا

خوفِ سفر کی دین تھا وہ راستوں کا قرب
منزل پہ اس سے کوئی بھی رشتہ نہیں رہا

پچھلی صدی میں تیرا جہاں منتظر تھا میں
اب چاٹتا ہے سونے کھنڈر کو اک اژدہا

جائے امانِ شب نہ مصوّر مجھے ملی
میں ساری عمر دھوپ کے سیلاب میں بہا

ساحل احمد

غزل

شام ہوتے ہی سویرا ہو گیا
آسماں کا پر سنہرا ہو گیا
زرد آندھی سے جو پتے اڑ گئے
زخم بڑھ کر اور گہرا ہو گیا
پتھروں کی بارشیں ہونے لگیں
نرم دریا آج صحرا ہو گیا
جسم کی ساری تھکن تو مٹ گئی
چاند لیکن غم سے پیلا ہو گیا
درد آنکھوں میں سمٹ کر تھم گیا
اک سمندر تھا جزیرہ ہو گیا
سرخ پھولوں کا بدن بھی سرخ تھا
پر سکوں ساحل کا چہرہ ہو گیا

★★

واحد پریمی

غزل

ہم کہ سوکھے ہوئے پتے ہیں جو جھڑ جاتے ہیں
بادِ طوفان سے تو پتھر بھی اکھڑ جاتے ہیں
اپنا سایہ بھی گریزاں نظر آتا ہے اسے
جبکہ انسان کے حالات بگڑ جاتے ہیں
نام گلچیں تو ہے بدنام، کئی باغ مگر
خود نگہبانوں کے ہاتھوں ہی اجڑ جاتے ہیں
ان پہ کیا کچھ نہ گزرتی ہے کبھی سوچا ہے
اپنے غولوں سے پرندے جو بچھڑ جاتے ہیں
اپنی ہی سست روی کا ہے نتیجہ اکثر
وقت کے داؤں میں آکر جو پچھڑ جاتے ہیں
موت بھی چاہیں تو ملتی نہیں ان کو واحد
زندگی کے جو شکنجوں میں جکڑ جاتے ہیں

شعاعوں کی صلیب

معاصرین کی نظر میں

شمیم کرہانی۔ (دہلی)

کرامت علی کرامت کی شاعری فکر و شعور کی شاعری ہے۔ ان کے فن کے پس منظر میں تفکر کا وہ رچاؤ ہے جو نئی نسل کے جدید مسائل کے آہنگ رنگ سے صورت پذیر ہوا ہے۔ خصوصیت سے ان کی نظمیں ان علائم پر منحصر ہیں جنھیں جدید سائنسی اور تازہ ارتقائی تجربات کی برکتوں نے مہیا کیا ہے ان کا شعری اسلوب، بیانِ حال نہیں ہے بلکہ ماضی کے ادبی سماج میں رچ بس کر حال کا انفرادی لہجہ بنا ہے۔ دراصل موضوعات کا تنوع، فنکار کے مشاہدات، تجربات اور احساسات کا فیضان ہوتا ہے۔ آج کے دور میں تہذیبی اقدار غیر یقینیت اور عمرانی تصورات کے انتشار نے موضوعات کے انبار لگا دیئے ہیں۔ لیکن ایک مبصر فنکار جب ان موضوعات کو شعری جامہ پہناتا ہے اور اپنی سعی میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اپنے فن کے لئے کسی شائستہ ماحول فراہم کر لیتا ہے۔
ان کا یہ شعر۔

دراصل حال کی ہے وہ آزادئ عمل
فردا کی کشمکش میں مقدر کہیں جسے

ان کی ادبی خوش نصیبی کے شاندار مستقبل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ان کا مجموعہ "شعاعوں کی صلیب" ایسے ہی جدید لیکن متوازن افکار و خیالات کا صحت مند مجموعہ ہے مجھے یقین ہے کہ قارئین اس مجموعے کا مطالعہ کرتے ہوئے کرامت علی کرامت کی فکر انگیز کوششوں سے کشادگی خاطر محسوس کریں گے اور زندگی کی تہ در تہ کاوشوں سے لطف اندوز ہوں گے۔

ڈاکٹر خلیق انجم (دہلی)

کل شام کی ڈاک سے "شعاعوں کی صلیب" موصول ہوئی۔ اس کرم فرمائی کا تہِ دل سے شکرگزار ہوں۔ میں تو آپ کا دیرینہ مداح ہوں، رات کو ایک ہی نشست میں تمام مجموعہ پڑھ ڈالا۔ اگر جدید شاعری یہ ہے تو حضور میں سو فی صدی جدید۔ لیکن لیکن اگر جدید شاعری وہ ہے جس کے بعض نمونے تحریک اور شب خون میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور جسے سمجھنے میں میری تمام صلاحیتیں ناکام ہو جاتی ہیں تو جدیدیت سے میری توبہ، سائنسی علم کا جتنا صحیح، متوازن اور برجستہ استعمال آپ کی شاعری میں ہوا ہے اردو شاعری اس سے اب تک محروم تھی۔ اس سلسلے میں سرگزشتِ سفر اور تناسخ دو نظمیں مجھے بہت پسند آئیں۔ مجھے آپ کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ نظر آئی ہے کہ وہ ہم عصر زندگی کی ترجمانی کرتی ہے۔ لب و لہجہ اور انداز بالکل تازہ اور شگفتہ ہے لیکن روایت سے اس کا رشتہ بھی مضبوط ہے۔

خواہ مخواہ فکر اور اندازِ بیان کو قلابازیاں کھلا کر روایتوں سے انکار کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ آپ کو میرے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ ہو جائے۔ اس لئے عرض کرتا ہوں کہ اردو شاعری اور ادب کی بے شمار روایتوں کا منکر ہوں۔ "میں تیرے گھر آجاؤں ورنہ تو میرے گھر آجا" جیسی غزل سے سخت متنفر ہوں لیکن بعض روایتوں کو عزیز بھی رکھتا ہوں۔ "شعاعوں کی صلیب" پڑھ کر مجھے آپ سے ذہنی قرب کا احساس ہوا۔ اسی لئے اپنے تاثرات سے آپ کو آگاہ کیا ہے۔

احمد عظیم آبادی (جمشید پور)

"شعاعوں کی صلیب" پڑھ لینے کے بعد تعمیل حکم کی خاطر آپ کے کلام کے جو چند نمایاں پہلو اپنے ذوق اور تجربات کی روشنی میں پیش کر رہا ہوں وہ سب کے سب تاثراتی محض ہیں اور کچھ نہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

(۱) شعاعوں کی صلیب "صوری حیثیت سے جاذب نظر اور دلکش ہے۔ بالخصوص گردپوش بہت ہی (SUGGESTIVE) ہے البتہ کتابت کہیں کہیں ضعیف نظر آتی ہے۔ جسے طباعت نے سنبھال لیا ہے۔

(۲) "شعاعوں کی صلیب" کی وجہ تسمیہ کی تلاش میں آپکے (PSYCHIC RESIDVE) کا سراغ ملتا ہے۔ اس نام کی نظم کا THEME) اور "میرے اوراق زندگی" کی بعض سطور بھی میری اس بات کی تصدیق کرتی ہیں۔ ممکن ہے یہ نفسیاتی باقیات آپ کی ذاتی بھی ہوں اور نسلی بھی۔

(۳) "میرے اوراق زندگی" میں آپ کے تعلیاتی جملے ممکن ہے قدیم یا متوسط شعری تہذیب کے لئے بار خاطر ہوں۔ مگر ان جملوں سے آپ کی نظموں کے انکشافی گوشے روشن ہو گئے ہیں اور ابلاغ کی دشواری کم ہو گئی ہے۔

"میرے اوراقِ زندگی میں سرا ہے آپنے
میرا نام بھی یہی ہے
"بدن را بہ نیکان بہ بخشد کریم"

حالانکہ میں نے آپ کی کوئی ادبی حوصلہ افزائی نہیں کی ہے اور نہ مجھ میں یہ صلاحیت ہی ہے۔ لہذا اپنا ذکر مجھے گوشیں محسوس ہوا۔ "شعاعوں کی صلیب" جیسی کتاب کا دامن ایسی باتوں سے پاک ہونا تھا۔

(۴) شعاعوں کی صلیب" مجموعی طور پر مجھے دل کی دھوپ اور دماغ کی چھاؤں کا آمیزہ محسوس ہوئی۔ چند ابتدائی نظموں کے انکشافی گوشے تشبیہات استعارے اور علائم کی جھلملی کے عقب سے آپکے وجدان اور تصورات کے عمق اور وسعت کا پتہ دیتے ہیں اور آپ کی فکر کی تعمیر میں عقلیت، وجدانیت اور وجودیت کے خمیر کی نشان دہی کرتے ہیں۔ آپ کی بعض نظموں کے غیر حیاتی پیکروں پر (اور غزلوں کے بعض اشعار پر) تصوف کا بھی مغالطہ ہوتا ہے تو اس کا ایک سبب تو سائنسی معلومات سے استفادہ ہے (اور یہاں آپ مجھے (PARNASEE) دبستان کے (LECONTEDELISLE) کے خواب کی تعبیر نظر آتے ہیں) اور دوسرا سبب یہ ہے کہ خیال کی قادریت OMNIPOTENCE OF THOU-GHT) جب کسی فنکار سے بغلگیر ہوتی ہے تو اس کی (فنکار کی) نفسیاتی باقیات کے خواب کو حقیقت بنا کر اسی طرح پیش کرتی ہے۔

سائنس اور روحانی تشکیک کے اس دور میں آپ کی شاعری مذہب کی جانشین بننے کی اہلیت رکھتی ہے یہی بات چند دوسرے صالح اور محتاط جدید شعراء کے

یہاں بھی پائی جاتی ہے۔ جہاں کہیں آپ نے اپنی نظموں میں آرٹ کو مفید بنانے کی کوشش کی ہے، آرٹ کا حسن مجروح ہونے سے نہیں بچ سکا ہے۔ دوسری بات یہ کہ سائنٹیفک معلومات سے استفادوں میں شاعرانہ رچاؤ کی کمی کھٹکتی ہے۔ لیکن بہرحال ان کی انکشافی اہمیت سے انکار مشکل ہے۔ گرچہ میں عروض کے کٹر پن کا قائل ہوں ــــ مگر چونکہ آپ اس معاملہ میں بہت محتاط ہیں اس لئے دبی زبان سے کہوں گا کہ صفحہ ۸۰ پر "میری قربانی کی خاطر بردار عیسیٰ بھی" میں "ر" اور "خاطر" کا وصل تقطیع میں محل نظر ہے۔"

(۵) (SENSE OR GANS) سے بلند ہو کر کچھ کہنے کی کوشش آپ کے یہاں نظموں سے زیادہ غزلوں میں پائی جاتی ہے۔ آپ یہاں SENSE (محسوسات) اور (INTUITION) (وجدان) کے درمیانی دقیقوں کی سطح پر ملتے ہیں۔ اس سے آپ کے تابناک مستقبل کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔ میں اپنی اس رائے کے ضمن میں آپ کی غزلوں سے بہت سارے اشعار پیش کر سکتا ہوں۔ جیسے مثلاً

"جب بھی نظر کو وقف تمنا کریں گے ہم
اس حسن شش جہات سے الجھا کریں گے ہم

یا

شہ رگ سے جو قریب ہے وہ ہے نظر سے دور
یعنی مرا شعور رگ فکر درمیاں ہے

وغیرہ وغیرہ۔ ضمنی اعتبار سے آپ کی غزلیں آپ کی نظموں سے صاف ہیں۔

(۶) آزاد غزل گوئی اردو شاعری میں کیا اور کیسے اضافہ کا باعث ہو سکتی ہے۔ یہ بات میری فہم سے بالاتر ہے۔ اس لئے اس کے بارے میں کچھ کہنے سے معذور رہوں۔

(۷) میرے خیال میں ترجمے مترجم کے حرف تنزیب ہوا کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کے متعلق کوئی رائے محض تخیلی رائے ہوگی۔

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر میری کوئی بات گراں گزرے تو اسے WASTEPAPER BASKET کے حوالے کر دیں۔ اس لئے میں کیا ورنہ میری رائے کیا۔

پرکاش فکری (رانچی)

"شعاعوں کی صلیب" میری نگاہ میں محتاط، خوش سلیقہ اور وضع دار شاعری کی اچھی مثال ہے۔ اس میں کہیں وہ رندانہ لغزش نہیں یا وہ زندگی نہیں جو آدمی کو کبھی کبھی انجان اور اجنبی راستوں پر بھی پہنچا دیتی ہے۔ اس میں ٹھوکریں تو لگتی ہیں۔ بعض دفعہ رسوائیوں سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کچھ پچھتاوے بھی ہاتھ آتے ہیں۔ مگر ٹوٹے تجربوں اور پھر ان کی رنگا رنگی سے دامن دل مالا مال بھی ہوتا ہے اور تجربوں کی یہی دولت فن کا رانہ حیثیت مرتب کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ یہ باتیں آپ سے کہنا زیادہ ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ نے اردو شاعری (جس میں غزل بھی شامل ہے) کے بدلتے ہوئے تیوروں کو ہمیشہ پسند کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

ڈاکٹر زیدی جعفر رضا (علی گڑھ)

"شعاعوں کی صلیب" پا کر خوشی ہوئی۔ میری جانب سے دلی مبارکباد قبول کیجئے۔ یہ خواہ "ضمیر فنکار کی صداقت آواز" ہو یا ان سے مراد عین بالذات ہو۔ بقول میر:

آنکھیں جو ہوں تو عین ہے مقصود ہر جگہ
بالذات ہے جہاں میں وہ موجود ہر جگہ

انھیں بہرصورت زندہ رہنا چاہیئے۔

ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر ۔ ۔ ۔ (علی گڑھ)

ادھر مختلف النوع الجھنوں میں مبتلا رہا۔ بہر حال "شعاعوں کی صلیب" پڑھ ڈالی۔ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ مسائل پر غور و فکر کرنا ہر شخص کا کام نہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی ہر قسم کے تعصبات سے غیر متعلق ہو۔ آپ کا تعلق دہلی یا لکھنؤ سے نہیں ہے۔ اسی طرح آج جو گروہ سازی کی وبا عام ہو رہی ہے اس میں بھی آپ مبتلا نہیں ہیں۔ اس لئے آپنے جو کچھ لکھا ہے اس میں اعتدال کی صورت بھی ملتی ہے اور یہ بجائے خود بہت قابل قدر بات ہے۔

سائنس کے طالب علم کی ذہنی تربیت ہی کچھ اس طور پر ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی بات کو محض اس لئے تسلیم نہیں کرتا کہ یہ بات فلاں اور فلاں کے نزدیک مسلم ہے۔ وہ خود تجربہ اور مشاہدہ کے ذریعہ اس کی صداقت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ایسے لوگوں کی باتیں تربیت یافتہ ذہنوں کو زیادہ متاثر کرتی ہیں اس لحاظ سے بھی میں آپکی تحریروں کو زیادہ اہمیت دیتا رہا ہوں اب "شعاعوں کی صلیب" کا مطالعہ کیا تو اپنے سابقہ خیالات کی توثیق ہوئی۔ اس مجموعۂ کلام میں فکر و شعور میں اعتدال ملتا ہے۔ اور زبان بھی صاف ستھری اور عام فہم ہے۔ اڑیا بنگالی وغیرہ زبانوں کی نظموں کا ترجمہ کرکے بھی آپ نے اچھا کام کیا۔ صفحہ ۱۶۹ پر چار "ہیکو" بھی دیکھیں۔ یہ صنف جاپانی شاعری میں خاص طور سے مقبول ہیں۔ اردو میں آپنے اس صنف کے یہ نمونے پیش کرکے بڑا اچھا کام کیا دوسری زبانوں کے ادب کی خوبیوں سے اپنے ادب کو آراستہ کرنے کی یہ کوشش نہایت مستحسن ہے۔ بطور مجموعی اس مجموعے کو کامیاب کاوش سمجھتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ یہ عام طور سے مقبول ہو اور ادبی حلقوں میں قدر کی نظروں سے دیکھا جائے۔

زاہدہ زیدی ۔ ۔ ۔ ۔ (علی گڑھ)

ابھی کچھ دیر پہلے "شعاعوں کی صلیب" کا خوبصورت اور گرانقدر تحفہ موصول ہوا۔ اس عنایت کے لئے تہہ دل سے ممنون ہوں۔ چند نظموں کو اور غزلوں کو سرسری طور پر پر شوق سے دیکھا اور بعض چیزوں نے متاثر کیا۔ ظاہر ہے کہ ان کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کے لئے کافی اطمینان اور غور سے پڑھنا ضروری ہے۔ آپ کی شاعری یقیناً گہری توجہ کی مستحق ہے۔ آپ کے "اوراق زندگی" کا بھی سرسری مطالعہ کیا۔ آپ کی زندگی اور تجربات میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ لیکن آپ نے اپنی نظموں کے بارے میں جو اظہار خیال کیا ہے اور ان کی خوبیوں اور خصوصیات پر جو روشنی ڈالی ہے اسے اگر آپ قاری پر چھوڑ دیتے تو شاید زیادہ بہتر ہوتا۔ آپ کی کتاب کا سرورق بہت خوبصورت ہے۔ "شعاعوں کی صلیب" کے بارے میں تاثر ہے۔ اسے غور سے پڑھنے کے بعد اگر کچھ اور کہنے کی خواہش ہوئی تو آپ کو مطلع کروں گی۔"

جاوید نہال (کلکتہ)

"شعاعوں کی صلیب" معنوی و صوری اعتبار سے بہت پسند آیا۔ کیونکہ مختلف موضوعات پر ایسی نظمیں ملتی ہیں جو نئی جہت کی جانب اشارہ کرتی ہیں اور یہ نظمیں نہ صرف اثرانگیز ہیں بلکہ مجھے یقین ہے کہ نئی نسل کو یہ بے حد متاثر کریں گی۔"

آپ "مشرقی ہندوستان کے بہت اچھے شاعر ہیں اور نمائندہ بھی۔ مجھے ہمیشہ اس سے اختلاف رہا کہ اچھا نقاد ایک اچھا شاعر بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن آپ کی بعض نظموں جیسے "شعاعوں کی صلیب" "درد کا سورج"، "بے وزنی کا احساس"، "ایک کیفیت" وغیرہ بہت ہی کامیاب اور اثر انگیز نظمیں کہی جا سکتی ہیں۔ انکے مطالعہ کے بعد مجھے اپنی رائے بدل دینی پڑی۔ آپ نے "جدیدیوں" (بے راہ رو اور گمراہ") کی رو میں بہہ کر واقعی اپنی شاعری نہیں کی اور نہ ہی شاعری کی روح کو مجروح کیا ہے۔ آپ کی اکثر تخلیقات ایک باشعور شاعر کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ ایک سچے فن کار نے ان کی تخلیق ہی نہیں کی، بلکہ اسے ایسا پیکر دیا ہے کہ جو ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ خیال میں عمق و وسعت ہے۔ اور نئے آہنگ کے ساتھ لہجے میں تیکھاپن بھی موجود ہے۔ آپ کی اکثر چیزیں عصری تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہیں۔ آپ جدید حیات آفریں ادب کی نہج پر چلتے رہے تو یقیناً آپ کو اپنے مقصد کے حصول میں کامیابی و کامرانی نصیب ہو گی۔

"شعاعوں کی صلیب" میں صرف ایک چیز بری طرح کھٹکتی ہے جو آپ کا دیباچہ (میرے ادراکِ زندگی اور میری شاعری) اور جو آپ کے بھرپور تنقیدی مقالات سے بالکل الگ ہے اور اس میں ایک بالغ النظر نقاد ایک نیم پختہ اور الجھا ہوا تذکرہ نگار بن کر رہ گیا ہے۔ آپ کے مضامین جو وزن اور اسلوب میں جو شگفتگی اور سلاست ہے، وہ اس میں مفقود ہے۔ آپ کی نظموں کے مطالعہ سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ حرمت الاکرام کی شاعری سے آپ کی شاعری کچھ کم نہیں۔ آپ ان سے بہتر شاعر نظر آتے ہیں (ہو سکتا ہے کہ آپ کو اور بہت سے دوسروں کو میری رائے سے اتفاق نہ ہو) پھر آپ نے "اپنے ادراکِ زندگی اور شاعری" کے تحت بہت سی غیر ضروری باتیں لکھی ہیں جو نہ بھی آتیں تو شعاعوں کی صلیب کی اہمیت و افادیت میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ آپ نے غیر ضروری باتیں لکھ کر آپ سے زیادہ حرمت صاحب کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

نہ جانے کونسی کمزوری ہے جو آپ جیسے بیباک نقاد کو بے لوث اور غیر جانبدارانہ تنقید سے روکتی ہے۔ مشرقی ہندوستان سے ایک خوبصورت دیدہ زیب بہت اچھے اور مفید مجموعۂ کلام کی اشاعت کے لئے مبارکباد قبول کیجئے۔

عزمی جعفری (بھوپال)

اپنے نام ایک اجنبی کا خط پا کر آپ یقیناً متحیر ہوں گے اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ ابتدا ہی میں چند باتیں تعارف کے لئے اپنے بارے میں بھی کہہ دوں۔ میں کوئی بڑا ادیب یا شاعر نہیں۔ البتہ لکھنے پڑھنے کا شوق ضرور ہے۔ تنقید اور شاعری سے خصوصی دلچسپی ہے۔ پچھلے سال ایم۔ اے اردو فرسٹ ڈویژن، سکنڈ پوزیشن میں پاس کیا ہے۔ ایل ایل۔ بی۔ کئی سال قبل کر چکا ہوں۔ فی الحال ایک غیر ادبی ملازمت میں پھنسا ہوا ہوں جو اکثر شوق کی تکمیل میں رکاوٹ کا باعث ہوتی ہے۔ اب خط لکھنے کی وجہ بھی سن لیجئے! آپ کا مجموعۂ کلام "شعاعوں کی صلیب" ظفر صہبائی کی توسط سے دیکھنے کو ملا۔ مشمولات کا مطالعہ کیا اور بے اختیار جی چاہا کہ آپ کو مبارکباد دوں۔ لیکن یہ تصور تکلیف دہ ہے کہ کہیں آپ اسے رسمی اور روائتی نہ سمجھ بیٹھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کا مجموعۂ کلام معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے بلند معیار ہے یوں تو آج کل مجموعۂ کلام شائع کرنے کا رواج عام ہو گیا ہے۔ لیکن بہت کم مجموعے ایسے ہوتے ہیں جو غیر جانبدار اہلِ نظر کو متوجہ کر سکیں یا ادب کا عام قاری (جو کسی گروپ سے وابستہ نہیں)۔ ان سے اپنے ذوقِ ادب کی تشنگی دور کر سکے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ "شعاعوں کی صلیب" ان حلقوں میں اپنی انفرادی خصوصیت کی بنیاد پر ضرور مقبول ہو گا۔ . . . .

. . . . میری شاعری میں آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے مجھے ان سے اتفاق ہے۔ اور کوئی انصاف پسند انسان انکا منکر نہیں ہو سکتا۔ آپ کے تنقیدی نظریات میں بھی مجھے اپنی

جھلک نظر آتی ہے اور دراصل اسی ذہنی قرب نے مجبور کیا کہ میں آپ کو مخاطب کروں۔ جدیدیت کے سلسلے میں میری رائے ہے کہ اس گروہ میں بیشتر لوگ غیر سنجیدہ اور غیر مخلص ہیں۔ محض دوسروں کی دیکھا دیکھی میں زود مقبولیت اور سطحی شہرت کی لالچ میں اس بھیڑ میں آگھسے ہیں۔ ایسے افراد کی تعداد بھی کم نہیں جو اپنی کم علمی اور کم مائیگی کو چھپانے کیلئے جدیدیت کا لبادہ اوڑھے پھر رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں جدیدیت کا سرے سے مخالف ہوں۔ جدید رجحانات کو میں بھی پسند کرتا ہوں لیکن اسکے غلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تجربات کی آڑ میں شعر و ادب کے چہرے کو مسخ کرنا کوئی اچھی بات نہیں۔ ہیئت و مواد کے ایسے تجربے جو صالحاتِ شعر و ادب کے فروغ میں معاون ہوں اور ابلاغ کے مسائل پیدا نہ کرتے ہوں قابلِ ستائش ہیں۔

ابلاغ کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ جدید شاعر اپنی تسکین کے لئے لکھتا ہے۔ اس کو قاری سے کوئی مطلب نہیں یہ بات محلِ نظر ہے اور قاری پوچھ سکتا ہے کہ اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر ایسے فنکار اپنی تخلیقات کو شائع کیوں کراتے ہیں۔ تخلیقات کو شائع کرانے کی شعوری کوشش اور بعد ازاں تعریف و توصیف کی آرزومندی کا کیا مطلب ہے۔

آپ کے کلام میں کھوکھلی جدیدیت نہیں بلکہ صالح جدیدیت پسندی اور تعمیری جدت آمیزی ہے۔ اور تنقیدی نظریات بھی انھیں خصوصیات کے حامل ہیں۔ میرے تاثرات کا یہ مختصر سا اظہار ہے۔ اگر وقت نے اجازت دی تو آئندہ مجموعۂ کلام پر تفصیلی روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔

از سید جعفر عسکری۔ ماہلی

دردکا زخم...

درد تھم جاتا ہے
تو ـــــ
زخم بھی بھر جاتا ہے
لہو رستا ہوا
جم جاتا ہے!
ہاں مگر درد کا زخم؟
بے نشاں زخم!
نہ تو آتا ہے نظر
اور ـــــ
نہ لہو رستا ہے!
ہو سکے درد کے اس زخم کا چارہ بھی اگر
جاوداں زخم کا احساس نہیں مٹ سکتا!!

**

رشید عبدالسمیع جلیل

چاند اور گیتی

چاند تو دور تھا
روز و شب کے تغیر سے بھی ماورا
چاند کی سرزمیں
تھیں صدیوں میں انسان پر
جب ہوئی آشکار
چاند کا پیرہن بھی ہوا تار تار
ہم نے سوچا کہ بس
امن کی جستجو میں ہوئی فتح کامل نصیب
عرش سے فرش تک
چاند کی روشنی بانٹ کر
جادۂ امن کو ہم نے وسعت بھی دی
چاند عریاں ہوا
اور انسان کے نقش قدم
چاند کے جسم پر جا بجا ہو گئے مرتسم
اور پھر
صرف اتنا ہوا
امن کے نام پر
ذہن گیتی کا ظلمت کدہ
وقت کی دھوپ میں جل گیا
چاند اپنی بلندی پہ قائم رہا

★★

رحمن جامی

گرم لمحے

یہ سرد لمحے
مرا مقدر کبھی نہیں تھے
کبھی نہیں ہیں
کبھی نہ ہوں گے
یہ سرد لمحے (جو اتنے شدید تر ہیں
یہ اس سے پہلے کبھی نہیں تھے
مگر یہ آ کے مجھ سے خود ہی پگھل رہے ہیں
کہ مجھ میں گرمی ہے زندگی کی۔

میں گرم لمحوں کا میزبان ہوں
کہ گرم لمحے حرارتوں حرکتوں کے موصل
حیات خودسر کے پاسباں ہیں

میں گرم لمحوں کی تیز بھٹی میں جل چکا ہوں
اور آج تک بھی میں جل رہا ہوں
جلوں گا برسوں
کہ گرم لمحے ہی زندگی ہیں
(کہ زندگی سے ہے پیار مجھ کو)

نجیب رامش (افریقہ)

ناتمام غزل

کتنا بھٹکائیں گے، دیکھیں یہ قدم تنہا سے
شام سنجیدہ و رنجیدہ سی ہم تنہا سے

اب نہ انکار کا فرماں ہے نہ اقرار کی بات
لوحِ بے لفظ، خیالوں کے قلم تنہا سے

بزمِ یزداں ہوئی ویران لکیروں سے ادھر
اس طرف رہ گئے پتھر کے صنم تنہا سے

اس کی باہوں کی طرح پھیل گئی ہیں سڑکیں
اور چکراتے ہیں اس شہر میں ہم تنہا سے

(۲)

آبلہ پائی کا موسم نہ رہا میرے بعد
چیختی پھرتی ہے صحرا میں ہوا میرے بعد

کم سے کم دہر سے وابستہ ہے اک رشتۂ صبر
یہ تعلق بھی اگر ٹوٹ گیا میرے بعد؟

جسم در جسم ہے اک چیختے وحشی کا قیام
کس سے پوچھے گے صحیفوں کا پتہ میرے بعد

اپنی تخلیق سے آسودہ و ناآسودہ
سوچ میں گم ہے سرِ عرش خدا میرے بعد

★★

امین جعفری

غزل

اوڑھ کر میں کربِ دوراں کی ردا
کر رہا ہوں طے نفس کا فاصلہ

شہرِ دل میں حسرتوں کا قافلہ
زہرِ تنہائی کا پی کر مر گیا

ہر نفس پِس کر بھی غم کی بھیڑ میں
آدمی تنہا کا تنہا ہی رہا

رینگتے ہیں کرمکِ بغض و عناد
شہر کا ہر جسم ہے دیمک زدا

پھر دریچے ذہن کے روشن ہوئے
پھر کسی یاد کا سورج آگا

پھر سُلگ اٹھا ہے ملبوسِ حیات
چیختی ہے پھر زمستانی ہوا

پتھروں سے چھن رہی ہے روشنی
کون ان ٹیلوں کے پیچھے ہے چھپا

ڈاکٹر زرینہ ثانی

آزاد غزل

ہم ہیں ذرّے مگر جس طرف جائیں گے نور پھیلائیں گے
بن کے پھولوں کی خوشبو بکھر جائیں گے
جن کو رہبر ملے وہ چمکنے لگے آگے بڑھتے گئے
میرا گوہر کسی نے تراشا نہیں، سنگ خارا کی اس میں چمک پائینگے

ان کی ہر ہر ادا رشکِ صد گلستاں، انکا حسن مجسم وحید زماں

ہم بھی لاکھوں میں ان کو نظر آئیں گے
خود پرستی کا ان کی سبب ہے یہی صاف گوئی کی جرأت کسی میں نہ تھی

سب یہ کہتے رہے ٹھیک فرمائیں گے، جو بھی فرمائیں گے
آپ کا آستاں فخر کشمیر یا رشک جنت سہی
گر یہ طرز تغافل رہا آپکا ہم بھی خود دار ہیں تا ابد اٹھ جائیں گے۔

★★

عقیل شاداب

غزل

زندگی مجھ کو مری نظروں میں شرمندہ نہ کر
مر چکا ہے جو بہت پہلے اسے زندہ نہ کر

حال کا یہ دکھ ترے ماضی کی مجھ کو دین ہے
آج تک جو کچھ کیا تو نے وہ آئندہ نہ کر

تو بھی اس طوفان میں اک ریت کی دیوار ہے
اپنی ہستی بھول ہر ایک کی نندہ نہ کر

سورما ہوتے ہوئے بھی جس نے بازی ہار دی
ایسی بزدل فوج کا مجھ کو نمائندہ نہ کر

جسم کیا شے ہے کہ میری روح تک جل جائے گی
آگ میں اپنی جلا کر مجھ کو تابندہ نہ کر

★ ★

راستے

میں جہاں کھڑا تھا وہاں سے کئی راستے آگے جاتے ہوئے دکھائی پڑ رہے تھے۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ کچھ لوگ اپنے کام میں مصروف تھے۔ ان کے چہروں پر تجربے کی کھینچی لکیریں ان کی عمر کی چغلی کھا رہی تھیں۔ میں اس جگہ کے لئے نووارد تھا۔ میں نے ان میں سے ایک شخص سے پوچھا:

" قبلہ ہمیں اس سفید محل تک پہنچنا ہے۔ جس کا تذکرہ کتابوں میں ملتا ہے۔ ہم بہت دور سے آرہے ہیں۔ کیا آپ ہماری مدد کریں گے؟"

کیوں نہیں جی! اسی راستے پر آگے چلے جاؤ۔ یہاں سے تقریباً ایک فرلانگ کی دوری پر ایک راستہ دائیں جانب جاتا ہے۔ اس پر ہو لینا۔

ہم بیحد خوش تھے۔ میں نے ان کی آنکھوں کی طرف دیکھا اور شفقت کے وجود کا قائل ہوگیا۔ ابھی ہم دو چار ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ آواز آئی:

بھئی میں خود وہاں جانا چاہتا تھا —— مگر —— جانے دو اس قصّے کو —— تم صحیح راستے پر ہو، ہو،

ہم آگے بڑھ گئے۔ راستہ صاف ستھرا تھا۔ کنارے کنارے سایہ دار درخت خموش کھڑے تھے۔ کچھ دور پر ایک پبلک کنواں تھا۔ ہمارے چند ساتھی اپنی پیاس بجھا کر رہے تھے۔ مجھے اپنے شہر کا نل یاد آرہا تھا۔ جو ہر وقت کھلتا ہے اور وقت پہ بند ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے چند سال اور پیچھے چھوٹ جائیں تو ہم سب کو پیاس بھی وقت ہی پر محسوس ہونے لگے۔ اب مجھے یقین ہوگیا تھا کہ ہم صحیح راستے پر ہیں۔ میں نے اپنے ہم سفروں کی طرف دیکھا۔ وہ سب مسکرا رہے تھے۔

"اب ہم لوگ یقیناً پہنچ جائیں گے۔"

"ہاں مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے،

دیکھو وہی راستہ دائیں جانب جا رہا ہے۔"

ہم سب دائیں جانب والے راستے پر مڑ چکے تھے۔ کچھ لوگ بائیں جانب والے راستے پر نظر آرہے تھے۔ خیال آیا۔ کیوں نہ ان لوگوں کو غلط راستے پر جانے سے روک دیا جائے۔

اجی! اپنی خیر لو —— یہ بائیں جانب والا راستہ ہی سفید محل تک جاتا ہے۔

—— اور ہم لوگوں میں چار کی کمی ہوگئی۔ یہ راستہ جس پر اب ہم لوگ مصروف سفر تھے ایک ہرے بھرے جھیل کے کنارے کنارے جا رہا تھا۔ ہمارا ایک ساتھی یکایک چیخنے لگا۔

" رکتے کیوں نہیں، یہ جھیل کتنا خوبصورت ہے۔ یہ مسکراتے ہوئے کنول کیا تمھیں اچھے نہیں لگتے —— کس مٹی کے بنے ہو۔ ؟"

میں نے نظر بھر کر جھیل دیکھی اور اس کی مقناطیسی مسکراہٹ سے لطف اندوز ہونے لگا۔ مگر دوسرے ہی لمحے

ہونٹ نیلے ہو گیا۔ میں صرف ہونٹوں کی مسکراہٹ کی گونج میں نہیں نکلا تھا۔ کچھ لوگ جھیل کے اندر اس طرح اچھل رہے تھے۔ جیسے اسی جھیل کے پلے بڑھے ہوں۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو روکا۔ مگر اس بار بھی دو چار کی کمی ہو گئی ——— ہم کچھ دور اور آگے بڑھے تو پتہ چلا یہ راستہ یہیں ختم ہو جاتا ہے۔ آگے گہری کھائی تھی۔ کھائی کے اوپر کا پل ٹوٹا ہوا تھا۔ میرے ایک ساتھی نے اپنی آنکھیں بند کی اور وہ کھائی کے اس پار پہونچ گیا۔ ہم لوگ ایسا نہ کر سکے اور لوٹ کر بائیں جانب والی راہ پر ہو گئے۔ ہم نے ان ساتھیوں کو بھی ڈھونڈا۔ مگر وہ مل نہ پائے۔ شاید وہ لوگ خود کو اس جھیل میں کھو چکے تھے۔

اب ہم دوسرے راستے پر چل رہے تھے۔ یہ راستہ کچھ دشوار تھا۔ سڑک پر پڑے ہوئے۔ پتھروں کے ٹکڑوں کو شاید نمی کی تلاش تھی۔ یہ ہمارے تلوؤں میں بری طرح چبھ رہے تھے آس پاس کی سبھی پہاڑیاں ننگی کھڑی تھیں۔ جیسے جنم جنم کی پیاسی ہوں۔ سبزے کا دور دور تک نام و نشان تک نہ تھا۔ تھکاوٹ کے احساس نے ہمارے قدموں کو بوجھل کر دیا تھا۔ یکایک ایک ساتھی کو نہ جانے کیا ہو گا۔ وہ آگے جانے سے انکار کر رہا تھا۔ بار بار ہمیں یقین دلا رہا تھا کہ پہاڑیاں مخملی گھاس سے ڈھکی ہیں سفید محل یہی ہے۔ مجھے غصہ آرہا تھا۔ میں نے فوراً پوچھا۔

"تمھیں پیاس لگ رہی ہے؟"

"نہیں۔"

"تم بھوک محسوس کر رہے ہو؟"

"نہیں۔"

"تم کسی قسم کی تکلیف محسوس نہیں کر رہے ہو؟"

جی نہیں،

اب میرے پاس کوئی سوال باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ہم سب [illegible] بڑھنے کے سوا کیا کر سکتے تھے۔ وہ وہیں ٹھہر گیا۔ ابھی

ہم دو چار کیلو میٹر ہی گئے تھے کہ ایک بزرگ سے ملاقات ہو گئی ان کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی کشش تھی وہ مسکرا رہے تھے۔

تم لوگ نو وارد معلوم ہوتے ہو۔

"ہاں۔"

"تمھیں سفید محل جانا ہے نا۔"

"جی ہاں، ہم سب وہیں جا رہے ہیں۔

میں وہاں کئی بار جا چکا ہوں۔"

"اچھا.....؟

"ہاں ——— چلو میں تمھاری مدد کرتا ہوں،

ہم سب بیحد خوش ہو گئے۔ سورج بالکل سر پر مسکرا رہا تھا۔ دھوپ کی تمازت نے برا حال کر دیا تھا۔ حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔

"پیاس لگی ہے۔ بابا!"

"چلو میں تمھیں پانی پلاتا ہوں بس یہاں سے ایک کیلو میٹر کی دوری پر صاف شفاف چشمہ ہے۔"

ہم جلد سے جلد اس چشمے تک پہنچ جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ عجیب و غریب ٹیڑھے میڑھے راستوں پر چلتے رہنے کے بعد یہ خبر ملی۔"

"بس اس سایہ دار پیڑ کے نیچے،

میں نے اس پیڑ کو غور سے دیکھا۔ پھر تعجب سے بابا کی شکل دیکھنے لگا ——— اس پیڑ میں ایک بھی پتا نہیں تھا ——— صرف جھلسی ہوئی سیاہ سیاہ شاخیں۔ اب ہم لوگ وہاں پہنچ چکے تھے۔ مجھے بیحد غصہ آرہا تھا وہاں صرف ایک گڈھا تھا جس کا پانی تقریباً خشک ہو چکا تھا ہوائے سرخ سرخ کیچڑ کے وہاں کچھ نہ تھا۔ حلق کے کانٹے بغاوت پر تلے تھے۔ مگر میں نے طے کیا ایسا پانی ہرگز نہیں پی سکتا۔

سب پر بزرگ کا رعب غالب تھا۔ میں نے اپنے پاس کھڑے ساتھی کے کان میں اپنی بات کہی۔ اس نے

دوسروں تک پہونچادی — مگر کچھ لوگ آنکھیں بند کئے ہوئے اپنی پیاس بجھا رہے تھے۔ ہم میں سے جنکی آنکھیں کھلی تھیں حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور پھر خوشی سے الگ ہو کر ایک دوسرے راستے پر چل پڑے

یہ راستہ آگے جاکر کچھ کشادہ ہو گیا تھا۔ ایک شخص راستے پر کھڑا تھا۔ آگے جانے سے روک رہا تھا۔ بار بار کہہ رہا تھا یہی راستہ سفید محل تک جاتا ہے۔ مگر بغیر کپڑوں سے آزادی حاصل کئے یہاں سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہمیں سفید محل کی خوبیاں معلوم تھیں۔ سڑک کی ایک طرف میدان میں بہت سارے لباس پھینکے پڑے تھے۔ خیال ہوا یہ سارے کپڑے شاید ان لوگوں کے ہیں جو ہم سے پہلے منزل پر پہونچ چکے ہیں۔ اب ہم کپڑوں سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ کچھ دور جاکر یہ راستہ ایک میدان میں ختم ہو جاتا تھا۔ یہاں ایک بھیڑ تھی۔ ہر شخص کا چہرہ نورانی ہو رہا تھا۔ جیسے اندر سے بھرپور سکون اور مکمل اطمینان جھانک رہا ہو۔ ہم جب انکے قریب پہنچے تو ایک آدمی ایک سمت اشارہ کرنے لگا۔ وہاں ایک بزرگ آنکھیں بند کئے عبادت میں مشغول تھے۔

"حضور! ہمیں سفید محل جانا ہے۔ راستہ نہیں ملتا۔

اب صرف دو چمکتی ہوئی بڑی بڑی سرخ آنکھیں تھیں۔"

"کیوں نہیں ملتا؟"

"بس ہم اتنا جانتے ہیں کہ نہیں ملتا۔

تم اپنی آنکھیں بند کر دو۔"

میرے کچھ ساتھیوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ یکایک ان کے چہرے روشن ہو گئے۔ وہ دیوانے کی طرح چیخنے لگے۔

"ہم سفید محل تک پہونچ گئے۔

"ہم سفید محل تک پہونچ گئے۔

میں اور میرے وہ ساتھی جن کی آنکھیں کھلی تھیں حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ یکایک انھیں کیا ہو گیا۔ مگر ان کے روشن چہروں سے انکار ممکن نہیں تھا۔ بزرگ اب مسکرا رہے تھے۔

مل گئی نا تمھاری منزل؟"

"ہاں، ہاں — نہیں نہیں۔

"کیا انہیں کہنے والوں نے میرے حکم کی تعمیل نہیں کی۔

"کیا مطلب —؟"

"کیا تم لوگوں نے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں؟"

"ہاں،

اب تمھیں کبھی اپنی منزل نہیں مل پائے گی۔"

"تمھارے لئے یہ سفید محل نہیں ہے۔ تم لوگ اب واپس جا سکتے ہو۔ لوٹ جاؤ۔

مگر ہم بہت طویل راستہ طے کر کے یہاں تک پہنچے ہیں۔

"ٹھیکتے رہنا اب تمھاری قسمت بن چکے ہیں — واپس جاؤ — اب تو تم وہاں بھی نہیں پہنچ سکتے۔ جہاں سے چلے تھے۔

... تم لوگ اپنا سب کچھ کھو چکے ہو۔

میں نے اپنے ان ساتھیوں کی طرف دیکھا جن کی آنکھیں بند تھیں۔ ان کے چہرے روشن تھے۔ وہ اب اس میدان کی بھیڑ کے ایک جزو بن چکے تھے۔ میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بوجھل قدموں کے ساتھ واپس آرہا تھا — ہمارے پاس جو بھی قیمتی شئے تھی وہ بھی لٹ چکی تھی۔ ہمارے سامنے ایک لق و دق ریگستان منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ میں اس اژدہے کی جسامت دیکھ کر کانپ گیا۔

اور اس دن سے آج تک میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ اب کس طرف جاؤں۔ کاش میری بھی آنکھیں اس وقت بند ہو جاتیں۔ اب ہزار کوشش کرنے پر بھی آنکھیں بند نہیں ہو پاتیں۔"

★ ★

احمد حسین آزاد

اسٹیبلشمنٹ

"اجنبی شہروں میں نیلے رنگ کے"
انگنت لمحوں کی زد سے
رہ سکے محفوظ جو
آج وہ چہرے سفیدی کے بھی بے چہرے ہوئے
چڑھتے سورج کی پرستش
پتھروں کو کورنش
دودھیا اور سبز رنگوں کی رگ ترکیب سے
زرد پتے بھی فضا میں مائل پرواز ہیں
آم کے پیڑوں کے منکر
برگدوں کی چھاؤں میں
پھیلتے پھلتے دھتورے
اور عنق پہ بھی کہ ہم
آج کے آذر بھی ہیں، مانی بھی ہیں، نخشب بھی اور شداد بھی
اور پھر غالب
شکست و ریخت میں اقدار کی
نیلگوں رنگوں میں بس ــــ سرخ و سیاہ !!

**

مراجعت

دھوپ نے کانوں میں پھونکا چھاؤں کے جس لمحہ اور

اژدھوں نے خون تھوکا ظلمتوں کے سیپ میں

ملگجی رنگوں نے لانے کو سلگتا دیکھ کر
کھڑکیوں کی اوٹ سے جھانکا تو دیکھا
اس کی لاش
مرمریں در پہ پگھلتی جائے ہے
سر پہ اس نے پاؤں رکھا ــــ اور
آنکھیں موندھ لیں
ہر طرف شعلے بھڑکتے، ڈھیر تھے بارود کے
اور پھر سہما سا وہ غاروں میں داخل ہو گیا!!

**

ہیر غازی پوری

غزل

(نذر یوسف جمال)

شوکیس کے سجے ہوئے گوشے میں قید ہے
شعر و ادب دکان کے جنازے میں قید ہے
ہنائیوں کے شہر سے ہو کر جلا وطن
یر اسکون صداؤں کے کمرے میں قید ہے
ب اپنا جسم لگتا ہے خالی مکان سا
یا روحِ عصر ذہن کے خانے میں قید ہے؟
ہجہ بھی منفرد نہیں بازارِ فکر میں
جذبوں کی ہر گرفت حوالے میں قید ہے
اتل کی شخصیت کو بھی مجروح کر نہ دے
ل خوف میرے خون کے قطرے میں قید ہے
لتا ہے ہر صحیفہ ورق تا ورق صلیب
یا شدتِ جنوں مرے جذبے میں قید ہے
الیدگیٔ ذہن شعور نگاہ و فکر
ب کچھ مری غزل کے اشارے میں قید ہے
وں کے انتشار میں اخلاص گم ہوا
ر شخص اپنی ذات کے کمرے میں قید ہے
سوچوں کی اک قطار ہے لفظوں کے شہر میں
اک کرب سا ظہیر کے لہجے میں قید ہے

غزل

اقبال طاہر

تہہ خانۂ دل میں جسے رکھا ہے سجا کر
چھپ جاتا ہے وہ شخص مجھے پاس بلا کر
میں شہر کی سڑکوں کا وہ انمول رتن ہوں
لے جاتی ہیں راتیں جسے بستر سے اٹھا کر
یہ چاند مرا دل ہے ستارے مری آنکھیں
میں کب سے تری راہ میں ہوں خود کو سجا کر
سچائی کا رس ہے مری باتوں کے کنول میں
اے وقت کی تتلی مرے لب چوم لے آ کر
پھولوں سے لدی شاخیں جھکا دیں گی کمر اپنا
تو دیکھ تو لے میری طرف ہاتھ بڑھا کر
جگنو ہوں مجھے چین حصاروں میں ملے گا
طاہر مجھے ترساؤ نہ مٹھی میں چھپا کر

★★

م۔ عالم

گئودان کا ایک نامراد کردار

گئودان پریم چند کا تخلیق کردہ ناول ہے۔
کہتے ہیں، ناول میں انسانی زندگی کی عکاسی ہوتی
یہ خیال درست نہیں۔ اگر ناول ہماری زندگی کا عکس
ہو تو ہر خواندہ انسان اپنے سامنے کی زندگی کو منعکس
لگے۔ نیز ہماری حقیقی زندگی اور ناول کی زندگی میں
فرق، کوئی بعد نہ ہو۔ ناول کی دنیا ہماری حقیقی زندگی
یادہ دلکش، منطقی اور جاندار ہوتی ہے۔ ہمارا وقت اکثر
گزرتا ہے۔ ناول کی زندگی بے معنی نہیں ہوتی۔ ناول
اروں کی طرز رہائش، ان کا اندازِ گفتگو، زندگی
نے کے طور طریقے سب رمز و حکمت سے پُر ہوتے ہیں جبکہ
پنی زندگی میں کچھ زیادہ غور و خوض سے کام نہیں لیتے۔
خدا نے یہ کائنات بنائی۔ اس کی تخلیق میں خود مختار
ہ انسانوں، حیوانوں یا دیگر مخلوقات کو زندگی اور موت
اہش کے مطابق بخشتا ہے۔ وہ جیسی دنیا بنانا چاہتا
بناتا ہے۔ اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ـــــ ناول نگار
پنی مرضی کے مطابق کرداروں کو زندگی اور موت دیتا
دل کی فضا اس کی خود ساختہ ہوتی ہے۔ انسانوں کی
ش، کائنات کی تخلیق میں خدا کی بہت بڑی مصلحت
ایسی ہی مصلحت ناول کی تخلیق میں ہوتی ہے۔ جیسے
آس پاس کی دنیا میں سانس لے کر زندگی کو تابت
میں، بعینہٖ، ناول کے کردار اپنے زمانی و مکانی حدود
ل ہیں دکھا کر ناول زندگی بخشتے ہیں۔

اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں، ناول میں زندگی کی عکاسی نہیں ہوتی۔ یہ خود زندگی ہے۔ اور ناول نگار، کامیاب ناول نگار ہمیشہ زندگی آفریں ہوتا ہے ـــــ ناول نگار زندگی کا خالق ہے اور ناول ایک نئی زندگی کی تخلیق۔

"گئودان" ایک ایسا ناول ہے، ایک ایسی زندگی ہے جس کے اکثر کردار گردشِ زمانہ کے شکار ہوتے ہیں۔ یہ کردار ہوری اور دھنیا ہوں یا رائے صاحب اور پنڈت اونکار ناتھ، گوبر دھن، بھولا، ماتا دین، ہیتا، یا کھنا ہوں، خواہ جھنیا، سلیا، مالتی اور گوبندی، آلام و مصائب کی مہیب شکلوں سے سبھوں کا سامنا ہوتا ہے۔"

اس کی ایک نمایاں وجہ پریم چند کے فن کا دائرہ ہے۔ وہ اکثر مظلوم زندگی پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کو ستم خوردہ بنا دیتے ہیں۔ ان کے قلم سے پیدا ہونے والا کردار مبتلائے گردشِ فلک ہوتا ہے ـــــ ہم یہاں گئودان کے ایسے دو کرداروں کو پیش کریں گے۔ جن کا انجام حسرتناک ہے۔ نیز یہ بھی غور کریں گے کہ ان میں سے کون نامراد کردار ہے۔

ایسے کرداروں میں ایک ہوری، دوسری ڈاکٹر مالتی۔
ہوری گئودان کا ہیرو ہے۔ پریم چند نے اپنی دوسری کہانیوں کے مرکزی کرداروں کی طرح ہوری کو بھی افلاس زدہ زندگی بخشی ہے۔ اس کی ابتدائی زندگی کی تصویر ایک

حد تک مناسب ہے۔ وہ کوئی بڑا زمیندار تو نہیں لیکن چند بیگھے زمین کا مالک ضرور ہے۔ گاؤں میں اس کا ایک مقام ہے۔ گاؤں کے مالک رائے صاحب سے اس کے تعلقات قریبی ہیں۔ اسی وجہ سے لوگ اس کی قدر کرتے ہیں۔

ہوری کے پاس سو سو کے دو بیل بھی ہیں، صرف گائے نہیں۔ گائے رکھنے کی تمنا اسے بیتاب کئے رہتی ہے۔ مقدر چند لمحوں کے لیے ساتھ دیتا ہے اور دروازے پر گائے جیسی نعمت آجاتی ہے۔ اس کی دیرینہ آرزو مہک اٹھتی ہے۔ مراد پوری ہوتی ہے وہ بے انتہائی مسرور ہوتا ہے۔

مالتی گئودان کے مرکزی کرداروں میں ایک اہم کردار ہے۔ مگر یہ ہیروئن نہیں اس کے ذکر کے ساتھ پروفیسر مہتا کا ذکر ضروری ہے۔ کہ اگر مہتا نہ ہوتے تو مالتی ہماری توجہ کی حاجتمند نہ ہوتی۔

مالتی جدید تعلیم یافتہ اور غیر منکوحہ لیڈی ڈاکٹر ہے۔ مسٹر مہتا یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر ہیں۔ وہ کئی اہم کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ مالتی کی طرح وہ بھی مجرد ہیں۔ ان کرداروں کے سیرتی نقوش کو پریم چند نے نہایت خوش اسلوبی سے اجاگر کیا ہے۔ ہم یہاں ان کے متعلق پریم چند کے صرف دو جملے پیش کرتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر مالتی کا تعارف کراتے ہیں۔"

"آپ نئے جگ کی مجسم مورت ہیں"

اور پروفیسر مہتا کے متعلق کہتے ہیں۔

"نئے جگ کی عورتوں سے پناہ مانگتے ہے"

ان دو جملوں سے مالتی اور مہتا کی سیرتی خصوصیات بہت حد تک واضح ہو جاتی ہیں لیکن ان کے ساتھ، ان جملوں میں جو تضاد ہے وہ ستاروں کی طرح صاف چمک رہا ہے۔ ان خصوصیات کے حامل دو مختلف انسانی جنس یکجا ہو جائیں تو ان میں تعلق پیدا ہوتے دیر لگے گی۔ مالتی اور مہتا بھی قریب آنے کے لئے "تمہید" صرف لیتے ہیں۔

گئودان کے چند جملے ملاحظہ فرمائیے:۔

(ناول کے باب چھ ہیں۔ رائے صاحب کے بنگلے پر دھنش یگیہ، اور ناٹک کا پروگرام ہے۔ اس میں مالتی، مہتا، کھنا، تنکھا مرزا خورشید، بجلی کے ایڈیٹر پنڈت اونکار ناتھ اور دوسرے حضرات مدعو ہیں۔ دعوت پوری کر کے مدعوئین شکار کا پروگرام بناتے ہیں۔)

پروفیسر مہتا کہتے ہیں:

"بس مالتی پکائیں گی اور ہم لوگ کھائیں گے"

مالتی جواب دیتی ہے:

"معاف کیجیے!" "آپ نے رات میں میری کلائی اتنے زور سے پکڑی کہ ابھی تک دکھ رہی ہے"

شکار کے سفر میں مالتی مہتا سے پوچھتی ہے:

"اچھا بتاؤ کہ رات تم نے مجھے اتنا کیوں ستایا؟ مجھے تم پر بڑا غصہ آرہا تھا۔ یاد ہے کہ تم نے مجھے کیا کہا تھا؟ تم ہمارے ساتھ چلے گا دلدار؟ میں نہ جانتی تھی کہ تم اتنے شریر ہو۔ اچھا سچ کہنا کہ کیا تم اس وقت مجھے اپنے ساتھ لے جاتے؟"

مہتا ان سنی ان سنی کر دیتے ہیں۔

شکار ہی کے دوران مالتی کہتی ہے:

"فلاسفروں کے شاید دل نہیں ہوتا۔ تم نے اچھا کیا کہ شادی نہیں کی۔ اس غریب کو مار ہی ڈالتے۔ مگر میں یوں نہ چھوڑوں گی"

اسی سفر میں ایک نالہ پار کرنا پڑا۔ مالتی کہتی ہے:

"تم نے کیسی آفت میں جان ڈال دی۔ مجھے
تمھارے ساتھ رہنا پڑے تو ایک دن نہ پٹے۔"

مہتا جواب دیتے ہیں:

"تم مجھے اتنا ڈفرنٹ سمجھتی ہو؟ اور جو میں
کہوں کہ تم سے محبت کرتا ہوں، مجھ سے بیاہ
کروگی۔؟"

مالتی کہتی ہے:

"ایسے سنگدل سے کون بیاہ کرے گا؟ رات
دن جلا کر مار ہی ڈالو گے۔"

اب پریم چند کا مختصر سا کمنٹ سنئے:

"اور محبت بھری آنکھوں سے دیکھا، گویا
کہہ رہی ہو، اس کا مطلب تم خوب سمجھ رہے
ہو۔ اتنے نادان نہیں۔"

ان مکالمات کو پیش کرنے کی خاص وجہ ہے۔ پریم چند نے ان جیتے جاگتے کرداروں کی شخصیت میں داخل ہو کر انکے نقش ہا کو جس طرح ابھارا ہے، ان سے قاری اندازہ لگا لیتا ہے کہ یہ دونوں کردار یقیناً باہم خلط ملط ہو جائیں گے — اسی امید و یقین میں ڈوبتے ابھرتے وہ بارہویں باب تک جاتا ہے لیکن ان میں کوئی قابل ذکر تعلق نہیں دیکھتا۔

اب آگے بڑھئے۔ ناول کے باب ۱۳ میں مہتا مرزا خورشید سے گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"آپ کا قیاس بالکل غلط ہے مرزا جی!
مس مالتی خوبصورت ہیں، خوش مزاج ہیں،
سمجھدار ہیں، روشن خیال ہیں، اور بھی ان
میں اتنی ہی خوبیاں ہیں۔ مگر میں اپنی زندگی
کی رفیقہ میں جو بات دیکھنا چاہتا ہوں، وہ
ان میں نہیں ہے اور نہ شاید ہو سکتی ہے۔
میرے ذہن میں عورت وفا اور ایثار کی مورت
ہے۔ جو اپنی بے زبانی اور اپنی قربانی سے اپنے
کو بالکل مٹا کر شوہر کی روح کا ایک جز بن
جاتی ہے۔ قالب مرد کا رہتا ہے۔ مگر جان عورت
کی ہوا کرتی ہے۔"

باب ۷ کے مکالمات سے یہ ظاہر تھا کہ مس مالتی پروفیسر مہتا کی گرویدہ ہو رہی ہے۔ باب ۱۳ کے اس اقتباس میں یہ جھلک بالکل صاف ہے کہ مہتا مالتی کو اپنی رفیقہ حیات بنانا مناسب نہیں سمجھتے۔

"میرے ذہن میں عورت وفا اور ایثار کی مورت ہے۔ جو اپنی بے زبانی اور اپنی قربانی سے اپنے کو بالکل مٹا کر شوہر کی روح کا ایک جز بن جاتی ہے —" یہ مہتا کی نگاہ میں عورت بحیثیت بیوی کا معیار ہے — ہمیں دیکھنا ہے، مالتی میں یہ خوبیاں ہیں یا نہیں۔

ان خوبیوں کی تلاش میں قاری ناول کے اوراق سے الجھتا ہوا اکیسواں باب تک پہنچ جاتا ہے۔ وہاں پہلی بار وہ دیکھتا ہے کہ مالتی خلوص و محبت سے بیلدی کی بہنوں سے مل رہی ہے۔ انھیں نیک مشورہ اور مفید ہدایتیں دے رہی ہے۔ مالتی کی اس خوبی کو مہتا دیکھتے ہیں اور انھیں اس سے یگانگت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہ احساس صادق ہے۔ اسی احساس سے متاثر ہو کر وہ مالتی سے کہتے ہیں:

"تم میرے ساتھ چلوگی نہ! اس سونی
بستی میں جہاں سپنوں کا راج ہے؟"

یہ مہتا کا پہلا رومانی جملہ ہے۔ یہاں پہنچ کر قاری چاندنی کی شادابی اور سبزے کی لہلہاہٹ سی محسوس کر رہا ہے۔ اسے یقین ہونے لگتا ہے کہ مہتا اور مالتی کی محبت کے حسین مضراب اب نغمہ چھیڑ دیں گے۔

آگے اسی باب میں یہ دونوں کردار دریا کی سیر کے لئے ایک کشتی بناتے ہیں اور سیر کرنے لگتے ہیں۔ مالتی پوچھتی ہے:

"میں تمھاری زندگی میں کبھی نہیں آئی؟"
مہتا ہاتھ پکڑ کر جواب دیتے ہیں :

"آتی ہو۔ بار بار آتی ہو۔ خوشبو کے
ایک جھونکے کی طرح۔ تصور کے ایک عکس کی
طرح اور پھر غائب ہو جاتی ہو۔"

"یہ مہتا کا دوسرا رومانی جملہ ہے۔ اسے پڑھ کر خود پڑھنے والے کا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ خیالِ وصل کو حسین آرزوئیں جیسے جھولا جھلانے لگتی ہیں۔ اس کی حیثیت اس ممتحن کی سی ہو جاتی ہے جو اپنا نتیجہ دیکھنے کے لئے اخبار کے موٹے حروف کو ٹٹولنے لگتا ہے۔ مالتی مجبوراً نہ پوچھتی ہے:

"مگر تم نے اس کا سبب بھی سوچا یا
سمجھنا چاہا؟"

مہتا جواب دیتے ہیں :

"ہاں مالتی! بہت سوچا اور بار بار
سوچا۔"

وہ اور زیادہ بیقرار ہو جاتی ہے :

"تو کیا ہوا؟"

جواب ملتا ہے :

"یہی کہ جس بنیاد پر اس زندگی کا گھر
کھڑا کرنا چاہتا ہوں وہ ناپائیدار ہے۔ یہ
کوئی بڑا محل نہیں۔ بلکہ صرف ایک چھوٹی سی
کٹی ہے۔ مگر اس کے لئے بھی تو کوئی مستقل
بنیاد چاہئے۔"

اور دفعتاً یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ممتحن ناکام ہو گیا ہو۔ مالتی چیخ اٹھتی ہے :

"یہ جھوٹا حملہ ہے۔ تم نے مجھے ہمیشہ
امتحانی نظر سے دیکھا، کبھی محبت کی نگاہ
سے نہیں۔ کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ عورت
امتحان نہیں چاہتی بلکہ محبت چاہتی ہے؟"

آخری جملے میں مالتی کا جذبۂ نسوانیت دیکھئے۔ ہم بے اختیار ہو جاتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں، مہتا کیسا اجڈ فلسفی ہے جو اب تک بحث کئے جا رہا ہے۔ جسے بس خراد پر چڑھانے کی دھن ہے ــــ امتحان بھی ایک وقت تک مناسب ہوتا ہے۔ ہر شب و روز اور ساری زندگی امتحان میں کیسے گزار دی جائے؟ ــــ مہتا کے فلسفیانہ جملے مالتی کی محبت کی طنابوں کو کھینچتے چلے جاتے ہیں اور بالآخر نتیجہ سامنے آجاتا ہے۔ مالتی مہتا سے مایوس بلکہ متنفر ہو جاتی ہے۔

ناول کے آخری ابواب میں مالتی کی نسائیت کا نیا رخ نمودار ہوتا ہے۔ وہ کئی ماہ تک مہتا سے ملاقات نہیں کرتی۔ دفعتاً ایک روز دونوں ملتے ہیں۔ مہتا کی حالت دیگرگوں ہو گئی ہے مالتی سے دیکھا نہیں جاتا۔ وہ انہیں اپنے بنگلے میں رہنے کی جگہ دیتی ہے، جیسے کوئی خریدار اپنی مطلوبہ شئے کے لئے زیادہ سے زیادہ رقم دینے کو تیار ہو جائے۔ وہ گوبر کو اپنے بنگلے کے باغ میں مالی مقرر کرتی ہے۔ اس کے بال بچوں کو بھی رکھ لیتی ہے۔ گوبر کے بچے منگل کو وہ کھلاتی، پیار کرتی اور خدمتیں کرتی ہے ــــ اس کے یہ نسائی انداز و اطوار مہتا کو نئے اور پرکیف تجربے سے بہرہ ور کرتے ہیں۔ شگوفہ اور گلِ شگفتہ کے امتیاز و جاذبیت پر اب انکی نگاہ جاتی ہے۔ انھیں مالتی میں دیوی کی صفتیں نظر آنے لگتی ہیں:

"مہتا کو اس میں دیوتاپن کی سی جھلک
دکھائی پڑی۔ یہ عورت ہے یا خیر یا پاکیزگی
اور ایثار کی مجسم صورت!"

پریم چند کے یہ جملے اس بات کے ثبوت ہیں کہ مالتی میں ماں اور بیوی کی ساری خصوصیات موجود ہیں۔ لیکن نہ وہ ماں بن پاتی ہے، نہ بیوی۔"

اب ہم ہوری کی شخصیت کا جائزہ لیں۔

ہوری کے کردار کے تجزیہ سے ہمارے سامنے تین سوالات آتے ہیں:

(۱) کیا یہی بھلمنسی ہے؟

(۲) سنسار کیا کہے گا؟

(۳) بھگوان کی مرضی ہے، میرا کیا بس ہے؟

یہ سوالات ہوری کے ہیں اور ایسے ہیں جو اس کی زندگی کے ہر شعبے پر سامنے آکھڑے ہوتے ہیں۔ اس کی نئی گائے کو ہیرا نے زہر دیا، اسے یہ معلوم ہے تاہم، پولیس کے آنے پر سلامی وہ اپنے گھر سے دیتا ہے۔ اتنا ہی نہیں، ہیرا چونکہ اس کا بھائی ہے اس لئے اس کے فرار ہو جانے پر اس کی کاشت کو بھی سنبھالتا ہے۔ بھولا کی بیوہ لڑکی جھنیا، ہوری کے لڑکے گوبر کے ذریعہ اغوا کی جاتی ہے۔ ہوری اسے اپنے گھر میں پناہ دیتا ہے ـــــ یہ اس کی بھلمنسی ہے۔

لیکن اس بھلمنسی کا انجام کتنا بھیانک ہوگا۔ اس کی اسے خبر نہیں۔ وہ پنچایت کی چٹائی سے الگ کر دیا جاتا ہے جرمانے اس پر پوری طرح لاد دیئے جاتے ہیں۔ اس کی جائداد کا ستیاناس ہو جاتا ہے ـــــ جس طرح بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا پورے آفتاب کو گھیر لیتا ہے، جھنیا کی اقامت ہوری کی ساری زندگی کو تاریک بنا دیتی ہے۔

سونا اور روپا اس کی دو لڑکیاں ہیں۔ سونا کے ہونے والے خسر نے ہوری کو پیغام بھیجا ہے کہ وہ جہیز کی فکر نہ کرے۔ شادی ہو جائے گی۔ اس وقت ہوری کے سامنے سنسار کیا کہے گا؟ کا مسئلہ آجاتا ہے اور سنسار کے بول کے ڈر سے دو سو روپے قرض لے لیتا ہے۔

روپا اس کی کمسن لڑکی ہے۔ اس کا بیاہ داتا دین اگوا بن کر ایک بوڑھے کسان سے طے کرتے ہیں۔ ہوری کی بیوی دھنیا اس کی مخالفت کرتی ہے۔ لیکن ہوری اسے بھگوان کی مرضی سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔

یہ ہوری کا اپنی زندگی سے سلوک ہے۔ اس سلوک میں وہ خود مختار ہے۔ اپنی قسمت کا فیصلہ اس نے خود کیا ـــ اس میں ڈھیر ساری خوبیاں تھیں۔ وہ مستقل مزاج تھا۔ نیک سیرت، صابر اور امن پسند تھا۔ لیکن اس میں شیطنت نہ تھی۔ اس کی سیرت میں محض شیرینی تھی، تلخی نام کو بھی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ مظلوم اور یہ اس کی بہت بڑی بدنصیبی ہے ـــــ جینے کے لئے تھوڑی سی بربریت ہمیشہ واجب ہوتی ہے۔ دریائی جہاز کی حفاظت تیز دھار والے آہنی اوزار ہی کرتے ہیں۔ ہوری کے پاس ایسا کوئی اوزار نہیں۔ اس لئے ایسے انسان کی خاطر ہمدردی کا بہت زیادہ جذبہ جوش نہیں مارتا۔ یہی خیال دل میں آتا ہے۔ مرتا ہے تو مرے، ہم کیا کریں؟"

دوسری طرف مس مالتی ہے۔ یہ پڑھی لکھی، مہذب اور صحبت یافتہ کردار ہے۔ اس کے دوستوں کا حلقہ وسیع ہے۔ اس لئے شباب کے تقاضوں نے اسے عیش و عشرت کی بھی ترغیب دی ہے۔ وہ روشن خیال ہے مگر شادی کی منکر نہیں۔ وہ ہمیشہ اپنا ایک معبود چاہتی ہے، ایسا معبود جو اس کا سچا عابد بھی ہو، جو اسے اپنی پوری شدت سے محبت دے سکے۔

مالتی کے اس جملے کو ایک بار پھر پڑھیے:

"کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ عورت امتحان نہیں چاہتی بلکہ محبت چاہتی ہے؟"

لیکن مالتی کو بے پناہ محبت نہیں ملتی، یہ اس کی نامرادی ہے۔"

مالتی کی نامرادی کے اسباب یہ ہیں:

(۱) وہ ڈاکٹر ہے۔

(۲) اسے ہر شخص حتی کہ مسٹر کھنا اور پروفیسر مہتا بھی غلط سمجھتے ہیں۔"

(۳) وہ مہتا جیسے معیار پرست سے متاثر ہوتی ہے

اور ہوتی ہی چلی جاتی ہے۔

(۴) اسے پریم چند جیسا فنکار ملتا ہے۔"

یہ ایسے اسباب ہیں جو آپ کی حیرت کا باعث نہیں ہو سکتے۔ مگر آخری سبب سے آپ کو یقیناً حیرت ہوگی اس لئے ٹھہریئے، سلسلہ وار ان اسباب کا تجزیہ کرتے چلیں۔"

مالتی ایک ڈاکٹر ہے۔ مریضوں کا علاج اس کا شغل ہے۔ وہ دوست دشمن سبھوں کو دیکھتی ہے۔ اس لئے اس کا حلقہ وسیع ہے۔ وہ روشن خیال ہے۔ صحبت یافتہ ہے۔ انسانوں سے مل کر اسے نفرت نہیں ہوتی۔ وہ ہر سماج، ہر خیال، ہر قبیلہ کے افراد سے خوشی ملتی ہے۔ وہ کسی کو یہ نہیں کہہ سکتی کہ میں تم سے نہ ملوں گی۔ اس لئے اس کے کردار کا کا غلط اندازہ لگایا جاتا ہے۔

سچی محبت ہمیشہ قیام و قرار چاہتی ہے۔ یہی اس کا نقطۂ عروج ہے۔ جیسے مومن کی معراج اس کا سجدہ ہوتا ہے۔ مالتی بھی معراج حاصل کرنا چاہتی ہے۔ وہ ایک آستانے پر جھک جانے کو بیقرار ہے۔ یہ آستانہ، یہ در پروفیسر مہتا ہے۔ لیکن مہتا بذات خود ایک ایسا انسان ہے۔ جو یونیورسٹی میں سالوں سال امتحان لینے کا عادی ہو گیا ہے۔ جس نے طلبا کی کاپیوں پر مارکنگ کے معیار بھی مقرر کر لئے ہیں۔ اسی معیار سے وہ ہر جگہ زندگی کے ہر شعبے میں مصرف لیتا ہے۔ لیکن یہ نہیں جانتا کہ محبت معیار و میزان سے بالاتر ہوتی ہے۔ محبت کوئی خونخوار شیرنی نہیں، بلکہ شب سکوت افزا اور صبح جانفزا ہوتی ہے۔

مہتا کے سامنے رفیقۂ حیات کے جو معیار ہیں وہ بیوی اور ماں بننے کے بعد ہی پرکھے جا سکتے ہیں۔ ان کی تلاش مجرد مالتی میں مناسب نہیں۔ حالانکہ مالتی میں وہ پوری صلاحیتیں موجود ہیں۔ کاش کوئی مہتا کو سمجھاتا، آپ مالتی کو بیوی تو بنائیں! -- مالتی ایک غیر فہمیدہ کردار ہے۔"

مالتی کی تمنا، اس کی مراد کو پریم چند کے قلم نے بھی دھکا دیا ہے۔

پریم چند ایک ایسے فنکار ہیں جو ہندوستانی ناری کا ایک خاص تصور رکھتے ہیں۔ وہ ہندوستانی عورت میں محبت تو دیکھتے ہیں مگر آوارگی نہیں پاتے۔ محبت کے سلسلے میں پروفیسر مہتا نے جتنی باتیں کہی ہیں، وہ پریم چند کی حقیقی آواز معلوم ہوتی ہے۔ وہ عورت کو ایثار و قربانی، خلوص و محبت، شرم و حیا اور پاکدامنی کا مجسمہ دیکھنا چاہتے ہیں، عورت ان کی نگاہ میں ان خصوصیات کا مجسمہ ہوتی ہی ہے۔

اس پس منظر میں ہم مہتا اور مالتی کے انجام پر نظر ڈالیں — گئودان ۳۶ ابواب پر مشتمل ہے۔ مہتا اور مالتی کا ذکر ۳۴ ویں باب میں ختم ہو جاتا ہے۔ ان کے ذکر کو پریم چند یوں بند کرتے ہیں:

"انھوں نے (مہتا نے) مالتی کے پیر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لئے۔ اور کانپتی ہوئی آواز میں بولے" تمھارا حکم منظور ہے مالتی! اور دونوں ایک سے دل والے ہو کر بغلگیر ہو گئے، دونوں کی آنکھوں میں آنسو جاری ہو گئے!"

یاد کیجئے۔ مالتی کی تمنا کیا تھی! وہ کیا چاہتی تھی۔ یہی نا؟ کہ عورت امتحان نہیں چاہتی۔ بلکہ محبت چاہتی ہے" قسم کھا کر کہئے دیکھئے کہ پریم چند کے ان جملوں سے مالتی کی یہ تمنا بر نہیں آتی۔ شاید آپ کہیں، دونوں ایک سے دل والے ہو کر بغل گیر تو ہو ہی گئے۔ اب اور کیا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ بغلگیری کسی قدر مشتبہ ہے! مہتا نے مالتی کے پیر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لئے، "جیسے بچہ اپنی ماں کے قدموں پر گر جاتا ہے"۔ مہتا کانپتی ہوئی آواز میں بولے، تمھارا حکم منظور ہے مالتی!" جیسے بچہ اپنی مقدس ماں کے آگے اقرار جرم کرتے ہوئے معافی کا خواستگار ہو۔ اور اب سے عہد دل شکنی کی توبہ کر رہا ہو — عاشق و معشوق میں ایسا ڈرامہ نہیں ہوتا۔"

کہنا پڑتا ہے، پریم چند کا یہ اندازِ سیرت نگاری محض بھونڈا سا ہے۔ آغاز سے وہ ان دونوں کرداروں کے نقوش کو جس طرح ابھار رہے تھے، وہ ان کی اعلیٰ کردار نگاری کا نہایت ہی جاندار نمونہ تھا۔۔۔ یہ دونوں کردار مجبور تھے۔ ان کی دوری، پھر قربت پڑھنے والوں کے لئے مختلف تنبہات پیدا کر رہی تھی۔ واقعات انہیں چند ایسے سنگین اور ہیجانی مقامات پر بھی لے گئے، جہاں کی خاموش فضا ان کے جنسی اشتعال کا سبب بن سکتی تھی۔ لیکن مکانی ترغیبات کا جادو نہ چلا۔

ناول کے گزرتے ہوئے ابواب کے ساتھ پڑھنے والے کی نگاہ ان دونوں کرداروں کے لئے بے چین تھی۔ ان کا انجام کیا ہوگا؟ یہی سوال پیشِ نظر تھا۔ لیکن اب معلوم ہوا، ان کا انجام تو نہایت ہی غیر فطری ہے۔ پڑھنے والے کو سکون نہیں ملتا۔ اسے محسوس ہوتا ہے جیسے پریم چند نے صرف فلسفۂ محبت کی تشریح اور ناول کی طوالت کے لئے مالتی اور مہتا کا صنم بنایا تھا۔ جن کی اہمیت ان کی نگاہ میں کچھ نہ تھی جنہیں آخر میں توڑ دینا تھا۔۔۔ کاش، پریم چند نے ان دونوں کرداروں کو ایک حسین رشتے میں منسلک کر دیا ہوتا۔!

ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں، گؤدان کا یہ اہم ترین کردار پریم چند کے نظریۂ فن سے بری طرح مجروح ہو گیا ہے۔ اسے سجاد حیدر یلدرم یا نیاز فتح پوری جیسا فنکار ملنا چاہئے تھا۔

ہوری کی بدنصیبی، اس کی نامرادی کا باعث ہندوستان کا وہ سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ جس کے خلاف پریم چند نے جا بجا جذبۂ بغاوت ابھارا ہے۔ مالتی کی بدنصیبی کی وجہ پروفیسر مہتا اور خود پریم چند ہیں۔ ہوری پیدائشی مظلوم ہے۔ مالتی مظلوم بنائی جاتی ہے۔ ہوری کشتۂ دشمن ہے۔ جبکہ مالتی کشتۂ دوست۔ اور یہ اس کی سب سے بڑی بدنصیبی ہے۔

گؤدان کا نامراد کردار ڈاکٹر مالتی ہے۔ ★★

تنہا تماپوری

قیامت

ہونٹ پینا چھوڑ دیں گے
پانوں چلنے کے لئے بے چین ہوں گے
ہاتھ شاید انگلیوں کو ڈھونڈنے نکلیں گے اس دن
سارے کھلیانوں میں سورج روشنی کا سود حاصل کر رہا ہوگا
چاند میرے گھر کی بوسیدہ منڈیروں پر کھڑا، بانگ دے گا۔
مرغیاں حمام میں گھس جائیں گی۔
سر کی ہانڈی میں کوئی ابلا ہوا انڈا پکارے گا:
مجھے کھا جاؤ! ساتوں آسماں کے مہمانو!!
پھر ہمیں رنگوں سے چھٹکارہ ملے گا۔

تمّت

آئینوں میں جھانکتے چہروں سے پوچھ لو
کتنی صدیاں اگ رہی ہیں
ان کے چہروں کی زمین پر؟
کیا جبینیں سے کہہ رہی ہیں
وقت کی شکنیں ابھر کر؟

ان سوالوں کے جنم سے کچھ ہی پہلے
عکس اپنے آئینوں کے ساتھ ساتھ
ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے تھے
سوچ کے مرکز پر شاید بم گرا تھا ★★

بدیع الزماں خاور

دو غزلیں

کچھ تو میرے لہو کے سمندر بتا مجھے
یہ کون دے رہا ہے مسلسل صدا مجھے

اک دن ملوں گا اس سے اجالوں کے درمیاں
جس سے کئے ہوئے ہیں اندھیرے جدا مجھے

ترسایا بادلوں نے اک اک بوند کیلئے
کر کے سمندروں کے کنارے کھڑا مجھے

ہر رات نے دکھائی خیالوں کی روشنی
ہر صبح نے صلیب پہ لٹکا دیا مجھے

میں مصلحت پسند نہ تھا پھر بھی عمر بھر
خاموش تیرے سامنے رہنا پڑا مجھے

یوں سوچ میں پڑا ہے ہر راہ دیکھ کر
جیسے غم حیات نہیں جانتا مجھے

پتّے کی طرح دشت میں اب تو ادھر ادھر
خاور اڑاتی پھرتی ہے پاگل ہوا مجھے

**

شہر کے لوگوں کو آپس میں لڑا ڈالے گا
ایک دن کہتے ہیں ۔ وہ آگ لگا ڈالے گا

وہ نیا شخص جب آئے گا تو، دیواروں سے
میرے لکھے ہوئے سب نام، مٹا ڈالے گا

ان ہواؤں میں جلانے سے دیئے کیا حاصل
تیز جھونکا کوئی آئے گا، بجھا ڈالے گا

سنگ اس شہر میں سب ساتھ لئے پھرتے ہیں
کیا پتہ، کب کوئی دیوانہ بنا ڈالے گا

روشنی کے لئے سورج سے قریب آئے تھے
کیا خبر تھی کہ یہ جسموں کو جلا ڈالے گا

چپ رہو تا کہ غزل کوئی سنا کر بیٹھے
داد دوگے تو وہ دیوان سنا ڈالے گا

**

ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی

آئیڈیل

نہ جانے کب انور نے ڈرائنگ روم میں قدِ آدم آئینہ لگوادیا تھا۔ ابوالحسن کو اس کی اطلاع نہیں تھی۔ اس نے تو عرصہ دراز سے آئینہ نہیں دیکھا تھا۔ غالباً جب سے سر کے بال گرنے لگے تھے اس نے آئینہ دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے تو ابوالحسن ٹھٹھک کر رہ گیا۔ ایک بوڑھا سا انسان سامنے کھڑا تھا۔ جس کے جبڑے قدرے ٹیکے ہوئے تھے۔ نقلی دانت چمک رہے تھے۔ آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی، رنگ جو کبھی کندن کی طرح رہا ہوگا اب سیاہی مائل تانبے کا سا لگ رہا تھا۔ سر کے درمیان کے بال قطعی صاف تھے۔ بلکہ سر چمک بھی رہا تھا۔ موٹے شیشے والی عینک قدرے ناک کی طرف جھک رہی تھی۔ اس لئے کہ اس کی ایک کمان ریشم کے تاگے کی تھی جو کہ ڈھیلی ہو گئی تھی۔ ابوالحسن نے ایک دفعہ پھر غور سے آئینہ میں نظر آنے والے بوڑھے کو دیکھا۔ پھر اس کے بدن کے سارے اعضاء ایک دم ڈھیلے پڑنے لگے۔ بڑھاپے کے شدید احساس نے اس کی عمر دس سال اور بڑھا دی تھی۔ ابوالحسن ہنسا۔ لیکن اس کی ہنسی زہر آلود تھی۔ ہر چیز گردش کر رہی تھی۔ ہر چیز بوڑھی ہو رہی تھی۔ وقت کتنا بے رحم ہوتا ہے۔ اندھا گونگا، اور بہرہ، اور انسان کیسی کیسی جھوٹی تسلیوں کے ساتھ خود کو زندہ رکھتا ہے۔ کبھی اپنی کمزوری کو فلسفیانہ رنگ دیتا ہے کبھی موہوم سہاروں پر اعتبار کرکے جینے اور خود کو فریب دینے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ کبھی موت کی تمنّا کرتا ہے اور کبھی زندگی کے لئے دعائیں مانگتا ہے۔ اور پھر یہ زندگی کا کارواں چلتا ہی رہتا ہے۔ شاید اسی کش مکش کا ہی تمام زندگی ہے۔

میں شروع ہی سے آئیڈیل پرست ہوں۔ حسین الھڑ اور شوخ، بسم اللہ کے بارے میں ابوالحسن نے سوچا تھا کہ یہی وہ لڑکی ہے جسے میں نے خوابوں میں دیکھا ہے۔ جس کا تخیل ہمیشہ ہمیشہ سے میرے ذہن میں ہے۔ یہی میرا آئیڈیل ہے۔ لیکن یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ معمولی سی کوششوں کے بعد ہی بسم اللہ اسے مل گئی تو وہ سوچنے لگا اس نے اپنے آئیڈیل کے بارے میں غلط فہمی اور جذبات سے کام لیا۔ ورنہ آئیڈیل تو ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اس کا تعاقب کرتے ہیں اور وہ آگے آگے چلتا ہے۔

آئیڈیل کے لئے مسلسل جدوجہد کرنا اور آئیڈیل کو حقیقی صورت میں نہ پانا ہی زندگی کا حسن ہے۔ اسے اس بات کا احساس اس وقت ہوا جب بسم اللہ اس کی کمزوری پر ہر طرح حاوی ہو گئی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے آئیڈیل کو ٹھیس نہ لگے۔ اور بسم اللہ کا یہ نظریہ تھا کہ یہ سب کچھ فضولیات اور خرافات ہیں۔ اصل زندگی وہ ہے جس سے وہ دوچار ہے اور جب بسم اللہ چار بچوں کی ماں بن گئی تو وہ صرف ٹھوس حقائق پر ہی یقین رکھنے لگی۔ ابوالحسن ریلوے کے دفتر میں افسر تھا اور اکثر دوروں پر رہا کرتا تھا۔ اس لئے اسے

اپنے بچوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ پھر اس میں کچھ ایسی تبدیلی آئی کہ وہ پیسے پیسے کو دانت سے پکڑنے لگا۔ کسی انشورنس ایجنٹ نے ان کو دولت کی خوبیوں اور اس کے بروقت معجزوں کے بارے میں کچھ زیادہ ہی تفصیل سے بتا دیا تھا۔ اس دن سے ہی ابوالحسن کی زندگی بدل گئی تھی، فلیٹ جوتے، کھدر کے کرتے پاجامے اور اکثر و بیشتر پیدل چلنے اور دولت کو محفوظ رکھنا ان کی ہابی بن گئی۔ بسم اللہ پر نفسیاتی طور پر اس کا بہت برا اثر پڑا اور ابوالحسن کی طرف سے وہ اور بھی نالاں رہنے لگی۔

ابوالحسن سوچا تھا کہ وہ اپنی سب سے بڑی لڑکی کو بار ایٹ لا کے لئے لندن بھیجے گا۔ جب رخسانہ ولایت تعلیم حاصل کرنے جائے گی تو اسے دولت کی ضرورت ہوگی۔ اسی وقت اس کی پس انداز کی ہوئی رقم کام آئے گی۔ جب رخسانہ شہر کی مشہور قانون کی شہرت حاصل کرے گی۔ تو لوگ فخر سے کہا کریں گے۔ اس کیس کو تو رخسانہ ہی ڈیل کر سکتی ہے۔ اس وقت میرا سر فخر سے بلند ہو جایا کرے گا۔ پھر انھوں نے سوچا کہ حامد کو بی۔ اے کراؤں گا۔ پھر انجینئرنگ کی تعلیم کے لئے کسی اچھی یونیورسٹی میں داخل کرا دوں گا۔ اور انور ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کرے گا تو ایف آر سی ایس کے لئے انگلستان روانہ کر دوں گا۔ اور زرینہ، پی، ایچ، ڈی کرے گی۔

ابوالحسن نے سوچا بہت لیکن زندگی میں عملی حیثیت سے توجہ نہیں دی۔ رخسانہ نے میٹرک پاس تو کر لیا لیکن تھرڈ ڈویژن میں۔ ابوالحسن کے تخیل کا جب عملی زندگی سے ٹکراؤ ہوا ایک دھماکا سا ہوا اور ابوالحسن کا ذہن دھواں بن کر اڑنے لگا۔

زندگی کے بے رحم ہاتھوں ابوالحسن کچھ سے کچھ بن گیا۔ بسم اللہ نفسیاتی الجھنوں میں گرفتار تھی وہ ابوالحسن سے نفرت کرنے لگی تھی اس کشمکش کا رخسانہ پر برا اثر پڑا اسے یوں محسوس ہوا اس کا کوئی وارث نہیں ہے۔ اس سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتا اور جب ماں ابوالحسن کی حقارت سے برائیاں کرتی تو رخسانہ کے ذہن میں اپنے باپ کا نقشہ عجیب اور بھیانک ہو جاتا۔ اسے اپنی ماں بے حد مظلوم نظر آتی۔ ان ہی دنوں رخسانہ کا تایا زاد بھائی ان کے ہاں آ کر رہنے لگا وہ شاید کسی فرم میں ملازم تھا۔ نہایت آوارہ اور اوباش اس نے بہت جلد ہی محسوس کر لیا کہ رخسانہ کو آسانی سے بھٹکایا جا سکتا ہے — اور پھر — کہا یہ جاتا ہے کہ ماں چونکہ شوہر کی عادات سے پہلے ہی نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا تھی۔ قدیر اور رخسانہ کو مشتبہ حالت میں دیکھ کر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی۔ ابوالحسن کے دل میں نہ جانے کیا آئی اسے بسم اللہ سے نفرت ہو گئی۔ اس نے اس کے علاج پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ بسم اللہ کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ ابوالحسن کے دوروں پر رہنے کی وجہ سے گھر کا سارا انتظام اب رخسانہ کے ہاتھ میں تھا۔ باپ کی بے اعتنائی اور قدیر کے ورغلانے سے باپ کی دولت خوب خرچ کی۔ دوسرے بہن بھائیوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا اور جب ابوالحسن ریٹائرڈ ہو گیا اور گھر میں رہنے لگا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں وہ دولت جو اس نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر جمع کی تھی اس کا زیادہ حصہ برباد ہو چکا تھا۔ رخسانہ شہر کے کسی اسپتال میں نرس کی ٹریننگ لینے لگی تھی — قدیر کو مار پیٹ کے گھر سے نکال دیا گیا تھا۔

ابوالحسن خلاؤں میں گھورنے لگتا۔ خدایا یہ کیا ہو رہا ہے۔ رخسانہ باپ سے اس لئے نفرت کرنے لگی تھی کہ انھوں نے اس کی شادی قدیر سے کرنے کے بجائے اسے مار پیٹ کے گھر سے نکال دیا تھا۔ پھر اسے خیال آتا کہ ماں انکی بے اعتنائی کی وجہ سے پاگل ہو گئی — اور ابوالحسن کا حال ٹکر ٹکر دیکھ

دم رنگ شبدم کا سا تھا۔ اس کا آئیڈیل نہ صرف مجروح ہوا ہوا تھا بلکہ اس کے ذہن میں آئیڈیل کا تصور تھا۔ وہ بے حد بھیانک ہو گیا تھا۔ زندگی کے تلخ مشاہدوں اور تجربوں نے ابوالحسن کے سوچنے کے انداز کو ہی بدل دیا تھا۔ اب اسکی طبیعت میں جنون کی کیفیت تھی۔ اکثر وہ دانت بھینچتا اور اسکی مٹھیاں بند ہو جاتیں ان کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں اور منہ سے جھاگ نکلنے لگتے۔ وہ کبھی جنونی کیفیت میں بسم اللہ کو انتہائی نفرت سے دیکھتا۔ کبھی رخسانہ کو مارنے دوڑتا۔ کبھی چھوٹے چھوٹے بچوں کو نفرت اور حقارت سے دیکھتا۔ رخسانہ نے مشہور کر دیا کہ ابو کو دورے پڑتے ہیں اور ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ نفسیاتی الجھنوں کے مریض ہیں اور اس حالت میں ان کا انتقال بھی ہو سکتا ہے۔ انتقال کے نام سے سب کے سب کانپنے لگتے۔ ماں پاگل ہو چکی تھی۔ باپ کی اس حالت کے لئے وہ تیار نہ تھے۔ رونے لگتے۔ اور گھر میں ایک عجیب کہرام مچ جاتا۔ ابوالحسن کی روح گھٹنے لگتی۔ اور پھر ایک شفیق باپ کا دل ان تمام باتوں پر حاوی آ جاتا۔ اسکی آنکھوں میں آنسو امڈ آتے وہ ایک ایک بچے کو اپنے پاس بلاتا اس سے اچھی اچھی باتیں کرتا۔ ان کو نیک بن جانے اور ترقی کرنے کی طرف مائل کرتا اور جب وہ ایسا کرتا تو بسم اللہ جو کہ پاگل ہو چکی تھی دیکھ دیکھ کر فلک شگاف قہقہے لگاتی۔ ان قہقہوں سے ابوالحسن گھبرا جاتا۔ اور بچوں سے کہتا یہ ہسٹریا کے دورے ہیں یہ ٹھیک ہو جائیں گی۔

لیکن حالات بگڑتے ہی چلے گئے۔ رخسانہ نے اپنی کسی دوست کے بھائی سے چھوٹی بہن کی شادی کر دی۔ پھر چھوٹا بھائی اپنی مرضی سے شادی کر لایا۔ اس کے بڑے بھائی انور نے رخسانہ کی سہیلی حمیدہ سے شادی کر لی۔ اتنے سارے انقلاب ابوالحسن نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اس کا ذہن جیسے سن ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ اس کی حیثیت اب گھر میں ایک بیکار انسان کی سی تھی۔

وہ اب کسی سے بھی بات نہیں کرتا تھا قطعی خا
اپنی ساری زندگی میں وہ اپنے بچوں سے
بے تعلق نہیں رہا تھا۔ اس نے اب سوچنا
تھا کہ یہ اس کے ہی بچے ہیں۔ بسم اللہ اس کی بیو
اس کی بیٹی ہے۔ کبھی کبھی خود آنسوؤں کی جھڑ
تو وہ اپنا کمرہ اندر سے بند کر لیتا تکیہ میں منہ چھپ
روتا۔ روتے روتے اسے نیند آ جاتی اور جب
بالکل خالی الذہن ہوتا۔ لیکن سامنے ہی اسے
بڑا فوٹو نظر آ جاتا جو کہ شادی کے فوراً بعد کھی
اور ابوالحسن نہ چاہتے ہوئے بھی تخیل کے دیر
بھٹکنے لگتا۔

عجیب اتفاق تھا اس نے اپنی زندگی سے
کی خواہش کی اس کا بالکل الٹا ہوا۔ وہ جتن
بات کا خواہش مند تھا کہ زندگی میں حسن د
یہ تھا کہ عملی طور پر زندگی اسے اتنی ہی زیادہ
آتی۔ جب اس کے خواب ٹوٹتے، تخیل مجروح
تمنائیں ایک ایک کر کے دم توڑنے لگتیں۔

..... تو اس کا دم ڈوبنے لگتا۔ اسے اس با
ہوتا جب اس کی زندگی میں حسن نہیں تلخیاں
ہیں۔ اپنے ان حسین تخیلات میں وہ آگ کیوں
وہ ان چمکتے ہوئے ستاروں کو نوچ کیوں نہیں
جب بھی کبھی ایسا اتفاق ہوتا تو معلوم ہوتا سا
گھر ذمع ہو گیا ہے۔ اور رخسانہ بچوں سے کہتی یہ
ابو کو آج پھر دورہ پڑ گیا ہے۔ بچارے ابو۔

ابوالحسن سوچتا ــــ ہاں میں بچارہ ہوں ــــ
ہوں ــــ ہاں میں نے زندگی کے حسین خواب دیکھے ا
خوابوں میں آگ لگتے ہوئے بھی دیکھا اور اب
میں مسلسل آگ لگ رہی ہے۔ شعلے دھک رہے ہیں۔
مجھے ان شعلوں سے، اس دہکتی ہوئی آگ سے!!

سے، ان طوفانوں سے، ورنہ میرے جسم کا ایک ایک عضو ہوا میں منتشر ہو کر رہ جائے گا۔ اس کی اس حالت کو کوئی ایکٹنگ کہتا۔ کوئی ہذیان کی کیفیت بتاتا، کوئی ذہنی مریض کہہ کر خاموش ہو جاتا، کوئی اس کی بدنصیبی پر محض افسوس کرتا۔

آج بہت دنوں کے بعد اس نے آئینہ دیکھا تھا۔ کمرے کی حالت ہی بدل گئی تھی بہت سی چیزیں نئی آئی ہوئی تھیں۔ زرینہ کسی سے کہہ رہی تھی آپا اپنا جہیز جمع کر رہی ہیں۔ قدیر بھائی واپس آگئے ہیں۔ اب ان کی شادی شاید اسی ہفتے میں ہو جائے۔

ابوالحسن کے ذہن میں دھماکا سا ہوا۔ ہر چیز جیسے منتشر ہو گئی۔ اس نے زور سے اپنا سر قد آدم آئینے میں مارا، ایک چھناکے کے ساتھ آئینہ ٹوٹ گیا۔ اور ابوالحسن کا چہرہ لہو لہان ہو گیا۔ غنودگی سی چھانے لگی۔ اس غنودگی کے عالم میں بھی ابوالحسن نے ایک لمحہ کے لئے سوچا۔۔ عملی زندگی اور آئیڈیل پرستی میں ازلی تضاد ہے اور میں اس تضاد کا شکار ہو چکا ہوں۔

اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہا۔

عین اسی وقت قدیر اور رخسانہ قہقہے لگاتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ انھوں نے دیکھا ابو کا چہرہ لہو لہان ہے اور امی ابو کے چہرے کو اپنے دوپٹے سے صاف کر رہی ہیں۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی اور اور سب تماشا دیکھ رہے تھے۔

★ ★ ــــ ✗ ــ

بقیہ صفحہ ۵۰ کا عکس اور آئینہ

بھلے آدمی بنانے لگتے ہیں۔"

"دیکھو! اگر تم چور اچکے یا پاکٹ مار ہو تو عہد کرو کہ آج سے تم یہ عادت چھوڑ دو گے۔ اور اگر تم بھلے آدمی ہو اور مجبور و ضرورت مند ہو تو محنت کرنے کی ٹھان لو۔ اور اگر ایسا موقع ہو کہ محنت کرکے بھی اپنی ضرورت پوری نہیں کر سکتے ہو تو کسی آدمی کے سامنے اپنی بات صاف صاف کہنے میں نہ ہچکو۔"

پال اتنا کہہ کر پچھلے اسٹیشن پر اتر گیا ہے۔ بریلی اسٹول پسنجر تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔ ڈبے میں خاموشی مسلط ہے۔ زیادہ تر لوگ سو چکے ہیں۔ تھوڑے بہت اونگھ رہے ہیں۔ لیکن میری آنکھوں میں نیند کا پتہ نہیں۔ میں ایک عجیب عالم میں کھو گیا ہوں۔ مجھ پر ایک نشہ سا طاری ہے۔ میں نے پاس والی کھڑکی ذرا سی کھول دی ہے۔ سرک کر اس کے قریب بیٹھ گیا ہوں۔ رہ رہ کر ہوا کے سرد جھونکے جسم کو چھو رہے ہیں اور میرے وجود میں ایک عجیب سی ٹھنڈک، عجیب سی شیرینی، عجیب سی لطافت گھلتی جا رہی ہے اور پروفیسر گھنہ کا یہ جملہ تیزی سے ذہن کے گرد چکر لگا رہا ہے ۔۔۔

"ایک نیکی نجانے کتنی نیکیوں کو جنم دیتی ہے۔"

اور مجھے لگ رہا ہے جیسے میں زمین کی پستیوں سے اوپر اٹھ رہا ہوں۔ فضاؤں میں تیر رہا ہوں۔ عرش کی بلندیوں کو چھو رہا ہوں!! ★★



…دیم عباس رضوی

عکس اور آئینہ

وہ جا چکا ہے۔ بریلی آسنسول پسنجر تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ پورے ڈبے پر سکوت مسلط ہے۔ زیادہ تر لوگ سو چکے ہیں۔ کچھ لوگ اونگھ رہے ہیں۔ لیکن میری آنکھوں میں نیند کا پتہ نہیں۔ میں ایک عجیب عالم میں کھو گیا ہوں۔ مجھ پر ایک نشہ سا چھا گیا ہے۔ میں نے پاس والی کھڑکی ذرا سی کھول دی ہے۔ سرک کر اسی کے قریب بیٹھ گیا ہوں۔ رہ رہ کر ہوا کے جھونکے میرے جسم کو چھو جاتے ہیں اور میری روح کی گہرائیوں میں ایک عجیب سی ٹھنڈک، عجیب سی شیرینی، عجیب سی لطافت گھلتی جا رہی ہے۔

ماضی کے ورق پلٹ گئے ہیں۔
نجانے کتنی یادوں نے مجھے گھیر لیا ہے
کتنی تصویریں آپس میں گڈمڈ ہو گئی ہیں۔

اور ایک مسکراتی ہوئی تصویر آج پھر مجھ سے مخاطب ہو گئی ہے۔

"نیک کام کر کے آدمی خود بھی خوش ہوتا ہے اور دوسرے کو بھی خوش کر دیتا ہے" یہ پروفیسر کھنہ ہیں جو کہا کرتے تھے۔

"ایک نیکی نجانے کتنی نیکیوں کو جنم دیتی ہے،

"اف! وہ واقعہ ایسا لگتا ہے جیسے ابھی کل ہی تو گزرا ہو۔"

میں اس کے بارے میں اور کوئی بات نہیں جانتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا وہ کون تھا؟ کہاں کا رہنے والا تھا؟ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں سے آیا تھا۔ کدھر جا رہا تھا یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ ایک اچکا اور لٹیرا تھا۔ یا چور مار یا مجبور و ضرورت مند انسان؟؟

"میں تو صرف یہ جانتا تھا کہ وہ میرے آفس سے کسی کا جوتا پہن کر اور کسی کا سامان لیکر بھاگ رہا تھا۔ (CHAM BER) سے اٹھ کر BED پر گیا تھا زور کے شور سے چونک پڑا۔ "چور — چور — وہ پکڑو — پکڑو — بھاگنے نہ پائے" اور وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔"

ذرا سی دیر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کوئی! دو مت مارو — چھوڑ دو — کچھ لوگ کہتے — "بالکل — مار مار کر ٹھکانے لگا دو بدبخت کو"۔ کچھ آوازیں ابھرتیں "بس ہو گیا — اپنے مولا کو پہنچ گیا اتو"۔ کچھ لوگ "اتنا مارو کہ پھر اس قابل ہی نہ رہ جائے"۔ کچھ تائید کرتے "ہاں، ہاں — پھر اس قابل ہی نہ رہ جائے۔ کچھ لوگ تائید کی تائید کرتے "ہاں ضرورت ہے اسی کی"۔ ایک آہستہ سے کہتا — ارے پولیس نہیں ہے — پولیس حوالے کر دو — دوسرا منہ بگاڑ کر غراتا — پولیس کرتی"۔ تیسری طرف سے تائید ہوتی "پولیس ہی تو کچھ کراتی ہے"۔

کچھ لوگ چلاتے "بول تیرا نام" دوسرے کہتے!

تو پوچھو کہاں کا رہنے والا ہے۔ تیسری جانب سے آواز گونجی "یہاں کیسے آیا؟" اور کچھ لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے۔ ..... پتہ نہیں ہندو ہے یا مسلمان؟ اور کچھ مسخرے قسم کے لوگ انھیں میں سے جواب دیتے۔ "بھولا ہے بھولا" — "سیدھا سادا آدمی لگتا ہے"۔ "پوجا کرنے جا رہا تھا" راستہ بھول گیا"۔ "غلطی ہو گئی اندھیرے میں!"

اس سوال و جواب، ہاں نہیں کے درمیان لوگوں نے مار مار کر اس کی حالت بگاڑ دی تھی۔ اس کے بھورے مٹیالے بال بے ترتیب ہو گئے تھے۔ کپڑے جگہ جگہ سے نوچ گئے تھے۔ جسم پر کھرونچیں ابھر آئی تھیں۔ کہیں کہیں خون کے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔ جسم پر کھرونچیں ابھر آئی تھیں کہیں کہیں خون کے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔ جیوں ہی وہ کچھ بولنا چاہتا اِدھر اُدھر سے ایک زبردست طمانچہ اس کے گال پر پڑ جاتا اور وہ تلملا اٹھتا، یکایک کسی نے اتنی زور کا ایک گھونسہ اس کے منہ پر جمایا کہ وہ تاب نہ لا سکا۔ بے اختیار اس کے منہ سے ایک چیخ نکل پڑی۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں وہ لڑکھڑا کر زمین پر ڈھیر ہو گیا اور اس کے منہ سے خون کی ایک پتلی دھار پھوٹ پڑی۔ "بس جانے دو اب مر جائے گا۔" ایک آدمی نے ہمدردی ظاہر کی۔ "نہیں مرے گا" دوسرے نے منہ بگاڑ کر جواب دیا۔ "مکر ہے مکر"۔ تیسرے نے جلتی آگ میں گھی ڈال دیا، اور کچھ منچلوں نے اسے کشاں کشاں گھسیٹنا شروع کر دیا۔"

میں اس منظر کو دیکھنے کی تاب نہ لا سکا۔ میں نے بھیڑ منتشر کی، رجحان بدلنے کیلئے لوگوں سے یہ کہا کہ وہ اپنے گھر جائیں۔ میں اسے ابھی کوتوالی بھیج دیتا ہوں، جب لوگ چلے گئے تو دو ایک آدمیوں کی مدد سے میں اسے اپنے گھر لایا، وہ بالکل بے سدھ ہو گیا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ دھلوایا، اس پر پانی کے چھینٹے ڈلوائے اور جب وہ کچھ ہوش میں آگیا تو اس کے سامنے کچھ کھانا پانی رکھوا بند کر دیا۔

رات گزرتی رہی اور میں اپنے بستر پر کروٹیں رہا۔ سرد رات اور بھی یخ بستہ ہو چکی تھی۔ سارا عالم نیند کی آغوش میں مدہوش تھا۔ دور دور تک سناٹا مسلط تھا۔ کہیں کوئی آواز نہیں۔ کوئی آہٹ نہیں تھی لیکن نجانے کون سی خاموش آواز مجھے سکون نہیں لینے دیتی تھی نہ جانے کیسا طوفان میرے ذہن میں امڈا پڑ رہا تھا نجانے کیسی آندھی میرے وجود کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ آخر میں اپنے بستر سے نکلا۔ میں نے آہستہ سے اس کے کمرہ کا دروازہ کھولا۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں زمین پر بے سدھ پڑا تھا۔ خون کے قطرے جابجا زمین میں جذب ہو گئے تھے۔ کچھ خون کپڑوں میں لپٹ کر خشک ہو گیا تھا۔ چہرہ پر ورم معلوم ہوتا تھا۔ منہ کھلا تھا اور آہستہ آہستہ کراہ کی آواز نکل رہی تھی۔ کھانا پانی جوں کا توں رکھا ہوا تھا

اس کی یہ حالت دیکھ کر میری پلکوں پر آنسو تیر گئے۔

میں نے اسے آہستہ سے جگایا۔

"کیا ہوا۔۔ کیا۔ کیا پولیس آگئی؟" وہ یکایک چونک پڑا۔

"نہیں.... نہیں..... مجھے پولیس کے حوالے نہ کرو۔ .... پولیس.... پولیس.... مجھے ڈر لگتا ہے.... بابوجی میں آپ کا پیر پکڑتا ہوں.... آپ کے آگے.... ہاتھ جوڑتا ہوں۔" وہ گڑگڑا کر رحم طلب نگاہوں سے مجھے گھورنے لگا۔

کوئی دورہ پڑ گیا ہو جیسے اسے، اور میری آنکھوں کے آنسو تھمے نہ رہ سکے۔!

"نہیں... نہیں... پولیس نہیں.... میں تمہیں پولیس کو نہیں دوں گا۔" میں لاشعوری طور پر بول پڑا۔ "ڈرو نہیں۔ یہاں کوئی نہیں۔ اٹھو تم اللہ کے

کہا: "... میں تمہیں ابھی چھوڑ دوں گا۔" وہ مجھے عجیب نظروں سے گھورنے لگا۔ پھر جلدی جلدی روٹیاں چبا کر جب وہ ڈھیر سا پانی حلق میں انڈیل چکا تو میں نے کمرے کا دروازہ بالکل کھول دیا۔ وہ تیزی سے کمرے کے باہر نکل گیا۔

"ایک بات سنو!" میں نے اسے ٹوکا ۔۔ دیکھو تم اگر چور، اُچکے یا پاکیٹ مار ہو تو عہد کرو کہ آج سے یہ عادت چھوڑ دوگے۔ اور اگر تم بھلے آدمی ہو اور مجبور و ضرورت مند ہو تو جی جان سے محنت و مشقت کرنے کی ٹھان لو۔ اور اگر ایسا موقع ہو کہ محنت کر کے بھی اپنی ضرورت نہیں پوری کر سکتے ہو تو کسی بھی آدمی سے اپنی بات صاف صاف کہہ دینے میں ذرا بھی نہ ہچکو۔" اتنا کہہ کر میں نے دو روپیہ کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

نوٹ لے کر وہ دو قدم آگے بڑھا۔ پھر رک کر بولا۔"

"بابو جی! آج سے دو ڈھائی سال پہلے رات کے اندھیرے میں ایک آدمی آپ کے یہاں آیا تھا۔ موسم کے تیور بہت خراب تھے۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ آپ بالکل اکیلے تھے۔ نوکر کہیں باہر گیا تھا۔ آنے والے نے کہا تھا وہ پٹنہ سے آیا ہے۔ اور آپ کے بھائی مہندر کا روم پارٹنر ہے۔ مہندر بیمار ہے۔ اس کی کتابیں چوری ہو گئی ہیں۔ اس مہینے کی فیس بھی نہیں جمع کر سکا ہے۔ اس نے مجھے آپ تک بھیجا ہے۔ اور اس نے مہندر کی ایک جعلی دستخط کی ہوئی چٹھی بھی آپ کو دکھائی تھی۔ آپ نے اسے اپنے یہاں ٹھہرایا تھا۔ مہندر کے لئے ڈیڑھ سو روپے بھی دیئے تھے۔ دوسری صبح وہ شخص آپ کا کمبل بھی لے کر غائب ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا نام جیون بتایا تھا ۔۔۔ میرا نام "پال" ہے۔" وہ ایک لمحے کے لئے رکا۔ پھر بولا۔" وہ بھی یہی پال تھا۔ جیون نہیں۔" اتنا کہہ کر وہ تیزی سے بڑھا اور اندھیری رات کی پہنائیوں میں نہ جانے کہاں اوجھل ہو گیا۔"

اور آج جبکہ ان یادوں کے نقوش بھی مدھم ہونے لگے تھے۔ پال آج ٹرین میں پھر مل گیا ۔۔ کل ۔۔ آج اور کل، میں کتنی دوریاں ہیں اور کس قدر نزدیکیاں! میں اسے دیر تک پہچان نہ سکا۔ آخر جب اس نے مسکرا کر اپنا نام بتایا تو میں بھونچکا رہ گیا۔ آنکھوں پر نازک فریم کی خوبصورت عینک، منہ میں دبا ہوا سگار، جسم پر صاف شفاف، ڈھیلے ڈھالے کپڑے اور ہاتھ میں عمدہ سا نو لیو لئے وہ ایک مہذب، شائستہ و ہوشیار آدمی بن گیا ہے۔

پال نے بتایا کہ اس نے اپنی زندگی سرے سے بدل ڈالی۔ اس نے مشقت کو زندگی کا شعار بنا لیا ہے۔ اور محنت ہی کی بدولت ایک قلیل عرصہ میں اپنے کاروبار میں خاصی ... حاصل کر لی ہے۔ پال بہت خوش تھا۔ لیکن یکایک اس کا لہجہ سرد پڑنے لگا۔

اپنی روش بدلنے کے بعد میں نے کوشش کی کہ ... شہر والے مجھ پر اعتماد کریں۔ وہ مجھے وہی نہ سمجھیں جو ... رہے ہیں۔ لیکن میں کامیاب نہ ہو سکا۔ لوگوں کی مشکوک نگاہیں نہیں بدل سکیں۔ آخر کار میں نے اپنا وطن ترک کر دیا۔ پال کی ان باتوں سے مجھے سخت چوٹ پہونچی اور ... دیکھا اس کا چہرہ افسردگی میں ڈوب گیا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے کی رنگت پھر بدل گئی۔ اور وہ ...

خیر مجھے اس بات کا کوئی غم نہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ ... زندگی کے دن رات، صبح شام، سبھی روشن ہو گئے ہیں۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھے زندگی میں سب کچھ مل گیا ہے پھر بھی مالک نے میری خالی جھولی میں بہت کچھ ڈال دیا ... اب تو جہاں کہیں بھی مجھے ایسا موقع ملتا ہے کہ میں ... پچھلی عادت کو دہرا سکوں وہیں میری نظروں کے سامنے آپ چمک اٹھتے ہیں اور ذہن کے پردے سے آپ کے ...

(بقیہ ص ۴۳ پر)

بزمِ شاخسار

پٹنہ ـ ۲۴ر اپریل ۔ ۷۳ء

رضا نقوی واہیؔ

خطِ منظوم ملا، بھائی کرامت صاحب
آپ کی ہے یہ عنایت صاحب
کوئی دس روز ہوئے۔
آپ کا گلکدۂ فکر ـــ "شاعروں کی صلیب"
جو بہر رنگ ہے اک تحفۂ دلچسپ و جمیل
ایک صاحب نے دیا۔
اس نوازش کے لئے بھی ہوں سراپا ممنون۔
ہے خبر مجھ کو جنابِ والا
کہ یہاں لائے تھے تشریف حضور
اور امامت کدۂ شہر میں ڈالا تھا پڑاؤ
وہ امامت کدہ شہر، وہ تکیۂ اربابِ جدید
وقت بے وقت جہاں رہتا ہے، رحمانیہ ہوٹل کے ادیبوں کا جماؤ
یہ خبر بھی ہے کہ نوخیز ادیبوں کے امام
جن کے گھر آپ نے فرمایا تھا دو روزہ قیام
اس قدر آپ کو مصروف انھوں نے رکھا
کہ ملاقات کا ناچیز سے موقع نہ ملا
لیکن اک بات کھٹکتی ہے ضرور
میرے حضور!
آپ کی عمر دراز
اپنی آمد کی خبر فون سے کیوں دے نہ سکے بندہ نواز!
تاکہ میں خود ہی ملاقات کو حاضر ہوتا۔
آپ کی طرح نہ قاصر ہوتا!
کہیں ایسا تو نہیں؟
میزبان ہی سے اجازت نہ ملی
کہیں ایسا تو نہیں؟
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا۔
ایک بار اور اسی طرح جب آئے تھے یہاں فاروقی
تو معمر و بار او ر شعرا سے انہیں ملنے کی اجازت نہ ملی
ان پہ قدغن تھا ـ امامت کدۂ شہر سے باہر نہ نکلنے پائیں۔
صرف نوعمر ادیبوں سے ملیں، ان کی سنیں، آپ سنائیں۔
چودھراہٹ کی بقا کے لئے یہ نسخۂ خاص۔
راس آتا ہے بہت مصلحت اندیشوں کو
خیر اب آئیے کچھ بات ہو مجموعے کی
عرض تو کر ہی چکا ہوں کہ ـ شاعروں کی صلیب
ہے بہر نوع گراں قدر و جمیل
معنوی حسن ہو، یا دلکشیٔ خال و خد و عارض و لب' بالترتیب
ہر ورق پر ہے عیاں
ایک مصور کا عمل، ایک مفکر کی نظر

ایک سخنور کی زباں
ہیں مگر ایسے بھی کچھ مصرع و چستان ادھر

[redacted] عقرت کی روایت ہے
ایسے حضرات طبیعت سے ہیں [redacted]
بی جمالو کے بھتیجوں کا یہی ہے [redacted]
بھبش میں چنگاری رکھی اور ک [redacted]

اب یہ فرمائیے میرا د [redacted]
آپ کی میز پہ دو سال سے محبوس ہے جو
چادرِ گرد میں ملبوس ہے جو
حبس بیجا کے سبب
کھو چکا ہے جو نیاپن اپنا
اس کے بارے میں کوئی بات کبھی بھی نہ لکھی آپ نے کیوں؟
اس سزائے نظراندازی کی۔
کوئی میعاد مقرر کیجیے!
آج اتنا ہی —— فقط ——
آپ کا اپنا
[illegible]

ایک شعر

اپنے انجام پہ خوش اپنی وفا پہ نازاں
مسکراتے ہوئے ہم جانب دار آئے ہیں
(پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم)

سید مرتضیٰ خوشتر

ادھر کچھ دنوں سے مورچہ کے صفحات پر تاج انور نے حاشیہ کے زیر عنوان، "مانگے کی صلاحیتوں کے بل بوتے تنقیدی بساط" کی کوشش شروع کی ہے۔ ایک "دولت مندی کی عا برداری" کے طفیل انہیں "منخی حاشیہ" لکھنے کا اعزاز تو ہو گیا۔

چلئے اس طرح اگر وہ مزید خوش فہمیوں میں بھی مبتلا ہو گئے تو شاید آئندہ بھی کچھ سوجھ بوجھ پیدا ہو جائے کیوں کبھی کبھی خوش فہمیاں خوش بختی کی علامت بھی بن جاتی ویسے یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ "بے چارے" مدتوں "مورچہ" چپکے رہے۔ لیکن اپنا کوئی ادبی (STATUS) یا کیریئر نہ بنا ان کی شعر فہمی کا عالم یہ ہے کہ کبھی صحیح و غلط، معیاری و غیر معیاری معائب و محاسن اور اچھے اور برے کی بھی تمیز نہ کر سکے۔ اس لئے خود "مورچہ" و "آہنگ" کے بیشتر شمارے بطور ثبوت پیش کئے جا سکتے ہیں۔ کوئی سفارشات کے ذریعہ "لکچرر" بن جا تو "شعاعوں کی صلیب" بھی اس کی سمجھ میں آنے لگے ضروری نہیں، لیکن اس احساس کمتری کو چھپانے کے لئے "منخی حاشیہ" لکھنا تو بہر حال ناگزیر تھا۔ کاش ان کی قلا کو تنقیدی شعور کا نام دیا جا سکتا —— اس سے کم از کم ایک فائدہ ضرور ہوتا کہ محمود واحد کی طرح تاج انور گدھے کے سر سینگ کی طرح غائب ہونے سے بچ جاتے ورنہ ان کے بعد دریائے تنقید خشک ہو جائے گا اور ڈوب مرنے کو چلو بھر بھی نصیب نہ ہو سکے گا۔

پھبتی ہو جیسے آپ ہی اپنے وجود پر۔
دریا کے "حاشیے" پہ کوئی "منخی" سی ناؤ

سید مرتضیٰ خوشتر